عباسؑ بک ایجنسی کی اردو مطبوعات

لعین ابن لعین

(حالاتِ معاویہ ابن ابوسفیان)

مؤلف
علامہ فروغ کاظمی

ناشر
ادارۂ تہذیب و ادب ۳۹۲ خمسینی لین میدان ایلچی خاں لکھنؤ ۳

نام کتاب	لعین ابن لعین (حالات معاویہ ابن ابوسفیان)
مولف	علامہ فروغ کاظمی
سنہ طباعت	ستمبر ۱۹۹۹ء
تعداد	۱۱۰۰
کتابت	محمد اطہر لکھنؤ غضنفر لکھنؤی
سرورق	عباس حسنین
مطبوعہ	اے بی سی آفسٹ پرنٹرس دہلی
ناشر	ادارہ تہذیب ادب ۳۹۲/۶۰ تحسینی لین میدان ایلچ خاں لکھنؤ
ہدیہ	Rs 60/

ملنے کا پتہ

عباسؑ بک ایجنسی

رستم نگر درگاہ حضرت عباسؑ لکھنؤ

فون نمبر ۲۶۰۷۵۶ ۲۶۹۵۹۸

فیکس ۲۶۰۹۲۳

انتساب

محمد بن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام.....

جن کی

انصاف پسندی نے معاویہ ابن ابوسفیان کو "لعین ابن لعین"

کے خطاب سے سرفراز کیا

(بحوالہ نصائح کافیہ ص ۲۱)

فروغ کاظمی

فہرست مضامین

ابتدائیہ

(از۔ مولانا سیّد علی عباس صاحب طباطبائی)

تاریخ کی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب معاویہ تختِ حکومت پر متمکن ہوا تو اس کی ساری توجہ اس امر کی طرف مبذول ہوئی کہ اس شمعِ ہدایت کو ہمیشہ کے لئے گل کر دیا جائے جسے رسُولِ اکرم کے بعد حضرت علی علیہ السلام روشن کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کو اس بدعت کی طرف پلٹانے کی کوششیں کرنے لگا جسے خلفائے ثلاثہ نے دستور بنا دیا تھا دوسری طرف اس نے حضرت علیؑ پر سبّ وشتم اور لعنت کا آغاز کیا اور اس مذموم فعل کو اس قدر اہمیت دی کہ ہزاروں منبروں سے آپ پر تبرا ہونے لگا۔

مدائنی کا بیان ہے کہ کچھ مقتدر صحابہ کے پاس گئے اور انھوں نے اس سے کہا کہ علیؑ اب دنیا سے اُٹھ چکے ہیں اور تمہارے لئے ان کی طرف سے کوئی خوف باقی نہیں رہا لہٰذا یہ لعنت کا سلسلہ بند کر دو۔ اس پر معاویہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک بچہ جوان اور جوان بوڑھا نہ ہو جائے۔

معاویہ کی اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مدت تک مسلمان اسی غیر اسلامی ماحول کا شکار رہے۔ یہاں تک کہ ان کے بچوں عورتوں اور خدمتگاروں پر بھی یہی ماحول اثر انداز ہوا اور لوگوں کے دماغوں میں یہ عقیدہ رچ بس گیا کہ جو شخص علیؑ ابن ابیطالب کا اتباع کرتا ہے اور ان سے دوستی و محبت رکھتا ہے

وہ بدعتی اور خارجی ہے۔

ظاہر ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ علیہ السلام پر جب منبروں سے لعنت کی جاتی رہی ہوگی اور اس لعنت کے ذریعہ خدا کا تقرب ڈھونڈا جاتا رہا ہوگا اس وقت آپ کا اتباع کرنے والے شیعوں کے ساتھ کیا کیا سلوک روا نہ رکھا گیا ہوگا۔ ان کے عطایا کو روک دیا گیا تھا، ان کے شہروں اور دیاروں کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا تھا، انھیں زندہ دفنا دیا جاتا تھا اور انھیں کھجوروں کے درختوں پر لٹکا کر پھانسیاں دی جاتی تھیں۔

میری نظر میں معاویہ ایک عظیم سازشی سلسلے کی کڑی ہے۔ لیکن حقائق کو چھپانے اور انھیں الٹ کر پیش کرنے، اور امت کو اسلام کے لباس میں ملبوس جاہلیت کی طرف پلٹانے میں اس کو دوسروں سے زیادہ کامیابی ملی۔

اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ معاویہ گزشتہ خلفاء سے زیادہ زیرک، چالاک، اور بہروپیہ تھا جو موقع محل کے لحاظ سے اپنا روپ تبدیل کر لیتا تھا۔ چنانچہ کبھی لوگ اسے بہت بڑا زاہد، متقی اور عبادت گزار سمجھتے تھے اور کبھی قساوتِ قلبی کا جیتا جاگتا مجسمہ۔ اور شام کے بدّو تو اسے رسُول کا مرتبہ دیتے تھے۔

گفتگو کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ محمد بن ابوبکر اور معاویہ کے درمیان ہونے والی خط و کتابت کو پیش کیا جائے کیونکہ ان دونوں کے خطوط میں ایسے حقائق موجود ہیں جن سے قارئین کرام کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔

محمد بن ابی بکر کا خط معاویہ کے نام

خدا کے طاعت گزاروں پر سلام ہو کہ جنھوں نے دلی خدا کے سامنے سرِ تسلیم

خم کر دیا ہے۔ اما بعد۔

بے شک خداوند عالم نے اپنی عظمت و جلالت اور قدرت و تسلط سے اپنی مخلوق کو عبث پیدا نہیں کیا اور نہ اس کی قوت و طاقت میں کسی قسم کا ضعف ہے اور نہ ہی ان کی خلقت میں وہ محتاج ہے۔ لیکن خدا نے اپنی مخلوق کو مطیع و فرمانبردار پیدا کیا ہے اور ان میں بعض کو ہدایت یافتہ اور بعض کو شقی اور بعض کو سعید قرار دیا ہے۔ پھر اس نے ان پر نظرِ ثانی کرنے کے بعد انھیں میں سے محمدؐ کو منتخب کیا اور انھیں منصبِ رسالت پر سرفراز کیا، اور اپنی وحی اور اپنی امانت کا امین قرار دیا۔ بے شک وہ بشارت دینے والے ڈرانے والے، آسمانی کتابوں کی تصدیق کرنے والے اور شریعتوں پر دلیل ہیں۔ انھوں نے حکمت اور مواعظِ حسنہ کے ذریعہ لوگوں کو راہِ خدا کی طرف دعوت دی جسے سب سے پہلے حضرت علیؑ ابن ابیطالب نے قبول کیا اور رسالت کی تصدیق کی اور ہر مرحلے میں آپ کے ساتھ رہے۔ آپ سے جنگ کرنے والوں سے جنگ کی اور صلح کرنے والوں سے صلح کی۔ علیؑ اس وقت بھی ثابت قدم رہے جب لوگوں کے قدم ڈگمگائے اور دل لرزے۔ یہاں تک کہ جہاد میں وہ مقام حاصل کیا، جس کی نظیر ممکن نہیں ہے اور وہ کارنامے انجام دئے جن کی مثال نہیں ملتی۔

میں دیکھتا ہوں کہ تم خوبیوں میں علیؑ سے مقابلہ کرنا چاہتے ہو۔ یاد رکھو، تم پھر تم ہو، اور وہ پھر وہ ہیں۔ وہ ہر ایک نیکی میں آگے ہیں، سب سے پہلے انھوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ ان کی ذریت بہترین ذریت ہے، ان کی زوجہ سب سے نیک و افضل ہیں، ان کے ابن عم سب سے اعلیٰ ہیں، ان کے بھائی نے جنگِ موتہ میں اپنا نفس خدا کے ہاتھ بیچ دیا تھا، سید الشہدا جناب حمزہ ان کے چچا ہیں اور ان کے والد نے تاحیات رسُول اللہ اور آپ کے مقصد کا دفاع کیا۔

تم لعین ابن لعین ہو۔ اور تمہارے باپ نے ہمیشہ دین کے معاملے میں فریب کاری سے کام لیا۔ اسلام پر لشکر کشی کی اور قبائل کو الٰہی مشن کے خلاف اکسایا اور بھڑکایا۔ اور پھر اس حالت میں وہ موت سے ہمکنار ہوا کہ اپنے بعد کے لئے تمہیں لوگوں پر مسلط کر گیا۔

اس امر کی گواہی تمہارے حاشیہ نشین دیں گے کہ رسُول اللہ سے نفاق و دشمنی رکھنے والوں نے تمہارے دامن میں پناہ لے رکھی ہے۔ اور علیؑ کی آشکار فضیلت اور ابتدا ہی سے تمام کاموں میں سبقت کے ساتھ ساتھ ان کے انصار گواہ ہیں جن کا تذکرہ خدا نے قرآن میں کیا ہے۔

خدا تم سے سمجھے، ان تمام باتوں کے باوجود تم خود کو کس طرح علیؑ کا ہمسر قرار دیتے ہو جبکہ علیؑ وارثِ رسُول، ان کے وصی اور ان کے جانشین ہیں۔ اور تم ان کے دشمن اور دشمن کی ناجائز اولاد ہو۔

بس تم اپنے باطل کے ذریعہ اپنی دنیا سے جتنا چاہو فائدہ اٹھالو۔ تمہارے مقصد میں عمرو بن عاص لازمی تمہاری مدد کرے گا لیکن عنقریب تمہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ عاقبت کس کی بلند و بہتر ہے۔ والسلام[1]۔

اس خط میں محمد بن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حقیقت کے متلاشی افراد کے لئے ٹھوس حقائق قلم بند کئے ہیں۔ وہ معاویہ ابن ابوسفیان کو لعین ابن لعین قرار دیتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ معاویہ دشمنِ خدا اور رسُول ہے اور عمرو بن عاص کی مدد سے باطل امور کا ارتکاب کرتا ہے۔

اسی طرح یہ خط حضرت علیؑ ابن ابیطالب کے ان فضائل و مناقب کا

---

[1] مروج الذہب مسعودی ج ۲ ص ۵۹، شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۲۸۲۔

انکشاف کرتا ہے جو نہ کسی کو نصیب ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔

اب آپ معاویہ کے جواب کو بھی ملاحظہ فرمائیں تاکہ وہ مخفی سازش بھی آشکار ہو جائے کہ جس نے خلافت سے اس کے شرعی حقدار کو علٰحدہ کیا تھا، اور بعد میں یہی فعل امت کی گمراہی کا سبب بنا۔

معاویہ نے محمد بن ابوبکر کو جواب لکھا۔

امابعد۔ تمہارا وہ خط ملا جس میں تم نے خدا کی قدرت وعظمت اور اس کی بادشاہت کا تذکرہ کیا ہے اور رسولؐ کے اوصاف بیان کئے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں تمہاری رائے ضعیف ہے اور اس خط سے خود تمہارے ہی والد کی سرزنش ہوتی ہے۔

اپنے اس خط میں تم نے علیؑ ابن ابیطالب کے فضائل اور تمام چیزوں میں ان کا سابق ہونا، رسولؐ سے قرابت اور ہر خوف وہراس وجنگ وجدال کے موقع پر علیؑ کا رسولؐ کے ساتھ رہنا وغیرہ بیان کیا ہے۔ گویا تم نے مجھ پر حجت قائم کی ہے۔ اور اپنے سے غیر کے فضل وکمال پر تم فخر کر رہے ہو۔

رسول اللہ کی حیات میں ہم اور تمہارے باپ دونوں ہی علیؑ ابن ابیطالب کے حق کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کے فضائل بھی عیاں تھے۔ پس جب خدا نے نبی کو منتخب کیا، اور ان کے لئے اپنا وعدہ پورا کیا، ان کی دعوت کو آشکار کر دیا اور ان کی حجت کو قائم کر دیا تو خدا نے انھیں اٹھا لیا۔

وفات پیغمبرؐ کے بعد تمہارے باپ اور ان کے دوست (عمر) نے سب سے پہلے علیؑ کی مخالفت کی اور زبردستی ان کا حق چھین لیا۔ اس میں دونوں ہی شریک تھے اور دونوں نے اس (خلافت) سے فائدہ اٹھایا۔ پھر تمہارے باپ اور ان کے دوست نے علیؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا تو علیؑ نے تامل کیا اور عذر کیا تو انھوں نے

علیؑ پر حملہ کیا اور درپئے آزار ہوئے۔ یہاں تک کہ علیؑ کو ان سے مصالحت کرنا پڑی۔ لیکن تمہارے باپ اور ان کے دوست (عمر) نے یہ طے کر لیا تھا کہ علیؑ کو اپنے کسی کام میں شریک نہ کریں گے اور نہ ان پر اپنا کوئی راز ظاہر کریں گے۔ چنانچہ دونوں (ابوبکر اور عمر) کو اسی حالت میں موت آئی اور قصہ ختم ہوا۔ پھر ان کا تیسرا (عثمان) کھڑا ہوا اور اس نے بھی ان ہی دونوں کا طریقۂ کار اور راستہ اختیار کیا تو اس پر تم نے اور تمہارے آقا علیؑ نے حسد کیا۔ یہاں تک کہ دور دراز کے معصیت کار بھی خلافت کی طمع کرنے لگے۔ پس تم نے اس لئے چال چلی اور وہ چیز حاصل کر لی جس کا خواب دیکھا تھا۔ اے ابوبکر کے بیٹے! اپنے لئے اسباب فراہم کرو کیونکہ تم بھی عنقریب اپنے کئے کا مزہ چکھو گے۔

اب تم اپنے ہی پیمانے سے اندازہ کرو کہ اس شخص سے کسی طرح بھی برابری نہیں کر سکو گے جو اپنی عقل سے پہاڑوں کو تولتا ہے اور اپنے نیزے کی گرفت میں تم جیسے لوگوں کو رکھتا ہے۔

تمہارے والد نے اس کے لئے راستہ ہموار کیا اور اس کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اگر ہم صحیح راستے پر گامزن ہیں تو تمہارے والد اس کے پہلے سالک تھے۔ اور اگر ہم ظالم ہیں تو تمہارے باپ نے بھی ظلم کیا ہے۔ ہم ان کے شریک کار ہیں۔ ہم نے انھیں کے طرز عمل کو اختیار کیا ہے اور انھیں کے افعال کی اقتدا کی ہے۔ اگر تمہارے والد نے پہلے یہ نہ کیا ہوتا تو ہم بھی علیؑ کی مخالفت نہ کرتے اور خلافت کو انھیں پر چھوڑ دیتے۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ یہی کام تمہارے باپ پہلے انجام دے چکے ہیں تو ہم نے بھی پیروی کی۔ پس تم اپنے باپ کو بُرا بھلا کہو یا چشم پوشی اختیار کرو۔ والسلام[1]

---

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۶۰ و شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۲۸۶۔

معاویہ کے اس جواب سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علیؑ کے فضائل وکمالات کا منکر نہیں تھا لیکن اس سلسلے میں اس نے ابوبکر اور عمر کے راستے کو اختیار کیا۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو وہ کبھی علیؑ کو حقیر سمجھنے کی جسارت نہ کرتا اور نہ کوئی شخص آپ پر سبقت کرتا۔ جیساکہ معاویہ نے اعتراف کیا ہے کہ بنی امیہ کی بادشاہت اور خلافت کے لئے ابوبکر نے راستہ ہموار کیا اور انھیں نے بادشاہت کی بنیاد رکھی۔

اور معاویہ کے جوابی خط سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ نہ اس نے رسولؐ کی اقتداء کی اور نہ اسلام کے راستے پر چلا جیساکہ اس نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ میں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی سیرت پر عمل کیا ہے۔ نیز اس خط سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو جاتی ہے کہ ان سب، یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور معاویہ نے سنت رسولؐ کو چھوڑ دیا تھا اور یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کی بدعت کی پیروی کرتے تھے جیساکہ معاویہ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ ان گمراہ لوگوں میں سے تھا جو باطل امور کی انجام دہی کو اپنے لئے سرمایہ افتخار تصور کرتے تھے اور انھیں کو نبی نے لعین ابن لعین کہا ہے۔

"لعین ابن لعین" کے عنوان سے علامہ فروغ کاظمی کی یہ کتاب ابوسفیانؑ معاویہ اور یزید کے حالات پر مشتمل ایک تاریخی دستاویز ہے جس میں موصوف نے حقائق کو بڑے دلیرانہ انداز میں بے باکی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ انداز بیان دلچسپ اور حوالے ناقابل تردید ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام اسے پسند فرمائیں گے۔ آخر کلام میں میری دعا ہے کہ خداوند عالم بطفیل محمد وآل محمد علامہ فروغ کاظمی کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے اور ان کی صحت کو قائم رکھے۔ ——— آمین...

——— احقر العباد ———
سید علی عباس طباطبائی

معاویہ ابن ابوسفیان کا خاندانی تعارف

معاویہ ابن ابوسفیان کا خاندانی تعلق "امیہ بن عبد شمس" کی نسل سے ہے جو تاریخ میں "بنی امیہ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کرنے والے اس قبیلے کے لوگ جس طرح قبل از اسلام انسانی معاشرت، تہذیب وتمدن اور ضابطۂ اخلاق سے ناآشنا تھے اسی طرح ظہور اسلام کے بعد بھی بے بہرہ رہے۔

خود پرستی، خود نمائی، مفاخرت، حسد وکینہ، نفرت وعداوت، ظلم وتشدد، قتل وغارت گری اور لوٹ مار اس قبیلے کے لوگوں کا سرمایۂ افتخار اور درندگی، بربریت اور حیوانیت ان کا طرۂ امتیاز تھا ان کی داخلی اور خارجی دونوں طرح کی زندگیوں میں نہ تو انسانیت کا عنصر تھا نہ رحم وہمدردی کا جذبہ تھا اور نہ ہی محبت ومروت کی کوئی جھلک ان کی مکاریوں، فریب کاریوں، عیاریوں، سفاکیوں، خود غرضیوں اور فتنہ پردازیوں کی عبرت انگیز وتعجب خیز داستانیں تاریخ کے صفحات میں کثرت سے بکھری ہوئی ہیں۔

خاندان رسالت (بنی ہاشم) سے بنی امیہ کی ازلی دشمنی، کینہ پروری، مخاصمت مخالفت، عداوت اور منافقانہ سرگرمیاں اسلامی تاریخ کے ایسے سچے اور معتبر واقعات ہیں کہ ان کی صداقت سے نہ تو انکار کیا جا سکتا ہے نہ ان کی پردہ پوشی ممکن ہے، نہ انھیں چھپایا جا سکتا ہے اور نہ انھیں جھٹلایا جا سکتا ہے۔

پڑھا لکھا ہر مسلمان اس حقیقت سے واقف ہے کہ بنی ہاشم سے مرتے دم تک بنی امیہ برسرِ پیکار رہے اور انہوں نے جنگ و جدل کا ایک ہولناک سلسلہ وقت آخر تک جاری رکھا۔ اس جنگی تسلسل کی اہم کڑیوں میں ایک طرف جناب ہاشم تھے تو دوسری طرف امیہ۔ ایک طرف جناب عبدالمطلب تھے تو دوسری طرف امیہ کا بیٹا حرب، ایک طرف جناب ابوطالبؑ اور پیغمبر اسلام تھے تو دوسری طرف حرب کا بیٹا ابوسفیان، ایک طرف حضرت علیؑ اور امام حسنؑ تھے تو دوسری طرف ابوسفیان کا بیٹا معاویہ، ایک طرف امام حسینؑ اور دیگر افراد بنی ہاشم تھے تو دوسری طرف معاویہ کا فاسق و فاجر اور بدکردار بیٹا یزید۔ غرض کہ ہر دور اور ہر زمانے میں تاریخ اپنے اوراق کو الٹتی پلٹتی رہی اور دو متضاد نظریں منظرِ عام پر آتی رہیں۔

بنی امیہ کے بارے میں معتبر و مستند مورخین و مفسرین نے اپنے جو تاثرات ظاہر کئے ہیں ان کا اجمالی خاکہ مندرجہ ذیل ہے۔

- شجرۂ ملعونہ فی القرآن سے مراد بنی امیہ ہیں [1]۔
- زمانۂ جاہلیت میں بنی امیہ کی غذا ٹڈیوں اور کیڑوں مکوڑوں پر مشتمل تھی [1]۔
- پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا کہ ہمارا سب سے بڑا دشمن قبیلۂ بنی امیہ ہے [2]۔
- تمام قبائل عرب میں سب سے زیادہ شریر و شر پسند بنی امیہ تھے [3]۔
- ہر شئے کے لیے ایک آفت ہوا کرتی ہے اور اسلام کے لیے آفت بنی امیہ تھے [4]۔
- بنی امیہ کا دور فتن و بدعات سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے اسلام کی بنیادیں متزلزل کر دی تھیں [5]۔
- بنی امیہ کی فاحشہ عورتیں پہچان کے لیے اپنے گھروں پر مخصوص قسم کے جھنڈے

---

[1] ۔ تطہیر الجنان ص ۱۴۹

لگایا کرتی تھیں [6]۔

- بنی امیہ کی جن عورتوں کا بازار عصمت فروشی ہر وقت گرم رہتا تھا ان کی تعداد چار تھی ایک معاویہ کی ماں ہندہ، دوسرے معاویہ کی دادی حمامہ، تیسرے عمرو عاص کی ماں نابغہ اور چوتھے مروان کی دادی زرقا۔ لیکن ان چاروں عورتوں میں معاویہ کی ماں ہندہ تمام عیبوں کی خزینہ دار تھی، یہ اپنی سنگدلی کے ساتھ ساتھ شاعرہ بھی تھی اور جمالیاتی شعر گوئی میں ایک ممتاز مقام رکھتی تھی، اس کا ایک شعر اپنی رنگینی اور دل آویزی کے اعتبار سے کافی دلچسپ اور توجہ کا حامل ہے جس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ:۔ "ہم حسن و جمال اور خوبصورتی میں صبح صادق کی بیٹیاں ہیں اور مجامعت کے وقت ہم اپنے ملنے والوں سے نرم نرم بستروں پر اس طرح ملتے ہیں جس طرح چاند کے گرد چکور گردش کرتا ہے [7]۔"

امیہ بن عبد شمس کے متعلق مورخین کا بیان ہے کہ وہ ایک چندھا، کر نجا، پستہ قد، حاسد، زناکار، خود غرض اور منحوس شکل و صورت والا انسان تھا، نحوست اس کے چہرے سے ہر وقت ٹپکا کرتی تھی، حسان بن ثابت نے اسے عبد شمس کی اولاد تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے [8]۔

بنی امیہ کی دو بڑی شاخیں ہوئیں۔ ایک شاخ میں حرب بن امیہ، ابوسفیان بن حرب معاویہ ابن ابوسفیان یزید ابن معاویہ اور معاویہ ابن یزید وغیرہ مشہور ہوئے اور دوسری شاخ میں ابوالعاص بن امیہ، عفان بن ابوالعاص، عثمان بن عفان (تیسرے خلیفہ)

---

[1] تاریخ اعثم کوفی ص ۲۴۲ [2] نصائح کافیہ ص ۲۶ [3] ینابیع المودۃ ص ۱۴۸ [4] روضۃ المناظر برحاشیہ کامل ج ۱۱ ص ۸۵ [5] الحریت فی الاسلام ص ۶۶ [6] فتح الباری ج ۵ ص ۶۵ [7] نصائح کافیہ ص ۱۱۰ [8] دیوان حسان ص ۹۱

مروان بن حکم، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک، یزید بن عبدالملک، سلیمان بن عبدالملک، ہشام بن عبدالملک، عبدالعزیز بن مروان اور عمر ابن عبدالعزیز وغیرہ خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں؛

امیرالمومنین حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی شہادت کے بعد بنی امیہ (۴۰ھ سے ۱۳۲ھ تک) تقریباً ۹۲ سال تخت اقتدار پر قابض رہے اور اس طویل عرصہ میں عمر ابن عبدالعزیز کے عہد حکومت کو چھوڑ کر (جس کی مدت دو سال سے زیادہ نہ تھی) بقیہ تمام سلاطین بنی امیہ کا دور جبر و استبداد، ظلم و تشدد اور قتل و غارت گری کا مرقع نیز قرآن و سنت کی مخالفت کا آئینہ ہے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ عباسیوں کے دور حکمرانی میں بنی امیہ کے کچھ افراد ان کے مظالم سے تنگ آکر اندلس کی طرف بھاگ گئے تھے اور وہاں انہوں نے اموی حکومت قائم کر لی تھی جو تین سو برس تک چلی اور جتنے بھی فرمانروا ہوئے وہ تشدد و مظالم میں اپنے اسلاف سے کسی طرح کم نہ تھے

بنی امیہ اور پیغمبر اسلام

جب مکہ کی سرزمین پر آفتاب رسالت و ہدایت طلوع ہوا اور اس کی روشنی کائنات میں پھیلنے لگی تو اس روشنی کو ختم کرنے کے لیے بنی امیہ نے اپنی پوری قوت و طاقت صرف کر دی چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے سرکار دو عالمؐ کی ذات اقدس کو ظلم و ستم اور تشدد کا نشانہ بنایا اور کبھی انفرادی، کبھی اجتماعی حیثیت سے حضورؐ کو طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا کرتے رہے۔

قبیلۂ بنی امیہ کی سربرآوردہ شخصیتوں نے آپس میں مشورہ کر کے نضر بن حرث اور عقبہ بن ابی کو یہودیوں کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ لوگ مکہ میں آئیں اور

محمدؐ کے دعوائے نبوت کو غلط ثابت کریں عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن عاص کی سربراہی میں کچھ لوگوں کو حبشہ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ لوگ وہاں کے فرمانروا (نجاشی) سے کہہ سن کر حضرت بلال موذن رسولؐ، حضرت عمار بن یاسر اور ان کے والدین خباب بن ارت صہیب بن سنان، عامر بن فہیرہ، ابی فکیہہ، نوفل بن حبیب، ربیزہ، نہدیہ، ام عبیس لبیبہ اور دیگر ان صحابہ و صحابیات کو حبشہ سے باہر نکلوانے کی کوشش کریں جو پیغمبر اسلامؐ کے حکم پر مکہ سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے تھے اور اپنے اسلام کے تحفظ میں بے بسی و غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے تھے مشرکین مکہ کی طرف سے یہ اقدام اس لیے عمل میں لایا گیا تھا کہ اسلام قبول کرنے والوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچانا اور انھیں پریشان کرنا، یہ بھی پیغمبر اکرمؐ کی اذیت رسانی کا ایک طریقہ تھا۔

اس کے بعد بنی امیہ نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کو جیسے جیسے مبتلائے آلام کیا جا رہا ہے ویسے ویسے ان کا اسلام اور بھی پختہ و راسخ ہوتا جا رہا ہے اور پیغمبر اسلامؐ اپنے مشن میں بدستور سرگرم عمل ہیں تو مشرکین مکہ کے سرداروں نے حضور کی تبلیغی سرگرمیوں پر بندش لگانے کا ایک دوسرا طریقہ سوچا چنانچہ عتبہ و شیبہ پسران ربیعہ اور ابوسفیان وغیرہ پر مشتمل ایک وفد پیغمبر اسلام کے عم محترم حضرت ابوطالبؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے یہ درخواست کی کہ آپ اپنے بھتیجے کو ہمارے معبودوں کو برا کہنے سے روک دیں۔ مگر حضرت ابوطالبؑ نے ان کافروں کی شکایتوں پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ انہوں نے اپنے بھتیجے سے یہ کہہ کر وہ اپنے تبلیغی مشن کو بدستور جاری رکھیں، نبوت کے حوصلوں کو اور بھی مستحکم کر دیا۔

جب مشرکین کی یہ کوشش بھی ناکام ہوئی تو انہوں نے پیغمبرؐ کے خلاف ایک نیا منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد سرورِ کونینؐ کو (نعوذ باللہ) مجنوں، پاگل اور جادوگر وغیرہ قرار دینا تھا تاکہ اسلام کی توسیع پر اس کے اثمرات مرتب ہوں اور پیغمبرؐ کی طرف لوگ

متوجہ نہ ہوں۔ مگر قدرت نے مشرکین مکہ کے اس منصوبے پر بھی یاس وحسرت کا پانی پھیر دیا۔

اب کفار مکہ پیغمبرؐ کی دشمنی وعداوت پر بالکل ہی کمربستہ ہو گئے اور انہوں نے طے کیا کہ کھلم کھلا حضورؐ کو اذیتیں پہنچائی جائیں ایذا رسانی کی اس جماعت میں ابوجہل ابولہب ابوسفیان، عتبہ، شیبہ عقبہ بن ابی معیط حکم بن ابوالعاص اور عاص بن وائل سہمی کا نام سرفہرست ہے یہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کا مذاق اڑاتے تھے، ان کی تحقیر کرتے تھے انھیں برا بھلا کہتے تھے اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے تھے ان کاموں میں حکم بن ابی العاص سب سے آگے تھا، اس کی ذات سے رحمت اللعالمینؐ کو اس قدر تکلیفیں پہنچی تھیں کہ اسلامی اقتدار قائم ہونے پر آپ نے اسے اہل وعیال سمیت مدینہ سے طائف کی طرف جلاوطن کر دیا تھا اور جب تک آپ حیات رہے اسے مدینہ میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

سرکار دوعالم کے حق میں بنی امیہ کی ایذا رسانیاں صرف مردوں ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ اس قبیلے کی عورتیں بھی اس معاملے میں ان کے دوش بدوش تھیں، چنانچہ ام جمیل جسے قرآن نے "حمالۃ الحطب" کے لقب سے یاد کیا ہے، بنی امیہ کی تمام عورتوں کی سردار تھی جو حضورؐ کو نئی مصیبتوں میں مبتلا کرتی رہتی تھی۔

جب ان تمام کوششوں سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا اور بنی امیہ اسلام کی ترقی میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیدا نہ کر سکے تو انہوں نے بائیکاٹ کی تحریک چلائی جس کی وجہ سے بنی ہاشم کو شعب ابوطالب میں محصور رہ کر فقر وفاقہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور آخر کار جب یہ تحریک بھی ناکام ہو گئی تو مشرکین نے پیغمبر اسلامؐ کے قتل کا منصوبہ مرتب کیا جس کی وجہ سے حضورؐ نے مکے سے مدینے کی طرف ہجرت اختیار کی اور اپنے بھائی علیؑ کو بحکم خدا اپنے بستر پر سوتا چھوڑ گئے[1]

[1] تفصیل کے لیے مولف کی کتاب الخلفاء حصہ اول و دوم ملاحظہ فرمائیں

مدینہ میں منتقلی کے بعد پیغمبر اسلامؐ کو بنی امیہ سے متعدد لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ آپ نے مسلسل دس برس تک صعوبتوں اور مصائب والام کا سامنا کر کے ان کی قوتوں اور غرور کو توڑا تھا اور انھیں پسپا کیا تھا حضرت علیؑ کی تلوار نے جنگ کے میدانوں میں انھیں اس طرح کیفر کردار تک پہنچایا تھا کہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف شمشیر زنی میں مہارت رکھنے والے ان کے دست وبازو شل ہو گئے تھے۔ ان کے پر تمکنت چہرے حسرتوں اور ناکامیوں کی تیز دھوپ میں جھلس کر سیاہ پڑ گئے تھے اور مسلسل مایوسیوں نے ان کے جسموں کا سارا لہو نچوڑ کر انھیں لاغر اور کمزور بنا دیا تھا۔ یہ لوگ اقتصادی ومعاشی زبوحالی کا شکار ہو چکے تھے اور اب ان میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ یہ دوبارہ اسلام کے خلاف اپنی دشمنی اور عداوت کا پرچم بلند کرتے۔ اس لئے "مرتا کیا نہ کرتا" کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اس سرکش قبیلے کے باقی ماندہ افراد نے فتح مکہ کے موقع پر جبراً وقہراً اسلام قبول کر لیا مگر چونکہ ان کا اسلام مجبوری کا اسلام تھا، اس لیے یہ لوگ ہمیشہ ناقص الاسلام رہے۔

معاویہ کی پیدائش

کتابوں میں معاویہ کی تاریخ پیدائش کا تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ بعض مورخین کی تحریروں سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ پیغمبر اسلامؐ کی بعثت سے پانچ برس قبل اس دنیا میں وارد ہوئے۔ بعض نے ان کے نطفے کو مشکوک قرار دیا ہے مثلاً علامہ زمخشری، اصمعی اور ابن ہشام نے ان کے نطفے کو چار یاری قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "معاویہ، ابوسفیان بن حرب، عباس بن عبدالمطلب، عمارہ بن ولید بن مغیرہ مخزومی اور مسافر بن ابی عمرو میں سے کسی ایک کا نطفہ ہے کیوں کہ ان چاروں آدمیوں کے ناجائز تعلقات معاویہ کی ماں ہندہ سے تھے"۔ لیکن علامہ کلبی کا بیان ہے کہ معاویہ صرف مسافر بن ابی عمرو کا بیٹا ہے جو ابوسفیان کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اس کی طرف

منسوب ہو گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک نئی محقق مولوی عبدالوحید خاں کا بیان کافی دلچسپ اور قابل توجہ ہے۔ موصوف اپنی کتاب "سرگزشت معاویہ" میں لکھتے ہیں۔

"معاویہ کے پردادا امیہ نے ایک شامی لڑکی "ام العبیس" سے زنا کا ارتکاب کرنے کے بعد اسے اپنی زوجیت میں لے لیا تھا جس کے شکم سے ذکوان نامی ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کی کنیت ابوعمرو تھی اور یہی ابوعمرو عقبہ کا دادا تھا۔ پھر امیہ نے اپنی اس بیوی کو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے بیٹے ابوعمرو کے تصرف میں دے دیا اور ان دونوں ماں بیٹوں کے اشتراک وجنسی اختلاط سے مسافر نام کا ایک لڑکا پیدا ہوا جو بطنی لحاظ سے ابوعمرو کا بھائی اور نطفے کے لحاظ سے اس کا بیٹا تھا۔ اس کے بعد مسافر جب جوان ہوا تو اس کی نظر ہندہ بنت عتبہ کے حسن وجمال پر ٹھہری اور دونوں میں معاشقہ ہو گیا۔ ہندہ اس وقت فاکہ بن ربیعہ کی بیوی تھی جو ایک مہمان خانے کا مالک تھا۔ جب فاکہ کو اس کی بدچلنی کا حال معلوم ہوا تو اس نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا ادھر ہندہ مسافر سے جنسی تعلقات کے نتیجے میں حاملہ ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب اس کا حمل ظاہر ہوا تو مسافر اسے چھوڑ کر کہیں فرار ہو گیا۔ دوسری طرف عمارہ بن ولید، ابوسفیان بن حرب اور عباس بن عبدالمطلب کے بھی ناجائز تعلقات ہندہ سے تھے لیکن ان لوگوں میں ابوسفیان اس کے حسن وجمال پر دل وجان سے فریفتہ تھا چنانچہ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ہندہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا اور اس واقعہ کے تیسرے مہینے حضرت معاویہ پیدا ہوئے[1]

علامہ خلیق الرحمان اپنی کتاب "ابن ابوسفیان" میں رقم طراز ہیں:

"ابوسفیان کے گھر میں آنے کے بعد بھی ہندہ کی جنسی تشنگی دور نہ ہو سکی اس کا

[1] سرگزشت معاویہ ص ۲۵ مطبوعہ نولکشور ۱۳۴۴ھ

تعلق صباح نامی ایک شخص سے ہو گیا جو ذات کا ڈوم اور ابوسفیان کا غلام تھا اس سے معاویہ کا ایک بھائی بھی پیدا ہوا جس کا نام عتبہ تھا[1]"

شائد انھیں اسباب کی بنا پر حضرت امام حسن علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "میں اس فرش کو جانتا ہوں جس پر معاویہ پیدا ہوا ہے"۔ اس قول امامت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ امام کے اس فرمان میں چار یاری اشارہ پنہاں ہے جس میں معاویہ کو ابوسفیان بن حرب، عباس بن عبدالمطلب، عمارہ بن ولید مخزومی اور مسافر بن ابوعمرو کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

معاویہ کے بچپن سے جوانی تک کے واقعات کی تفصیل تاریخی کتابوں میں نہیں ملتی۔ صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ ہندہ جیسی ماں کی آغوش میں پرورش وتربیت پانے والا بچہ اپنی جوانی میں کردار کے اعتبار سے کیسا رہا ہو گا؟

معاویہ کے والدین

ابوسفیان ــ معاویہ کا نام نہاد باپ ابوسفیان، عہد رسالت میں اپنے قبیلے کا سردار تھا جو فتح مکہ کے موقع پر اسلام کی قوت وجلالت سے متاثر ہو کر مسلمان تو ہو گیا تھا، لیکن اس کی نفسیاتی حالت وہی رہی جو ایک شکست خوردہ انسان کی ہوتی ہے۔ نفرت، عداوت، غصہ، اور جذبۂ انتقام ــ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ خوف جس کے نتیجے میں وہ کھل کر اپنی دشمنی کا اظہار تو نہ کر سکتا تھا مگر برابر اس موقع کی تلاش میں لگا رہتا تھا کہ کس صورت سے اسلام کو نقصان پہنچائے۔

اسلام لانے کے بعد بھی اس کی کوشش یہی رہی کہ وہ اگر اسلام کو ختم نہ کر سکے تو

[1] ابن ابوسفیان ص ۴۲

کم از کم اس کے ان بنیادی خطوط اور امتیازی خصوصیات کو تبدیل کر دے جو بحکم خدا پیغمبر اسلام نے معین فرمائے ہیں مگر چونکہ پیغمبر اکرمؐ کی زندگی میں یہ کام اب اس کے لیے ممکن نہیں رہ گیا تھا اس لیے اسلام کے خلاف وہ منافقانہ حربے استعمال کرتا رہا۔

فتح مکہ سے ۶ سال قبل ۲ھ میں اسی ابوسفیان کی چیرہ دستیوں اور ریشہ دوانیوں کا حتمی نتیجہ بدر کا معرکہ تھا۔ یہ کفر اور اسلام کے درمیان پہلی جنگ تھی اس جنگ کے لیے مسلمان تیار بھی نہیں تھے صرف چند عدد گھوڑے، چند تلواریں اور ایک ہزار مشرکین کے مقابلے میں تین سو تیرہ مجاہدین کا لشکر[1] مگر بنی ہاشم کے جانبازوں نے مخالفین کے دانت کھٹے کر دئے۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ، جناب حمزہ بن عبدالمطلب اور عبیدہ بن حارث نے وہ یادگار کارنامے انجام دئے جو تاریخ کا جز بن گئے حالانکہ اس جنگ کے دوران حضرت عبیدہ بن حارث شہید کر دئے گئے مگر اس کے ساتھ ہی ابوسفیان کو بھی بہت بڑے جانی و مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت علیؑ کے ہاتھ سے اس کا ایک بیٹا حنظلہ قتل ہوا اور دوسرے بیٹے عمرو کی گرفتاری عمل میں آئی[2] معاویہ چونکہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا اس لیے وہ قتل اور گرفتاری دونوں سے بچ گیا۔

اس لڑائی میں ابوسفیان کی بیوی ہندہ کو بھی اپنے باپ عتبہ، چچا شیبہ اور بھائی ولید کی زندگیوں سے محروم ہونا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم شکست و ہزیمت کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ابوسفیان کے دل میں غم و غصہ اور نفرت و عداوت کی آگ اور بھی بھڑکی ہوگی۔ کیونکہ اس بدر کے معرکہ نے شرک کی وہ عمارت متزلزل کر دی تھی جس کے زیر سایہ ابوسفیان کی زندگی بسر ہوئی تھی۔ چنانچہ اس نے ہر

[1] طبری ج ۲ ص ۲۲۷ [2] ابن ہشام ج ۲ ص ۳۷ و طبری ج ۲ ص ۲۷۹۔

ممکن طریقے سے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف کفار مکہ کے دلوں میں انتقامی جذبات کو مشتعل کیا۔ مردوں اور عورتوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے مقتولین پر آنسو نہ بہائیں کیونکہ گریہ و ماتم سے غم و غصہ کی شدت میں کمی ہوگی۔ صدمہ زائل ہوگا اور انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ شعراء کو منع کیا کہ وہ مقتولین کا مرثیہ نہ کہیں، اور اپنے بارے میں یہ اعلان کیا کہ جب تک محمدؐ سے میں مقتولین بدر کا بدلہ نہ لے لوں گا اس وقت تک نہ تو عورت سے مقاربت کروں گا اور نہ ہی سر میں تیل ڈالوں گا[1]

غرض کہ کفار مکہ کے دلوں میں انتقام کے بھڑکتے ہوئے شعلوں نے ۳ھ میں احد کے مقام پر ایک اور جنگی مہم کا آغاز کیا۔ اس جنگ میں ابوسفیان نے پیغمبر اسلامؐ کو شکست دینے کے لیے خصوصی تیاریاں کی تھیں اور اس کی تین ہزار کی فوج میں کنانہ اور تہامہ کے باشندے بھی شامل تھے[2]

اس لڑائی میں اپنے عام فوجیوں کی حوصلہ افزائی اور خاص خاص سرداروں کی دلبستگی کے لیے ابوسفیان اپنی دو بیویوں ہندہ اور عمیرہ کے ساتھ مشرکین مکہ کی دیگر عورتوں کو بھی گھروں سے نکال کر لے گیا تھا چنانچہ اس کے اس کثیر التعداد لشکر میں صفوان بن امیہ کی دو بیویاں، حارث اور طلحہ بن ہشام کی بیویاں، کنان و سفیان بن عولیف کی بیویاں، نعمان و جابر کی مائیں اور خناس بنت مالک وغیرہ شامل تھیں۔

احد کے راستے میں ابواء کے مقام پر ابوسفیان کا لشکر خیمہ زن ہوا جہاں پیغمبرؐ اسلام کی مادر گرامی جناب آمنہ کی قبر تھی۔ اس نے مشرکین کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ جناب آمنہ کی قبر کھود کر ان کی ہڈیوں کا ڈھانچہ نکال لیا جائے، اس لیے کہ جنگ میں غالب آنے کے بعد اگر محمدؐ نے ہماری عورتوں کو قید کر لیا تو یہی ڈھانچہ ان کی رہائی کا وسیلہ

[1] مغازی رسول، واقدی ص ۹۰-۹۳، [2] ابن ہشام ج ۲ ص ۶۸۔

بنے گا اور اگر ہماری عورتیں گرفتاری سے بچی رہیں تو اسی ڈھانچے کے ذریعہ ہم ان سے مال کثیر وصول کریں گے۔ مگر لشکر کے بہت سے سردار اس پر راضی نہ ہوئے اور اس کی یہ تجویز ٹھکرا دی گئی[1]۔

ابواء سے ابوسفیان کا لشکر جب احد کی طرف روانہ ہوا اور پیغمبر اسلامؐ کو اس کی پیش قدمی کا حال معلوم ہوا تو آپ نے حضرت علیؑ سے فرمایا کہ مقابلے کی تیاری کرو۔

تین ہزار مشرکین کے مقابلے میں پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ صرف سات سو مسلمانوں کا ایک مختصر سا دستہ مدینہ سے چلا اور احد کے مقام پر گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی مورخین کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ اور حضرت حمزہ دشمنوں کی صفوں میں گھس جاتے اور دس، بیس، پچاس کو ٹھکانے لگا دیتے۔ یہاں تک کہ ایک منزل وہ بھی آئی کہ مشرکین کے پاؤں اکھڑ گئے اور مسلمان مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔

پیغمبر اسلامؐ نے احد کی پشت پر ایک سو چالیس تیراندازوں کو یہ کہہ کر معین فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو فتح نصیب ہو یا شکست، لیکن یہ لوگ اپنی جگہ نہیں چھوڑیں گے لیکن ان تیراندازوں نے جب اپنے ساتھیوں کو مال غنیمت لوٹتے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دیں اور وہ بھی مال غنیمت کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موقع پا کر خالد بن ولید اسی طرف سے عبداللہ ابن جبیر اور اس کے کچھ ساتھیوں کو تہ تیغ کرتا ہوا مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ ادھر سے وہ مشرکین بھی پلٹ پڑے جن کے پاؤں میدان جنگ سے اکھڑ چکے تھے چنانچہ جنگ کی نوعیت بدلی اور مسلمانوں کی ساری کامیابی و کامرانی یاس و نامرادی میں ڈھل کر رہ گئی۔ اچانک یہ خبر بھی پھیلی کہ سرکار دو عالم شہید کر دئے گئے۔ بس یہ سننا تھا کہ بڑے بڑے اکابرین صحابہ سر پر پاؤں رکھ کر

[1] مغازی واقدی ص ۱۵۵ و ۱۶۰۔

میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ صحیح بخاری، درمنثور اور کنزالعمال میں مرقوم ہے کہ حضرت ابوبکر، حضرت عثمان اور حضرت عمر وغیرہ بھاگ کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئے تھے چنانچہ ان لوگوں کا بیان ہے کہ ہم لوگ پہاڑ کی چوٹی پر اس طرح اچک پھاند رہے تھے جس طرح پہاڑی بکریاں اچکتی ہیں[1]

اس جنگ میں ستر مسلمانوں کے ساتھ حضرت حمزہ بھی معاویہ کی ماں ہندہ کے ایک عاشق "وحشی" کے ہاتھوں شہید ہوئے اور ہندہ نے آپ کا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبایا۔

حضرت علیؑ کے جسم پر سولہ زخم کاری لگے تھے اور آپ کا ایک ہاتھ بھی ٹوٹا تھا لیکن اس شیر ذوالجلال کی تلوار نے نہ صرف اسلام کی شکست کو فتح و کامرانی میں تبدیل کیا بلکہ اپنی جان پر کھیل کر سرور کونینؐ کو بھی بچایا جو پیشانیٔ اقدس پر پتھر لگنے اور دو دانت شہید ہو جانے کی وجہ سے کرب و اضطراب میں مبتلا تھے[2]۔

۵ھ ہجری میں ابوسفیان نے ایک آخری کوشش یہ کی کہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف عرب میں جتنے قبیلے تھے ان سب کو اس نے متحد کیا اور یہودیوں سے ساز باز کر کے انھیں اپنے ساتھ ملایا۔ اس طرح جب دس ہزار کا لشکر تیار ہو گیا تو اس نے رسول اکرمؐ کو شکست دینے کے لیے مدینے پر چڑھائی کی۔ اس جنگ کو تاریخ جنگ احزاب یا جنگ خندق کے نام سے یاد کرتی ہے۔

اس لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی لیکن ان حق پرستوں نے باطل کے پرستاروں کو ایک بار پھر کیفر کردار تک پہنچایا اور کلِ کفر پر کل ایمان غالب آیا۔ یہاں تک کہ ابوسفیان کو شکست فاش ہوئی اور وہ اپنی تباہی و بربادی کا ماتم کرتا ہوا ناکام و نامراد واپس پلٹا۔ اب اس میں اسلام کے خلاف محاذ آرائی اور پیغمبر اسلامؐ سے مقابلہ کی ہمت

[1] درمنثور ج ۲ ص ۸۸، کنزالعمال ج ۱ ص ۲۳۸۔ [2] طبری ج ۲ ص ۶۰۴ و کامل ج ۲ ص ۵۸۔

نہیں رہ گئی تھی لیکن اس کے دل میں جو گھاؤ پڑ چکے تھے وہ کبھی نہ بھرے اور یہ فطری بات ہے کہ انسان شکست خوردہ اور بے بس و مجبور ہو جانے کے بعد سر جھکا سکتا ہے، ہاتھ روک سکتا ہے۔ ہتھیار ڈال سکتا ہے اور زبان بند کر سکتا ہے لیکن اپنے دل کی کیفیات میں تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا۔ کیا وہ نفرت و عداوت جو بام عروج تک پہنچ چکی تھی محبت اور عقیدت میں تبدیل ہو سکتی تھی؟ ہرگز نہیں ؟ لہٰذا وہ دشمن جو پھنکاریں مارتے ہوئے اژدہے کی شکل میں پیغمبر اکرمؐ کے سامنے موجود تھا فتح مکہ کے بعد آستین کا سانپ بن کر خفیہ ریشہ دوانیوں کے لیے آزاد ہو گیا اور پہلے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ شائد اسی لیے حضرت علیؑ نے اس گروہ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے بلکہ انہوں نے اسلام کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے۔

تاریخ کا بیان ہے کہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد بھی ابوسفیان کے قول و فعل سے منافقت آشکار ہوتی رہی۔ مثلاً جنگ حنین میں جب کچھ صحابہ نے حسب عادت راہ فرار اختیار کی تو اس کی زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ "اب تو مسلمان سمندر پار تک بھاگیں گے"[1] اور جنگ یرموک کے موقع پر اس نے جب مسلمانوں پر رومیوں کا غلبہ دیکھا تو فرط مسرت سے جھوم اٹھا اور کہنے لگا: "شاباش روم کے بہادرو" لیکن جب رومیوں پر مسلمان غالب آئے تو اس نے اظہار تاسف کیا اور کہا، "روم کے تاجداروں کا نام کہیں مٹ نہ جائے"۔

عبداللہ ابن زبیر نے جب ابوسفیان کی اس منافقانہ کیفیت کا تذکرہ اپنے باپ سے کیا تو اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا، خدا ابوسفیان کا برا کرے یہ نفاق

---

[1] ۔ طبری ج ۱ واقعات جنگ حنین

سے کبھی باز نہیں آ سکتا۔"

پیغمبر اسلامؐ جب دنیا سے رخصت ہوئے اور سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت عمر کی مدد سے حضرت ابوبکر مسند خلافت پر قابض ہوئے تو ابوسفیان اس وقت مدینہ میں موجود نہیں تھا۔ کسی سفر سے واپس لوٹ رہا تھا کہ راستے میں اسے اس الم ناک حادثے کی خبر ملی۔ اس نے پوچھا کہ مسلمانوں کی امارت و قیادت کس کو ملی؟ بتایا گیا کہ حضرت عمر کے کہنے پر لوگوں نے ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ یہ سننا تھا کہ عمر کا مارا ہوا یہ فتنہ پرداز سوچ میں پڑ گیا اور آخر کار ایک تجویز لے کر عباس ابن عبدالمطلب کے گھر آیا اور ان سے کہنے لگا کہ لوگوں نے سقیفہ میں دھاندلی مچا کر خلافت ایک تیمی کے حوالے کر دی ہے اور بنی ہاشم کو ان کے حق سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ہے یہ خلیفہ اپنے بعد بنی عدی کے ایک تند خو اور درست مزاج شخص کو ہمارے سروں پر مسلط کر جائے گا چلو۔ علی ابن ابی طالبؑ سے کہیں کہ گھر کا گوشہ چھوڑیں اور اپنے حق کے لیے میدان میں اتر آئیں۔

چنانچہ وہ جناب عباس ابن المطلب کو لئے ہوئے حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ آپ ہاتھ بڑھائیں میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ اور اگر کوئی شخص مخالفت کے لیے کھڑا ہوا تو میں مدینے کے گلی کوچوں کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔

حضرت علی علیہ السلام کے لیے یہ انتہائی نازک مرحلہ تھا اس لیے کہ آپ پیغمبرؐ کے حقیقی وارث جانشین تھے اور ابوسفیان جیسا طاقتور قبیلے والا سردار آپ کی مدد پر آمادہ تھا۔ صرف ایک اشارے میں ہی جنگ کے شعلے بھڑکنے لگتے اور حضرت ابوبکر کی خلافت کا تختہ پلٹ جاتا مگر آپ کی اصابت فکر اور حکیمانہ تدبر نے مسلمانوں کو ایک بہت بڑے فتنے سے بچا لیا، کیونکہ آپ کی دوررس نگاہوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ شخص قبائلی تعصب اور نسلی امتیاز کو ابھار کر آپس میں لڑوانا چاہتا ہے تاکہ اسلام

میں ایک ایسا زلزلہ آ جائے جو اس کی بنیادوں کو ہلا دے۔ لہٰذا آپ نے اس کی تجویز کو ٹھکرا کر اسے سختی سے جھڑک دیا۔

اس کے بعد خلیفہ ثانی حضرت عمر نے مرتے وقت شوریٰ کمیٹی میں گنجائش پیدا کر کے جب خلافت کو بنی امیہ کی ایک ممتاز فرد عثمان بن عفان کے حق میں منتقل کیا اور اقتدار کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آئی تو یہی ابوسفیان صاحب ان کے پاس بھی پہنچے اور اپنی رشتہ داریوں کے حوالے سے کہنے لگے کہ ابوبکر اور عمر کے بعد یہ خلافت تمھیں مقدر سے ملی ہے اسے گیند کی طرح گردش دو اور بنی امیہ کے ذریعہ اس کی بنیادوں کو مستحکم کرو، یہ خلافت میرے نزدیک بادشاہی ہے، اسے اسی خاندان میں رہنا چاہیئے اور جہاں تک دوزخ و جنت کا سوال ہے تو اس پر میں یقین نہیں رکھتا[1]

اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ابوسفیان کی کھلی ہوئی دشمنی، اور ایذا رسانی کے اس مسلسل عمل سے جو آغاز اسلام سے فتح مکہ تک جاری رہا انکار ممکن نہیں ہے لیکن افسوس کہ وہابیوں نے اس کی تمام خطاکاریوں اور جرائم کی پردہ پوشی کا بیڑا اٹھا رکھا ہے یہ لوگ ابوسفیان کے قبول اسلام کا سہارا لے کر اس کے ماضی کو بالکل ہی فراموش کر دیتے ہیں اور اس کے بارے میں یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ایام جاہلیت میں بھی بڑے محترم سردار تھے اور اسلام لانے کے بعد تو اتنے بڑے محترم ہو گئے کہ خود رسولؐ اللہ ان کا احترام کرنے لگے تھے۔

ابوسفیان کو فضیلت مآب بنانے کے لیے وہابی فرقہ یہ بھی کہتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول اکرمؐ نے انھیں کچھ ذمہ داریاں بھی سونپی تھیں اور منصب بھی عطا کیا تھا۔

---

[1] ۔ تاریخ ابن عساکر ج ۶ تذکرہ صخرہ بن حرب۔

حالانکہ وہابیوں کی یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے، اس لیے کہ خلق عظیم کا تو مزاج ہی ایسا تھا کہ وہ نومسلموں کی تالیف قلوب کا خیال رکھتے تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد جنگ حنین میں جب مال غنیمت آپ کے ہاتھ آیا تو ابوسفیان اور اس کے خاندان والوں کو مولفتہ القلوب قرار دیتے ہوئے آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ لوگ اسلام میں نووارد ہیں لہٰذا ان کے ایمان کی مضبوطی کے لیے تالیف قلوب کی ضرورت ہے چنانچہ مال غنیمت میں سے ابوسفیان اور اس کے خاندان والوں کو آپ نے مال غنیمت میں سے خاص حصہ مرحمت فرمایا۔ اس کا تذکرہ احادیث میں موجود ہے اور اس تذکرہ میں ابوسفیان کے نام کے ساتھ ساتھ معاویہ کا نام بھی نمایاں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بنی ہاشم کے بعد قریش کے تمام قبیلوں میں بنی امیہ کو امتیازی درجہ حاصل تھا اور ابوسفیان ان کا سردار تھا۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر جب اس نے اسلام قبول کیا تو یہ پیغمبر اکرمؐ کا حسن اخلاق تھا کہ آپ نے اس کا معاشرتی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے یہ اعلان کر دیا تھا کہ کفار قریش میں سے جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اسے امان دی جائے گی لیکن وہابی فرقہ رسول کریمؐ کی اس کرم نوازی اور حسن اخلاق میں بھی ابوسفیان کا ایمان تلاش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور اکرمؐ کا یہ حسن سلوک محض اس وجہ سے تھا کہ ابوسفیان نے دل سے اسلام قبول کیا تھا اور انہوں نے اپنی پوری زندگی ایک سچے اور مخلص مسلمان کی طرح گزاری۔ اور شائد یہی وجہ ہے کہ یہ وہابی حضرات وقتاً فوقتاً ابوسفیان کو دی جانے والی چھوٹی چھوٹی ذمہ داریوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں جس سے کہ وہ اس کی ایمانی فضیلت ثابت کر سکیں۔ مثلاً، وہ یہ کہتے ہیں کہ قبیلۂ بنی ثقیف کے لوگوں نے اسلام لانے کے بعد پیغمبر اسلامؐ سے یہ درخواست کی تھی کہ ان کے بتوں کو توڑا نہ جائے مگر رسول اللہؐ نے جب اس قبیلے کے بتوں کو توڑنے کا ارادہ کیا تو اس خدمت پر آپ نے ابوسفیان

اور مغیرہ کو مامور فرمایا۔

وہابیت کے پرستار ابوسفیان کی دوسری فضیلت اس منصب میں تلاش کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے انھیں نجران کا والی بنایا تھا حالانکہ طبری کے بیان کے مطابق ابوسفیان کی ذمہ داری صرف صدقات کی وصولیابی تک محدود تھی اور نماز کی امامت کے لیے الگ سے عمرو بن حزام کو مامور کیا گیا تھا۔

یہ دونوں روایتیں ابوسفیان کے ایمان پر دلالت نہیں کرتیں۔ رسول اللہؐ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ ابوسفیان جیسے باطنی مشرک کے دل میں پیدائشی طور پر بت پرستی کا جو جذبہ کارفرما ہے اسے ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسی کے ہاتھ سے ان بتوں کو تڑوایا جائے جو قبیلۂ بنی ثقیف کے مجازی خدا ہیں ہذا بت شکنی کا یہ واقعہ ابوسفیان کے ایمان کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اور دوسری روایت کے مطابق ابوسفیان کو نجران کا والی مقرر کرنے کے باوجود اسے نماز کی امامت سے دور رکھا گیا جب کہ عام قاعدے کے تحت اس زمانے میں امامت کے فرائض بھی والی کے فرائض منصبی میں شامل ہوا کرتے تھے۔ اس لیے یہ روایت بھی ابوسفیان کا ساتھ نہیں دیتی مختصر یہ کہ ابوسفیان کی کوئی فضیلت اسلام کے حوالے سے ممکن نہیں ہے لیکن بیچارے وہابیوں کی مجبوری یہ ہے کہ ابوسفیان معاویہ کا باپ ہے اور معاویہ علی ابن ابیطالبؑ کا بدترین دشمن — لہٰذا وہ ابوسفیان کی حمایت ووکالت کو اپنی بخشش کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ہندہ بنت عتبہ

ہندہ بنت عتبہ، جو جگر خوارۂ حمزہ کے نام سے مشہور ہے ابوسفیان کی بیوی اور معاویہ کی ماں تھی یہ اپنی عدیم المثال بدچلنی کی بنا پر اپنے پہلے شوہر فاکہ بن ربیعہ کی زوجیت سے محروم ہوکر ابوسفیان کے تصرف میں آگئی تھی لیکن یہاں بھی اس کے نفسانی خواہشات کا جوالامکھی ہمیشہ لاوا اگلتا رہا اور مختلف لوگوں کی آغوش میں

اس کی بدکرداری پروان چڑھتی رہی۔

اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی دشمنی میں یہ اپنے شوہر ابوسفیان سے بھی چار قدم آگے تھی۔ اس کی یہ عداوت یوں تو آغاز اسلام ہی سے تھی لیکن اس کا بھرپور مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب فتح مکہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد ابوسفیان ایک مسلمان کی حیثیت سے گھر میں داخل ہوا اور اس نے یہ کہہ کر اس کی مونچھیں اکھاڑ لیں کہ تونے اس چکنی پنڈلی والے کو قتل کیوں نہیں کر دیا[1]۔ ہندہ کی زبان سے نکلا ہوا یہ حملہ پیغمبر اسلامؐ سے متعلق تھا علامہ ابن اثیر کا کہنا ہے کہ ہندہ نے ابوسفیان کی مونچھیں نہیں اکھاڑی تھیں بلکہ اس نے اس کی لمبی داڑھی کو پکڑ کر اسے جھٹکا دیا تھا اور کہا تھا کہ تونے اس شیخ الحمقاء کو قتل کیوں نہیں کر دیا[2]"

ہندہ کافرہ سے مسلمان کب ہوئی؟ اس بارے میں مورخین کی صراحت ہے کہ جب رسول اللہ (صلعم) فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے اور تمام کفار قریش پر آپ کا تسلط قائم ہوگیا تو اسے بھی اپنی بےبسی و بےچارگی کا احساس ہوا چنانچہ جب عورتوں کی بیعت کا سلسلہ شروع ہوا تو ابوسفیان کی پناہ میں یہ بھی بیعت کے ارادے سے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی لیکن اس موقع پر بھی اس کی بےغیرتی اور چرب زبانی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور بیعت کے دوران اس نے پیغمبر اکرمؐ کو جو جلے کٹے جوابات دئے، ان سے اس کی چھپی ہوئی نفرت کا پتہ چلتا ہے"

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: — تم آج سے شرک کا ارتکاب تو نہیں کروگی؟

ہندہ: یہ عہد آپ نے مردوں سے کیوں نہیں لیا، خیر آپ کہتے ہیں تو مجھے بھی منظور ہے

پیغمبرؐ: وعدہ کرو کہ تم آئندہ چوری نہیں کروگی۔

---

[1] زادالمعاد ج۲ ص ۲۳ [2] تاریخ کامل ج۲ ص ۲۹۶

ہندہ: چوری سے مجھے دلچسپی نہیں ہے، البتہ کبھی کبھی اپنے بخیل شوہر کے مال میں سے کچھ چرالیا کرتی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ یہ فعل جائز ہے یا ناجائز

پیغمبرؐ: تم کسی کا خون تو نہیں بہاؤگی؟

ہندہ: ہم نے اپنی اولادوں کو خون چسا کے پالا تھا لیکن جب وہ جوان ہوئے تو بدر میں آپ نے انھیں قتل کر دیا"

ہندہ چونکہ ایک فاحشہ، بدچلن، زناکار اور بدکردار عورت تھی اس لیے پیغمبر اسلامؐ نے اس خاص طور پر یہ عہد بھی لیا کہ وہ آئندہ زنا نہیں کرے گی۔ اس پر ہندہ نے جواب دیا کہ کیا شریف عورتیں زنا بھی کرتی ہیں؟۔

مورخین کا بیان ہے کہ ہندہ کا یہ جواب سن کر حضور اکرمؐ نے حضرت عمر کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرادئے۔ علامہ مجلسی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر اس موقع پر موجود تھے اور چونکہ وہ زمانۂ جاہلیت کے عملی شاہد بھی تھے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر تبسم فرمایا تھا"

جنگ بدر سے فتح مکہ تک

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ جنگ بدر کے بعد اسلام ایک اجتماعی، سیاسی اور روحانی طاقت کی حیثیت سے دنیا میں ابھرا اور کفار مکہ کے ساتھ ساتھ رومیوں اور ایرانیوں نے بھی پہلی بار یہ محسوس کیا کہ "لاالہ الا اللہ" کا نعرہ فقط بتوں کے اقتدار ہی کو چیلنج نہیں کرتا بلکہ بت پرستوں کے اقتصادی معاشرے کے لیے بھی خطرناک ہے چنانچہ مشرکین مکہ نے اسلام کے وجود کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے اور ان اقدام کی قیادت بنی امیہ کے ہاتھوں میں رہی، لیکن یہ قیادت اپنی مخالفانہ سرگرمیوں میں قطعی طور پر ناکام رہی اور مسلسل ومتواتر شکست کھانے کے بعد اس نے فتح مکہ

کے دن ہتھیار ڈال دئے۔

اگر مکہ پر اس اسلامی حملے کا منصوبہ مکمل طور پر صیغہ راز میں نہ رکھا جاتا تو یقیناً بڑی خوں ریز جنگ ہوتی۔ مگر بنی امیہ کے سرداروں کو اس کا علم اس وقت ہوا جب مسلمانوں کا لشکر شہر مکہ کے سامنے پہنچ چکا تھا اور ان کے لیے ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا چنانچہ مکہ، علاوہ ایک معمولی جھڑپ کے جو ایک سڑک پر ہوگئی تھی، بغیر جنگ کے فتح ہوگیا اور کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہیں ہوا۔

اہل مکہ چونکہ اسلامی فوج سے لڑنے کی ہمت وجرأت نہیں کر سکے تھے اس لیے انھیں مجبوراً دائرہ اسلام میں داخل ہونا پڑا حالانکہ ان کے عنصر ابوسفیان کو ان باتوں کا شدید احساس تھا کہ اس کی قیادت اب محمدؐ کی طرف منتقل ہو رہی ہے جو اس کے حریف قبیلے بنی ہاشم کے چشم وچراغ ہیں اس کے باپ دادا کا مذہب ختم ہو رہا ہے اور مکی اقتدار کا مرکز مدینہ بن رہا ہے۔

حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ان تمام باتوں کا اندازہ تھا، نیز آپ کی خواہش یہ بھی تھی کہ مکہ بغیر خوں ریزی کے فتح ہو جائے اس لیے آپ نے مشرکین کے ساتھ ہر طرح کی مراعات کو روا رکھا اور سب سے زیادہ رعایت ابوسفیان کے خاندان کے ساتھ کی کیونکہ اسی خاندان کے لوگوں سے زیادہ خطرہ تھا۔

تاریخ کی کتابوں میں جناب عباس بن عبدالمطلب کی یہ سفارش موجود ہے کہ یا رسول اللہ ابوسفیان شہرت پرست آدمی ہے اس کے لیے کوئی ایسا حکم دیجیے جس سے یہ خوش ہو۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے بھی پناہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی خاص بات یہ بھی ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوسفیان اور اس کے گھر والوں کو مؤلفۃ القلوب قرار دیا۔ چنانچہ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ:۔

"مولفتہ القلوب سے مراد قریش کے وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ کے دن کمزور اسلام کے ساتھ مسلمان ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ ان میں وہ بھی شامل ہیں جو صفوان بن امیہ کی طرح ایمان ہی نہیں لائے"۔

یہ لوگ جو کمزور اور ضعیف ایمان کے ساتھ اسلام لائے، صحابہ کے زمرہ میں شامل ہو گئے اور ان میں بعض معاویہ کی طرح ایسے بھی ہیں جن کو مسلمانوں کے ایک گروہ نے اپنی خوش عقیدگی کی بنا پر جلیل القدر صحابہ کا رتبہ دے دیا اور ان میں کتنے ہی ایسے ہیں جن سے حدیثیں نقل کی گئیں اور انھیں "الصحابۃ کلھم عدول" کے دائرے میں لاکر عادل قرار دے دیا گیا حالانکہ ان میں عدالت نام کی کوئی بھی چیز نہیں تھی بہرحال اب اہلسنت اور اہل حدیث میں اس بات پر باہمی اتفاق ہے کہ تمام صحابہ عدول ہیں لہٰذا راویوں کے ثقہ ہونے کی چھان بین صرف تابعین تک ہی محدود رہ سکتی ہے صحابہ اس سے بالاتر ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی بھی صحابی غلط اور موضوعہ حدیث بیان نہیں کر سکتا۔

فتح مکہ کے بعد یہ صحابہ جو بقول عسقلانی "اسلاماً ضعیفاً" کے مصداق تھے پیغمبر اسلامؐ کی صحبت سے زیادہ استفادہ نہ کر سکے، کیوں کہ ۸ھ ہجری میں مکہ فتح ہوا اور ۲۸ صفر ۱۱ھ ہجری کو سرکار دو عالمؐ نے سفر آخرت اختیار فرمایا۔ اس مختصر سی مدت میں بھی کئی غزوات ہوئے جہاں تک ابوسفیان اور معاویہ کا سوال ہے تو یہ لوگ مسلمان ہوتے ہی رسولؐ کی صحبت میں نہیں آئے بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سوسائٹی نے کافی عرصہ تک انھیں قبول ہی نہیں کیا، جیسا کہ صحیح مسلم کی اس روایت سے ظاہر ہے :۔

"ابوذمیل ابن عباس سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ مسلمان نفرت کے سبب سے نہ ابوسفیان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے تھے اور نہ اس کے ساتھ بیٹھتے

تھے۔ چنانچہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا 'یا رسول اللہ میری تین باتیں قبول فرما لیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا "ہاں" اس نے کہا میرے پاس میری بیٹی عرب کی سب سے زیادہ حسین و جمیل عورت ہے اس کو میں آپ کی زوجیت میں دیتا ہوں۔ آپ نے فرمایا "اچھا" پھر اس نے کہا میرے بیٹے معاویہ کو اپنا کاتب بنا لیجئے آپ نے فرمایا اچھا' پھر کہا' مجھے آپ کافروں سے قتال کا اس طرح حکم دیجئے جس طرح میں مسلمانوں سے قتال کیا کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا "اچھا" ابوذمیل کہتا ہے کہ اگر ابوسفیان ان تینوں باتوں کی خواہش نہ کرتا تو پیغمبر اکرمؐ اسے نہ دیتے۔ حضورؐ کی یہ عادت تھی کہ جب ان سے کوئی چیز طلب کی جاتی تو وہ ہاں کہہ دیا کرتے تھے"[1]

اگرچہ اس روایت میں واقعاتی اعتبار سے باطنی تردید موجود ہے اور علماء نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے مگر چونکہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں اسے نقل کیا ہے لہٰذا اہل سنت نے اسے درست تسلیم کر کے اس کے واقعات کی تاویل کر دی ہے واقعہ یہ ہے کہ اس روایت کی رو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ام حبیبہ ابوسفیان کے اسلام میں داخل ہونے کے بعد رسول اللہ کی زوجیت سے مشرف ہوئیں جب کہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ان کا نکاح فتح مکہ سے قبل ہی رسول اللہ کے ساتھ ہو چکا تھا اور ابوسفیان فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوا۔ اس واقعہ کی تاویل یوں کی جاتی ہے کہ ابوسفیان نے اپنی بیٹی کے بارے میں جو درخواست کی اس کا مطلب یہ تھا کہ آنحضرت تجدید نکاح کریں، کیونکہ آپ کا پہلا عقد ابوسفیان کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ ابن حزم نے اس روایت اور تاویل کی تردید کرتے ہوئے اسے موضوعہ قرار دیا ہے لیکن اس زبردست نقص کے باوجود اہل سنت حضرات اس روایت کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اور اس کی تاویل پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ چونکہ مسلمان ابوسفیان سے نفرت کرتے

---

[1]۔ صحیح مسلم کتاب الفضائل

تھے اور اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا لہٰذا اس نے یہ ترکیب سوچی کہ تجدید نکاح کے ذریعہ وہ مسلم سوسائٹی میں اپنا وقار قائم کرے گا۔

اور اگر روایت کے اس پہلو کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی اس کے موضوع ہونے کے ثبوت میں چند باتیں ابھر کر سامنے آئی ہیں۔ اول یہ کہ ابوسفیان کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی عہد رسالت کے مسلمانوں نے ایک مدت تک اسے اپنے معاشرے میں قبول نہیں کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انصار و مہاجرین کے نزدیک اس کا اسلام مشکوک و مشتبہ تھا۔ لہٰذا یہ استدلال بھی عبث ہے کہ جب فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ نے اس کے اسلام کو قبول فرما لیا تو اس کے خلاف آئندہ شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ اس روایت سے یہ ثابت ہے کہ مہاجرین و انصار ابوسفیان سے نفرت کرتے تھے اور مسلمان ہونے کے باوجود انہوں نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔

اس ذیل میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان اور اس کے خاندان کے ساتھ مراعات کا برتاؤ کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبرؐ یہ چاہتے تھے کہ اسلام کی ایک مخالف قوت کو خوش اسلوبی کے ساتھ دبا دیا جائے کیوں کہ ابوسفیان اور اس کا خاندان ہی مخالفت کا سب سے زیادہ طاقتور محاذ تھا اور اس محاذ کو توڑنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس خاندان کو ان خصوصی مراعات سے نوازا جائے جن کے یہ مستحق نہیں ہے۔

فتح مکہ کے دن جب ابوسفیان کے گھر کو پیغمبر اسلامؐ نے جائے امن قرار دیا تھا تو یہ اس بنا پر نہیں تھا کہ اس کا ایمان اس کرم نوازی کا متقاضی تھا بلکہ یہ اس بنا پر تھا کہ حضور نے اپنے چچا عباس کی یہ سفارش قبول کر لی تھی کہ یا رسول اللہؐ ابوسفیان اعزاز کا بھوکا ہے لہٰذا اس کے ساتھ اعزازی سلوک کیا جائے۔

پھر جنگ حنین کے مال غنیمت میں سے تالیف قلوب کے لیے ایک خاص حصے کا دیا جانا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس خاندان کے ساتھ رسول اللہؐ کا یہ برتاؤ مخالفت کے محاذ کو توڑنے کی مصلحت کے تحت تھا۔

ابوسفیان چونکہ انتہائی عیار و مکار انسان تھا اس لیے اس نے مسلم سوسائٹی میں اپنی پوزیشن کو بحال کرنے کے لیے وہ طریقہ سوچا جو اس روایت میں موجود ہے البتہ اس امر کا امکان ضرور ہے کہ اس نے اپنی بیٹی ام حبیبہ سے تجدید عقد کی تجویز حضورؐ کے سامنے رکھی ہو۔ کیوں کہ شارحین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ام حبیبہ کا نکاح چونکہ ابوسفیان کی مرضی کے خلاف ہوا تھا اس لیے وہ اپنی توہین سمجھتا تھا"۔

اب جہاں تک رسول اللہؐ سے کہہ کر معاویہ کو کاتب مقرر کرانے کا سوال ہے تو اس تجویز کی تہ میں ابوسفیان کا یہ مقصد بھی کارفرما ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی کلیدی جگہ پر قبضہ کیا جائے جس کے ذریعہ اسلامی حکومت کے خفیہ راز معلوم ہو سکیں کیونکہ بعض مستند کتابوں سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ معاویہ کاتب وحی نہیں تھے۔ بلکہ انھوں نے عرب کے سرکش سرداروں اور رسول اللہؐ کے درمیان ہونے والی مراسلت کی کتابت کا کام اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔

صحیح مسلم کی اس عجوبہ روایت میں ابوسفیان کی تیسری خواہش یہ بیان کی گئی ہے کہ انھوں نے پیغمبر اسلام سے کہا کہ مجھے بھی کافروں سے قتال کی اجازت دی جائے تاکہ میں ان سے اسی طرح قتال کروں جس طرح مسلمانوں سے کیا کرتا تھا"۔

ابوسفیان کی اس خواہش پر غور کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آئی ہے کہ وہ اپنے اسلام و ایمان کے معاملے میں خود بھی مشکوک تھا ورنہ وہ کافروں سے قتال کا شاخسانہ کھڑا کر کے پیغمبر اکرمؐ کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش نہ کرتا

جب کہ اسے بدر، احد، اور خندق کی جنگوں سے اس امر کا تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ پیغمبرؐ قتال کے میدان میں ان مخلص مسلمانوں کو ہی اپنے ساتھ رکھتے تھے جن کی وفاداری قابل اعتماد ہو، یہ اور بات ہے کہ ابوسفیانی طینت کے حامل کچھ صحابہ قتال کے نام پر میدان سے راہ فرار اختیار کرتے رہے۔

اس روایت کے آخر میں انتہائی اہم اور معنی خیز مرحلہ راوی کا یہ اعلان ہے کہ اگر ابوسفیان رسول اللہؐ سے درخواست نہ کرتا تو وہ اسے یہ مراعات ہرگز نہ دیتے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ابوسفیان کی خواہشات کو قبول کرتے وقت حضور اکرمؐ کے پیش نظر وہ مصلحتیں بھی تھیں جو اس کی تالیف قلوب کا سبب بنیں، جب کہ سرکار دو عالم اسلام کو ابوسفیان اور اس کے خاندان والوں کی سازشوں سے دور رکھنا چاہتے تھے۔

جو لوگ ابوسفیان اور معاویہ کی صحابیت کو رسالت کا درجہ دینے کی کوششوں میں سرگرداں ہیں انھیں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ ابوسفیان اور معاویہ کے ساتھ دیگر صحابہ کا طرز عمل کیا تھا؟ وہ لوگ ان سے نفرت کیوں کرتے تھے اور انہوں نے مسلم سوسائٹی سے ان کا بائیکاٹ کیوں کیا؟

یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ جو لوگ فتح مکہ سے پہلے یا بعد مسلمان ہوئے وہ قابل احترام ہو گئے۔ کیونکہ کسی صحابی کی عظمت و منزلت اس کے اعمال صالحہ اور تقویٰ و پرہیزگاری پر منحصر ہے اور وہ قابل احترام اسی وقت ہو سکتا ہے جب کتاب خدا اور سنت رسول پر صدق دل سے عمل پیرا ہو اور اگر وہ کتاب خدا و سنت رسولؐ میں خیانت کا مجرم ہے تو اس کے لیے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ رسولؐ کا صحابی ہے اس لیے قابل احترام ہے جب کہ قرآن میں واضح طور

پر یہ صراحت بھی ہے کہ بہت سے صحابہ ایسے بھی ہیں جو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دئے جائیں گے"۔

فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں میں دو گروہ ایسے تھے جنھوں نے اسلام اور شریعت کو تباہ و برباد کیا۔ ایک گروہ وہ تھا جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا تھا اور دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے ابوسفیان اور معاویہ کی قیادت میں اسلام اور خاندان رسالت کے خلاف قدم قدم پر سازشوں اور فتنہ پردازیوں کے جال بچھائے۔ پہلے گروہ کو شکست سے دوچار ہونا پڑا کیونکہ ارتداد کی ایک لہر کے بعد اسے فنا کر دیا گیا تھا مگر دوسرے گروہ یعنی ابوسفیان اور معاویہ وغیرہ کی سازش کامیاب رہی اور شام اس کا مرکز بن گیا"۔

معاویہ اور اسلام

تاریخ نگاروں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ابوسفیان کی طرح معاویہ نے بھی فتح مکہ کے دن ۸ھ ہجری میں اسلام قبول کیا تھا اور اس کا اسلام بھی اس کے باپ ابوسفیان کے اسلام کی طرح سیاسی، نمائشی اور مجبوری کا اسلام تھا مگر اس ذہنیت اور سخن پروری کا کیا علاج ہے کہ معاویہ کے شیدائی اس کے بارے میں یہ غلط تاثر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "حضرت معاویہ فتح مکہ سے قبل ہی اسلام لا چکے تھے مگر کسی خاص مجبوری کی بنا پر وہ اسے ظاہر نہیں کر سکے اور یہ مجبوری خود معاویہ کی زبانی یوں بیان کی جاتی ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ میں فتح مکہ سے بہت پہلے مسلمان ہو گیا تھا مگر پیغمبرؐ کی خدمت میں مدینہ جانے سے اس لیے ڈرتا تھا کہ میری ماں مجھے یہ دھمکیاں دیا کرتی تھی کہ اگر تم مکہ چھوڑ کے مدینے گئے تو میں تمہارے تمام ضروری اخراجات بند کر دوں گی"۔

اول تو معاویہ کے پرستاروں کو یہی نہیں معلوم کہ سفید جھوٹ کی تہوں میں لپٹی ہوئی یہ روایت کہاں سے چلی اور کس کے ذریعہ ان تک پہنچی۔ دوسرے یہ عذر ہی ایسا ہے جو معاویہ کو جھوٹا ثابت کرتا ہے اس لیے کہ اگر وہ مدینے چلے بھی جاتے تو دیگر مہاجرین کی طرح انھیں بھی ضروری اخراجات فراہم ہو جاتے جبکہ ان کے قریبی عزیز عثمان بن عفان ایسے متمول اور مالدار لوگ بھی وہاں موجود تھے۔

بات دراصل یہ ہے کہ معاویہ نے جب سے خلیفۂ برحق حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا، اس وقت سے ان کے لئے "طلیق" اور "مولفۃ القلوب" کی اصطلاح کا استعمال عام ہو گیا تھا، خصوصاً حضرت امام حسن علیہ السلام کی دست برداری کے بعد معاویہ جب خود ساختہ خلیفہ بن بیٹھا تو لوگوں نے کھل کر کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ چونکہ طلفاء میں سے ہے اس لیے اس کی خلافت جائز نہیں ہے نیز حضرت علیؑ نے اپنے مکتوبات میں بھی اکثر و بیشتر اسے اس بات کا احساس دلایا تھا کہ وہ طلیق ہے لہٰذا ان حالات میں اس کا یہ دعویٰ کہ میں فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہو گیا تھا محض طلفاء کی سبکی سے بچنے کی کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

طلفاء کے بارے میں مشہور مورخ طبری کا بیان ہے کہ:-

"فتح مکہ کے دن وہاں کے کفار پر جب حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا اثر و نفوذ قائم ہو گیا تو آپ نے فرمایا، اے مکہ کے گمراہ لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ اہل مکہ نے کہا، یا رسول اللہؐ! آپ ہمارے ساتھ اچھا ہی سلوک کریں گے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ شریف ابن شریف، کریم ابن کریم ہیں اور خلق عظیم ہیں۔ اس پر آنحضرت نے فرمایا، اچھا جاؤ ہم نے تمھیں آزاد کیا[1]۔

---

[1] تاریخ طبری ج ا ب سیر النبیؐ

پاکستانی عالم مولانا مودودی رقم طراز ہیں کہ:-

"طلفاء سے مراد مکہ کے وہ خاندان ہیں جو وقت آخر تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دعوت اسلامی کے مخالف رہے، فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے انھیں معافی دی اور وہ اسلام میں داخل ہوئے حضرت معاویہ، ولید بن عقبہ اور مروان بن حکم وغیرہ انھیں معافی یافتہ خاندان کے افراد تھے اور عبداللہ ابن ابی سرح تو اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے[1]۔

ایک تعجب خیز بات یہ بھی ہے کہ معاویہ کے عقیدتمند انھیں فضیلت مآب بنانے کی کوشش میں یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اسلام لانے کے بعد کاتب وحی کے عہدے پر انھیں مامور فرمایا تھا اور یہ کتابت وحی کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔

گذشتہ صفحہ میں ضمنی طور پر ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ معاویہ کاتب وحی نہیں تھے اور نہ ہی رسول اللہ نے انھیں یہ عہدہ دیا تھا، بلکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوسفیان کی دلجوئی کی خاطر اس کی سفارش پر معاویہ کو کاتبوں کی بزم میں بیٹھنے اٹھنے اور موقع بہ موقع ان کا ہاتھ بٹانے کی اجازت دے دی تھی اور یہ غیروں کے سرداروں سے آنحضرتؐ کی مراسلت کی کتابت کا فریضہ کبھی کبھی انجام دیا کرتے تھے۔ نیز اس کی تہ میں ابوسفیان کا یہ منصوبہ بھی کارفرما تھا کہ اسلامی حکومت کے خفیہ راز معلوم کئے جائیں تاکہ وقت آنے پر وہ رسول اللہؐ کے خلاف خفیہ راز کے ہتھیاروں کو استعمال کر سکے۔

اس کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "سیرت النبیؐ" میں دربار رسالت کے کاتبوں کی جو فہرست پیش کی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۰۰

"قریش میں سب سے پہلے کاتب وحی عبداللہ ابن ابی سرح[1] تھے۔ مدینہ میں اس کی اولیت کا شرف ابی ابن کعب کو حاصل ہوا پھر حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علیؑ، عامر بن فہیرہ، عمرو بن عاص، عبداللہ بن ارقم، ثابت بن قیس، حنظلہ ابن ربیعہ، مغیرہ بن شعبہ، عبداللہ بن رواحہ خالد بن ولید، خالد بن سعید، علا ابن حضرمی، حذیفہ بن یمانی، معاویہ ابن ابوسفیان اور زید بن ثابت مختلف اوقات میں اس منصب پر مامور ہوتے رہے۔ اگرچہ ان تمام بزرگوں کو کبھی کبھی یہ خدمت انجام دینی پڑتی تھی۔ چنانچہ صلح نامہ حدیبیہ حضرت علیؑ نے خود اپنے ہاتھ سے لکھا تھا،

"امراء و سلاطین کے نام عامر بن فہیرہ لکھتے تھے، امرائے عمان کے نام آپ نے جو مکتوب بھیجا تھا اسے ابی ابن کعب نے لکھا تھا اور قطن بن حارثہ کو جو خط بارگاہ نبوت سے بھیجا گیا تھا اسے ثابت بن قیس نے لکھا تھا لیکن عام طور پر کتابت وحی کا سارا کام زید بن ثابت کے سپرد تھا اسی لیے گروہ صحابہ میں ان کا نام اسی حیثیت سے نمایاں ہے[2]"

اگر علامہ شبلی نعمانی کی اس غلط فہرست کو تھوڑی دیر کے لیے ہم درست مان لیں تو انیس کاتبوں کے درمیان اٹھارہویں نمبر پر معاویہ کا نام بھی چپکا ہوا نظر آتا ہے لیکن ان کے بارے میں علامہ موصوف خود بھی یہ تحقیق نہیں کر سکے کہ انہوں نے کب؟ کس موقع پر؟ اور کس قسم کی کتابت کا فریضہ انجام دیا ہے، جبکہ دوسر کاتبوں کی خدمات کی صراحت ان کے ناموں کے ساتھ اسی مذکورہ فہرست میں موجود ہے۔ اگر اس قسم کی کوئی فضیلت معاویہ کی ذات سے وابستہ ہوگئی ہوتی تو علامہ شبلی

---

[1] یہ عبداللہ ابن ابی سرح وہی ہے جو مرتد ہوگیا تھا [2] سیرت النبی حصہ دوم

کی معاویہ نوازی اسے کسی قیمت پر نظر انداز نہ ہونے دیتی اور اسی سے جھوٹ اور سچ کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے مگر افسوس کہ ابوسفیان خباثت کے امین و علمبردار جوش عقیدت میں معاویہ کو کاتب وحی کے عہدے پر اس طرح مامور کرتے ہیں کہ جیسے بزم رسالت میں ان کے علاوہ کوئی دوسرا پڑھا لکھا انسان تھا ہی نہیں۔

عقیدتمندان معاویہ انھیں صرف اس لیے فضیلت دینا چاہتے ہیں کہ ان کا دامن اسلامی فضیلتوں سے بالکل ہی خالی ہے اور شاید اسی سبب سے محمد اسمٰعیل بخاری نے اپنی "صحیح" میں معاویہ سے متعلق کوئی خصوصی باب قائم نہیں کیا۔

مولوی عبدالوحید خاں نے اپنی کتاب سرگزشت معاویہ میں واضح طور پر لکھا ہے

"معاویہ ایسے بدکردار، خائن، مکار، فریبی، بے غیرت، ظالم، بدعتی، قاتل مجہول النسب اور جھوٹے انسان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کاتب وحی تھے، قرآن پر ظلم کے مترادف ہے، دراصل سفید جھوٹ پر مبنی یہ روایت معاویہ پرست لوگوں کی اختراع ہے[1]"

معاویہ اور صحابیت

اس امر میں کوئی شک شبہ نہیں کہ معاویہ تخریب کاروں کے قائد اعظم تھے لہذا ان کی تخریب کارانہ شخصیت اور مکارانہ صحابیت پر تبصرہ ایک مستقل کتاب کا متقاضی ہے۔

سیر کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد صحابہ سے اجتہادی غلطیاں ہوئی ہیں، لیکن ان کی اور معاویہ کی غلطیوں میں فرق یہ ہے کہ معاویہ کی نیت خراب تھی،

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۵۱

اس لیے ان کی غلطیوں کو اجتہادی غلطیوں سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔

اگر معاویہ کے نامۂ اعمال میں دو چار غلطیاں ہوتیں تو انھیں توجیہات کے پردے میں چھپایا جا سکتا تھا اور صحابیت کا بھرم رکھنے کے لیے یہ کہا جا سکتا تھا کہ الحاق یا دشمنی کی بنا پر بعض روائتیں تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں داخل کر دی گئی ہیں لیکن ان کے خلاف اتنی طویل فرد جرم اور اتنی شہادتیں ہیں کہ جن کے مقابلے میں نہ تو کوئی دفاعی صورت ممکن ہے اور نہ ہی کوئی صفائی پیش کی جا سکتی ہے۔

جو لوگ صحابیت کے غلط تصور میں مبتلا ہیں انہوں نے معاویہ کی حمایت اور صفائی میں صفحات کے صفحات سیاہ کئے ہیں لیکن اس کے باوجود کامیاب نہیں ہوئے اور اس ناکامی کی اصل وجہ یہ ہے کہ معاویہ کے دامن سے اتنی غلاظت لپٹی ہوئی ہے کہ جسے دھونے کے لیے سمندروں کا پانی بھی ناکافی ہے۔

معاویہ کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے وقت وہ لوگ مشکلوں کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں جو صحابیت کے احترام میں معینہ حدود سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں کیوں کہ اس کے دور میں جو صحابہ موجود تھے ان کی اکثریت نے معاویہ کی مذمت کی ہے اور اسے ملعون ابن ملعون قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ جنگ صفین میں صحابہ کی ایک بہت بڑی جماعت نے معاویہ کا ساتھ محض اس لیے نہیں دیا کہ ان کی نظر میں معاویہ باطل پر تھا اور حضرت علیؑ حق پر تھے۔

اس دور کے صحابہ میں اگر انصاری صحابہ کے رویہ پر ایک محققانہ نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ صحابیت کی دنیا میں معاویہ کے خلاف ایک عام لہر تھی جس کی لپیٹ میں چند صحابہ اور بھی تھے چنانچہ حضرت علیؑ کے خلاف لڑی جانے والی جنگوں میں صرف ایک یا دو انصاری صحابہ معاویہ کے ساتھ تھے اور وہ بھی حق و باطل کے معیار پر نہیں تھے بلکہ دوسرے محرکات ان کی شرکت کا باعث تھے۔

انصار کو رسول سے، اور رسول اللہ کو انصار سے جو لگاؤ تھا اس کا اندازہ ابن تیمیہ کی کتاب "زاد المعاد" سے ہوتا ہے اس نے لکھا ہے کہ جنگ صفین کے بعد جب رسول اللہؐ نے تالیف قلوب کو مدنظر رکھتے ہوئے ابوسفیان کو چالیس اوقیہ اور سو اونٹ دئے تو اس نے کہا، یا رسول اللہ! اور میرے بیٹے یزید کو؟ آپ نے حکم دیا کہ چالیس اوقیہ اور سو اونٹ اسے بھی دے دئے جائیں۔ پھر ابوسفیان نے کہا، اور میرے بیٹے معاویہ کو؟ اس پر رسول اللہ نے حضرت علیؑ کی طرف مسکرا کر دیکھا اور فرمایا، اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دو چنانچہ چالیس اوقیہ اور سو اونٹ معاویہ کے حصے کے بھی ابوسفیان کو مل گئے۔

ان نومسلموں کے ساتھ اس فیاضانہ برتاؤ اور حسن سلوک کے بعد سعد بن عبادہ نے سرکار رسالت کو مطلع کیا کہ یا رسول اللہؐ! انصار کو آپ سے یہ شکوہ ہے کہ آپ نے نومسلموں کو مال غنیمت زیادہ دیا ہے اور انھیں محروم رکھا ہے جبکہ ہر قدم پر وہ لوگ اپنی جاں نثاری کا ثبوت دیتے رہے۔

اس شکایت پر پیغمبر اکرمؐ نے انصار کو جمع کر کے جو تقریر فرمائی اور اس کے جواب میں انھوں نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ اسلامی تاریخ کے افق پر ایک آفتاب کی طرح درخشاں ہے۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اے گروہ انصار! کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں ہے کہ یہ لوگ مال و دولت لے جائیں اور تم لوگ اپنے ساتھ اللہ کے رسول کو لے جاؤ۔ خدا کی قسم، اگر میں مہاجر نہ ہوتا تو یقیناً تم میں سے ہوتا۔ دنیا چاہے جس راستے پر چلے لیکن میں قیامت تک تمہارے ساتھ ہوں۔ اللہ تم لوگوں پر اور تمھاری اولادوں پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کرے"

چند جملوں پر مشتمل اس خلاصہ کی مفصل تقریر ایسی جامع اور روح پرور ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد انسان کے دل کی گہرائیوں میں محبت و عقیدت کی لہریں اٹھنے

لگتی ہیں۔ ابن قیم کا بیان ہے کہ اس تقریر کے بعد انصار جذبات سے مغلوب ہوکر رونے لگے تھے چنانچہ انہوں نے سارا مال ابوسفیان اور اس کے خاندان والوں کے لیے چھوڑ دیا اور رسول اللہؐ کو لے لیا"۔

محمد اسماعیل بخاری نے اپنی "صحیح" میں "حب الانصار من الایمان" اور قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انتم احب الناس الیّ" کے عنوان سے دو باب قائم کیے ہیں جن کی حدیثوں سے پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ کو انصار کے ساتھ اور انصار کو رسول اللہ کے ساتھ کتنا لگاؤ تھا لیکن یہ بات واضح رہے کہ ان حدیثوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انصار میں ہر شخص پر ان کا اطلاق ہوتا ہے مجموعی حیثیت سے صرف وہی لوگ ان حدیثوں کے مصداق قرار پائیں گے جنھوں نے اپنی زندگیوں کو اسلامی اصولوں کے سانچوں میں ڈھال دیا تھا لہٰذا جب ہم کسی صحابہ کے کیریکٹر یا اس کے کسی خاص طرز عمل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہیں گے تو محض یہ کہہ کر معاملے کو ختم نہیں کر دیں گے کہ وہ شخص صحابی ہے اس لیے قابل احترام ہے بلکہ اعمال کی روشنی میں اس کی زندگی کا جائزہ بھی لیں گے اور اس سلسلے میں معاویہ کی صحابیت کا معاملہ اتنا خراب ہے کہ وہ انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں سے قابل لعنت ہیں — کیونکہ انکی صحابیت کا مقصد صرف اسلامی اقتدار پر قبضہ کرنا تھا"۔

معاویہ اور شراب

امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن بریدہ نے کہا،

"ایک دن میں اپنے والد کے ساتھ معاویہ کے شاہی دسترخوان پر مدعو تھا کھانے سے پہلے شراب لائی گئی جسے معاویہ نے پی اور اس نے ایک جام میرے والد کی طرف بڑھایا، میرے والد نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب سے رسول اللہؐ نے

شراب کو حرام قرار دیا ہے میں اس سے کوسوں دور رہتا ہوں یہ سن کر معاویہ نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور کہا، اے احمق! رسولؐ کا حکم حرمت تجھے مبارک میری نظر میں تو شراب سے زیادہ محبوب اور سرور بخش دنیا کی کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ یہ انسان کو جیتے جی جنت کی سیر کرا دیتی ہے[1]۔

اس روایت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معاویہ کی نظر میں حرام و حلال اور جنت و دوزخ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

معاویہ اور بسیار خوری

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ معاویہ دنیا کا سب سے بڑا بسیار خور انسان تھا۔ دن میں پانچ مرتبہ کھانا کھاتا تھا ایک بھنا ہوا بچھڑا، ایک تنوری بھیڑ، نصف درجن اونٹوں کے گردے، دو درجن تلی ہوئی چھپکلیاں، دس کلو میدے کی روٹیاں اور سو رطل یا قلانی رطب ہضم کر جانا اسکا روز کا معمول تھا کھاتے کھاتے جب پریشان ہو جاتا تھا تو اپنے غلام سے کہتا تھا کہ اب دسترخوان اٹھا لے، منہ چلاتے چلاتے تھک گیا ہوں مگر پیٹ ہے کہ کمبخت بھرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ خطبہ قابل توجہ ہے آپ فرماتے ہیں:۔

"میرے بعد جلد ہی تم پر ایک ایسا شخص مسلط ہوگا جس کا حلق کشادہ اور پیٹ بڑا ہوگا، یہاں تک کہ وہ جو پائیگا وہ نگل جائیگا اور جو نہ پائیگا اسکی جستجو رکھیگا تم جب اسے دیکھنا تو قتل کر دینا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اسے نہیں مار سکو گے بلکہ وہ شخص اس بات کا حکم دے گا کہ تم مجھے برا بھلا کہو اور مجھ سے بیزاری کا اظہار کرو[2]"۔

---

[1] سرگزشت معاویہ ۶۶ بحوالہ مسند امام احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۴۷ [2] نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵۷

اس خطبہ کے ذیل میں بعض نے زیاد بن ابیہ، بعض نے حجاج بن یوسف اور بعض نے مغیرہ بن شعبہ کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اکثر شارحین اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے مراد معاویہ ابن ابوسفیان ہے کیونکہ جو اوصاف امیر المومنینؑ نے بیان فرمائے ہیں وہ معاویہ ہی پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔

علامہ ابن ابی الحدید کا بیان ہے کہ ایک دن پیغمبر اسلامؐ نے معاویہ کو طلب فرمایا تو آپ کو بتایا گیا کہ وہ کھانا کھا رہا ہے تھوڑی دیر بعد آپنے دوبارہ طلب کیا تو پھر یہی جواب، تیسری بار کی طلبی پر جب آپ کو پھر یہی جواب ملا تو آپنے فرمایا پروردگار، اس معاویہ کا پیٹ کبھی نہ بھرے چنانچہ اس پیغمبری بد دعا کے نتیجے میں معاویہ بسیار خوری کے مرض میں مبتلا ہوا اور اس میں اتنی شدت پیدا ہوئی کہ جب وہ کھاتے کھاتے تھک جاتا تھا تو چیخنے چلانے لگتا تھا۔ اور اپنے غلام سے کہتا تھا کہ اب میرے سامنے سے کھانا ہٹا لے ورنہ کھاتے کھاتے مر جاؤں گا۔

علامہ ابن ابی الحدید نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے خطبے میں معاویہ کے قتل کا حکم اس لیے دیا کہ اس کے بارے میں رسول اللہؐ بھی فرما چکے تھے کہ "اذا رایتم علیٰ منبری فاقتلوہ" اے مسلمانوں! تم جب معاویہ کو میرے منبر پر دیکھنا تو اسے قتل کر دینا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ معاویہ رسول اکرمؐ کی نگاہ میں بھی واجب القتل تھا۔

معاویہ اور تخت اقتدار

پیغمبر اسلامؐ کی کرم نوازیوں نے فتح مکہ کے موقع پر ابوسفیان اور اس کے خاندان کو ضلالت، پستی، بت پرستی اور گمراہی کی دلدل سے نکال کر اسلام کی صفوں میں لاکر کھڑا کر دیا تھا لیکن اس خاندان کے احسان فراموش لوگوں کا عالم یہ رہا کہ

انہوں نے خانوادۂ رسالت کے خلاف اپنی سابقہ سرگرمیوں اور اسلامی شریعت کے خلاف اپنی مخالفانہ و منافقانہ روش سے کبھی انحراف نہیں کیا یہاں تک کہ ۱۱ سنہ ہجری میں حضور سرور کائنات دنیا سے رخصت ہو گئے اور حضرت عمر کی مدد سے حضرت ابوبکر تخت خلافت پر قابض ہو گئے۔

اس کے بعد اسلام کے نام پر جب ملک گیری، توسیع حکومت، فتوحات، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہوا تو حضرت ابوبکر کی مصلحت بینی نے ابوسفیان کی فتنہ انگیزیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کے ایک بیٹے یزید کو لشکر کا امیر بنا کر اور دوسرے بیٹے معاویہ کو اس کا مشیر بنا کر شام کی جنگی مہم پر روانہ کیا یہ پہلا موقع تھا جب ابوسفیان کے دو بیٹوں کو فوج کے اعلیٰ عہدوں پر مامور کیا گیا تھا اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تخت اقتدار تک معاویہ کی رسائی کا راستہ حضرت ابوبکر نے ہموار کیا۔

حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد جب حضرت عمر کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے معاویہ کو صوبۂ دمشق کا گورنر بنا دیا کیوں کہ اس کا بھائی یزید طاعون کی بیماری کا شکار ہو کر مر چکا تھا۔

حضرت عمر نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک معاویہ کو اسی عہدے پر برقرار رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام اور اس کے اطراف میں اس کی پوزیشن مضبوط اور مستحکم ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اس نے مکمل طور پر شاہی سیرت، شہنشاہی نخوت اور بادشاہی شان و شوکت اختیار کر لی اور اس کا دربار قیصر و کسریٰ کے دربار کا جیتا جاگتا نمونہ بن گیا۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام جانتے تھے کہ معاویہ، ابوسفیانی سرشت و طینت کا پیکر ہے لہٰذا آپ خاموشی سے اس کے طرز عمل کا مشاہدہ فرما رہے تھے نیز مستقبل میں رونما ہونے والے حالات و خطرات کو بھی امامت کی نگاہوں سے

دیکھ رہے تھے چنانچہ ایک دن آپ نے اپنی گفتگو کے درمیان حضرت عمر کو معاویہ کی اس غیر اسلامی روش کے خلاف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا :-

"معاویہ اسلامی تعلیمات و افکار اور خدائی مشن کے کسی پہلو کا عملی نمونہ پیش نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے باپ ابوسفیان کی جہالت کی مکمل تصویر ہے وہ اسلام کے وجود کو ختم کر کے اسلامی معاشرے کو ایک ایسے سماج میں تبدیل کرنا چاہتا ہے جسے اسلام اور قرآن پر کوئی یقین نہ ہو اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ خلافت، قیصر و کسریٰ کی صورت میں ڈھل جائے آپ کو اس کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیے"[1]

حضرت عمر نے حضرت علیؑ کی ان حکیمانہ باتوں کو پہلے تو ہوا میں اڑانے کی کوشش کی لیکن پانی جب سر سے اونچا ہونے لگا اور دیگر صحابۂ کرام نے بھی واویلا مچایا تو حضرت عمر نے مجبور ہوکر شام کے اچانک دورے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ جب وہ دمشق پہنچے تو معاویہ نے بڑی آزادی، فراخدلی شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور تاجدارانہ چمک دمک کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا جسے دیکھ کر حضرت عمر حیران و ششدر رہ گئے اور ان کی زبان سے غیر ارادی طور پر یہ جملہ نکلا "ھٰذا کسریٰ العرب" یہ تو عرب کا کسریٰ ہے"[2]

اس کے بعد حضرت عمر نے معاویہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا میں نے سنا ہے کہ تم گھر کے اندر برہنہ حالت میں پڑے رہتے ہو اور حاجت مند تمہارے دروازے پر تمہاری جان کو رو دیا کرتے ہیں"[3]

معاویہ نے جواب دیا ـــ یہ خبر ضرور میرے کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ہے جو اڑتے اڑتے آپ تک پہنچی ہے ورنہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۲۷، [2] استیعاب ج ۱ ص ۲۵۳ و البدایہ ج ۸ ص ۱۲۵ [3] سرگزشت معاویہ ص ۳۷

حضرت عمر - اچھا اگر یہ بات ہے تو یہ بتاؤ کہ تم نے یہ قیصر و کسریٰ کے طریقے کیوں اپنا رکھے ہیں؟

معاویہ - اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر یہاں کے لوگ مرعوب ہوں اور آپ کے خلاف بغاوت کی ہمت نہ کر سکیں کیونکہ شام میں آپ کے دشمنوں اور جاسوسوں کی تعداد بہت زیادہ ہے[1]

حضرت عمر - اگر یہ بات ہے تو میں تمھیں اس روش پر چلنے کی نہ اجازت دیتا ہوں اور نہ منع کرتا ہوں جیسا تم مناسب سمجھو ویسا طرز عمل اختیار کرو[2]

تاریخیں تو حضرت عمر کی توصیف میں یہ کہتی ہیں کہ وہ ایک درشت مزاج اور تند خو انسان تھے ذرا ذرا سی بات پر اپنے عمّال کو معزول کر دیا کرتے تھے، اسلامی قوانین کی خلاف ورزی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی اور کسی قسم کی لغزش کو وہ گوارا نہیں کرتے تھے۔

اگر یہ تمام باتیں درست ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے معاویہ کی اس اسلام مخالف روش، شاہی سیرت اور انداز ملوکیت کو برداشت کیوں کیا؟ نہ کوئی باز پرس کی، نہ سرزنش کی، اور نہ ہی انھوں نے اسے معزول کیا جبکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ معاویہ ایک طلیق اور مکار شخص ہے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام کا رعب و دبدبہ شاہی شان و شوکت اور حشم و خدم میں نہیں ہے بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری میں ہے جس سے دشمن متاثر ہو سکتا ہے لیکن معاویہ کے معاملہ میں حضرت عمر کی خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ معاویہ ان کے مقابلے میں شہ زور تھا اور یہ خود معاویہ کے مقابلے میں کمزور تھے۔

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۴۷، [2] طبری واقعات سنہ ۴۱ھ تا سنہ ۲۶ھ۔

اس کے علاوہ معاویہ کے مقابلے میں حضرت عمر کی بے بسی اور مجبوری کا اندازہ اس واقعہ کے بعد مسلمانوں سے اکثر و بیشتر کہا کرتے تھے کہ تم لوگ قیصر و کسریٰ کی عیاریوں اور مکاریوں کے افسانے تو بڑے زور و شور سے بیان کرتے ہو لیکن یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ تمہارے یہاں بھی معاویہ ایسا شخص موجود ہے[1]"

حضرت عمر کی اس بے بسی اور خاموشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خود ان کی خلافت حکم خدا اور سنت رسولؐ کے مطابق نہیں تھی بلکہ وہ غاصبانہ راستے سے ان تک پہنچی تھی۔ دوسرے یہ کہ حکم خدا اور سنت رسولؐ کے معاملے میں ان کی طبیعت ان کی تلون مزاجی اور مصلحت پروری کا بھی بہت کچھ دخل رہتا تھا۔ اسلام کا مزاج یہ نہیں تھا کہ اگر کسی کمزور سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے دُرّوں سے لہولہان کر دیا جائے اور شہ زور ہو تو اسے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اسلام کا مزاج یہ تھا کہ ایک شہ زور انسان کا جرم بھی اسی سزا کا مستحق ہے جو ایک کمزور انسان کے جرم پر دی جا سکتی ہے۔

درحقیقت معاویہ سے حضرت عمر کے خائف ہونے کی وجہ یہ تھی کہ معاویہ کا خاندانی تعلق اس قبیلے سے تھا جو عرب میں انتہائی سرکش اور طاقتور قبیلہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے مقابلے میں حضرت عمر کا خاندان بہت ہی پست اور حقیر تھا اور یہی ایک نفسیاتی پہلو تھا جس کی وجہ سے حضرت عمر معاویہ سے مخالفت مول لیتے ہوئے گھبراتے تھے کیونکہ انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ بنی امیہ کے افراد کا اسلام محض ظاہری اور نمائشی اسلام ہے اگر ان کے مفاد یا اقتدار پر کسی قسم کی آنچ آئی تو یہ لوگ میرے ہی خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے یہ تو

---

[1] ابن اثیر ج ۳ ص ۲۱۶

صرف حضرت علی علیہ السلام کا ہی کلیجا تھا کہ تخت خلافت پر قدم رکھتے ہی انھوں نے عوامی حقوق کے غاصبوں اور نام نہاد مسلمانوں کو گورنری کے عہدوں سے معزول کر دیا تھا۔

غرض کہ حضرت عمر کی خاموشی اور مجبوری ابوسفیان کے بیٹے کو تیزی اور سرعت سے اپنی امارت کو مستحکم کرنے اور ملوکیت کو ترقی دینے کے مواقع فراہم کرتی رہی اور ہندہ جگر خوارہ کے خوابوں کی تعبیریں اجاگر ہوتی رہیں یہاں تک کہ اس کا سنہ ۲۰ ہجری والا جوبن پھر پلٹ آیا اور مسلسل اسلامی ضربوں سے کند ہو جانے والے ابوسفیان کے سازشی دماغ میں تازگی اور شگفتگی پھر پیدا ہو گئی۔

بہرحال ـــ اسلامی قوانین اور شرعی احکامات سے بے نیاز ہو کر معاویہ ہر وہ عمل انجام دیتا رہا جس کے نتیجے میں اسلام پارہ پارہ ہو جائے۔ حضرت عمر کی زندگی میں یہ ماحول کش ماحول چلتا رہا یہاں تک کہ سنہ ۲۳ھ آگئی اور حضرت عمر دنیا سے چل بسے اس کے بعد خود ان کی بنائی ہوئی شوریٰ کمیٹی نے اسلامی اقتدار کو بنی امیہ کے پہلے فرمانروا حضرت عثمان کے حوالے کر دیا۔

حضرت عمر کے زمانہ اقتدار میں معاویہ صرف دمشق کا گورنر تھا لیکن حضرت عثمان کی اقربا پروری نے حمص، فلسطین، اردن اور لبنان کے علاقے بھی اسے سونپ دئے اور اپنے چچازاد بھائی مروان بن حکم کو اپنا سکریٹری بنا لیا جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے دروبست پر اس کا اثر و نفوذ قائم ہو گیا اس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہو گئے۔

خود مختاری کا زمانہ

سنہ ۲۳ھ سے سنہ ۳۵ھ تک کا زمانہ معاویہ کی خود مختاری کا زمانہ تھا۔ اس مدت

معاویہ نے عربی مزاج، عیسائی فطرت اور یہودی طینت کو یکجا کر کے ایک نئی شریعت کو جنم دیا اور ایسے حالات پیدا کر دئے کہ اسلام مسلمانوں ہی کی بستی میں اجنبی بن کر رہ گیا اور اس کی حیثیت ایک قیدی کی سی ہو گئی۔

اسلامی تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں اسلام کو بے دست و پا کر کے ایک ایسا نظام قائم کیا گیا جس کا نام جاگیرداریت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جاگیرداریت نے ملت اسلامیہ کے جسم میں خود غرضی کا زہر بھر دیا اور اسلامی سماج کو کھوکھلا کر کے مسلمانوں میں ذاتی دبے جاتفاخر کے جذبات پیدا کر دئے۔ مستزاد یہ کہ اسلامی بیت المال کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے فضول خرچیوں، ناجائز امور کے حصول اور غیر اسلامی و غیر شرعی باتوں کے ارتکاب میں اندھادھند استعمال کیا گیا چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ حضرت عثمان کے برسر اقتدار آتے ہی بنی امیہ کی بن آئی اور انھوں نے بیت المال کو لوٹنا شروع کر دیا، جس طرح جانور ہرا بھرا سبزہ دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور پامال کر کے چھوڑتے ہیں بالکل اسی طرح بنی امیہ اللہ کے مال پر ٹوٹ پڑے اور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔"

اس دور میں جو بدعنوانیاں ہوئیں ان پر کسی مسلمان کا دل دکھے بغیر نہیں رہ سکتا جلیل القدر صحابہ گوشوں میں پڑے تھے افلاس انھیں گھیرے ہوئے تھا غربت ان کا مقدر بن گئی تھی اور بیت المال پر تصرف و تسلط تھا تو بنی امیہ کا، کلیدی عہدوں پر چھائے ہوئے تھے تو بنی امیہ کے نوخیز و ناتجربہ کار لونڈے، مسلمانوں کی مخصوص ملکیتوں پر قبضہ تھا تو بنی امیہ کا، چراگاہوں میں چوپائے چرتے تھے تو بنی امیہ کے محلات تعمیر ہوئے تھے تو بنی امیہ کے، باغات لگتے تھے تو بنی امیہ کے۔ اور اگر کوئی دردمند صحابی ان بے اعتدالیوں پر اپنی زبان کھولتا تھا تو اس کی پسلیاں توڑ دی جاتی تھیں، کوئی سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کرتا تھا تو اسے شہر بدر کر دیا جاتا تھا

زکواۃ و صدقات جو فقراء و مساکین کا حق تھا بیت المال جو مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ تھا اس کا مصرف کیا قرار دیا گیا تھا؟ ذیل کے چند نمونوں سے ظاہر ہے"؛

(۱) حکم بن عاص اور اس کے بیٹے مروان کو پیغمبر اسلامؐ نے ملعون قرار دے کر مدینہ سے نکال دیا تھا لیکن حضرت عثمان نے سنت رسولؐ اور سیرت شیخین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، نہ صرف انھیں مدینہ واپس بلوالیا بلکہ بیت المال سے ان دونوں باپ بیٹوں کو ایک لاکھ درہم بھی عطا کئے۔ (معارف ابن قتیبہ ص ۹۴)

(۲) ولید بن عقبہ کو، جسے قرآن نے فاسق قرار دیا ہے، حضرت عثمان نے مسلمانوں کے مال میں سے ایک لاکھ درہم دئے۔ (عقد الفرید ج ۳ ص ۹۴)

(۳) مروان بن حکم کو حضرت عثمان نے جب دامادی کا شرف بخشا تو بیت المال سے اسے ایک لاکھ درہم دئے۔ (شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۹)

(۴) حضرت عثمان نے حارث بن حکم سے جب اپنی بیٹی عائشہ کا نکاح کیا تو اسے بھی بیت المال سے ایک لاکھ درہم دئے (شرح ابن ابی الحدید ج ۱ ص ۳۹)

(۵) معاویہ کے باپ ابوسفیان کو دو لاکھ درہم دئے (شرح ابن ابی الحدید ج ۹۴۳)

(۶) عبداللہ ابن خالد کو چار لاکھ درہم دئے۔ (معارف ابن قتیبہ ص ۹۴)

(۷) ۵ لاکھ دینار پر مشتمل افریقہ کا خمس مروان بن حکم کو دے دیا (معارف ابن قتیبہ ص ۹۴)

(۸) جاگیر فدک جسے ابوبکر نے پیغمبرؐ کی بیٹی سے چھینا تھا، عثمان نے اپنے داماد کو دے دیا۔ (معارف ابن قتیبہ ص ۹۴)

(۹) مدینہ کے بازار میں بہزور ایک جگہ تھی جسے رسول اللہؐ نے مسلمانوں کے لیے وقف عام قرار دیا تھا حضرت عثمان نے حارث بن حکم کے حوالے کر دیا"؛

(۱۰) قتل عثمان کے بعد، ایک لاکھ پچاس ہزار دینار اور دس لاکھ درہم خود ان کے گھر سے برآمد ہوئے (مروج الذہب ج ۱ ص ۴۳۵)

زمانہ شناس معاویہ نے جب خلیفہ کی مطلق العنانی اور اسلام مخالف روش کا یہ حال دیکھا تو اس نے بھی اپنی قیصریت اور کیسرویت کو آگے بڑھانا شروع کر دیا دوسری طرف صحابیٔ رسولؐ حضرت ابوذر غفاری نے جب عثمان کی اقرباء پروری اعزہ نوازی اور سونے چاندی کی جمع بندی کا جائزہ لیا تو بھرے دربار میں کھڑے ہو گئے۔ نہ دربار کی آن بان پر نظر ڈالی، نہ خلیفہ کی شان کو دیکھا، نہ درباریوں سے دھونس کھائی، نہ خوشامدیوں سے ڈر محسوس کیا بلکہ خوف خدا کی بنیاد پر قرآن مجید کی اس آیت کو سرنامۂ کلام قرار دیا جس میں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو"۔

اس کے بعد جناب ابوذر غفاری نے خلیفہ وقت پر سخت تنقید کی۔ اس سرمایہ شکن روش کے بارے میں سید قطب شہید کا بیان ہے کہ حضرت ابوذر غفاری نے اپنی تقریر میں عیش پرستوں کی عیش پرستی کو چیلنج کیا تھا جو اسلام کے لیے ناقابل تسلیم تھی۔

بہرحال، حضرت عثمان کا دور، وہ دور تھا جس میں دولت مندوں کی دولت اور عیش پرستوں کی عیش پرستی میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا اور آخر کار وہ وقت بھی آیا جب خلیفۂ وقت نے معاویہ کو وہ علاقے بھی بطور جاگیر عطا کر دئے جو حضرت ابوبکر و عمر کے زمانے میں مسلمانوں کی ملکیت کے طور پر بیت المال کے لیے وقف تھے [۱]"

جب حضرت عثمان نے معاویہ کو خود ہی جاگیردار قرار دے دیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاویہ نے بھی اپنے علاقوں میں مختلف جاگیردار بنائے جن کی وجہ سے

---

[۱] تاریخ مقریزی ج ۱ ص ۹۱

اس کی ملوکیت میں اور بھی استحکام پیدا ہونے لگا۔

ہم تحریر کر چکے ہیں کہ حضرت عمر کے زمانے میں معاویہ صرف صوبۂ دمشق کا گورنر تھا مگر حضرت عثمان کے دور میں وہ شام، حمص، اردن، فلسطین اور اسرائیل وغیرہ کا بھی مالک و مختار بن گیا تھا"؛

چنانچہ اس نے ان تمام علاقوں میں اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے لیے جاگیرداریت اور ملوکیت کے نظام کو عام کیا جس کی وجہ سے اس کا اقتدار اتنا قوی ہو گیا کہ خود خلیفۂ وقت کا اقتدار بھی اتنا مستحکم نہیں رہ گیا تھا جیسا کہ پاکستانی سنی عالم مولانا مودودی نے اپنی کتاب خلافت و ملوکیت میں تحریر فرمایا ہے:۔

"حضرت عثمان نے ایلہ سے سرحد روم تک اور الجزائر سے ساحل بحر ابیض تک کا پورا علاقہ معاویہ کی ولایت میں جمع کر کے اپنے پورے زمانۂ خلافت (۱۲ سال) میں ان کو اسی صوبے میں برقرار رکھا اور اسی کا خمیازہ حضرت علیؑ کو بھی بھگتنا پڑا۔ شام کا صوبہ اس وقت اسلامی سلطنت میں بڑی جنگی اہمیت کا حامل تھا اس کے ایک طرف تمام مشرقی صوبے تھے اور دوسری طرف تمام مغربی صوبے بیچ میں وہ اس طرح حائل تھا کہ اس کا گورنر مرکز سے منحرف ہو جائے تو وہ مشرقی صوبوں کو مغربی صوبوں سے کاٹ سکتا تھا۔ معاویہ اس صوبہ کی حکومت پر اتنی طویل مدت تک رکھے گئے کہ انہوں نے یہاں اپنی جڑیں مضبوط کر لیں اور وہ مرکز کے قابو میں نہ رہے بلکہ مرکز ان کے رحم و کرم پر منحصر ہو گیا [۱]"

غرض کہ جاگیرداریت نے اسلام میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا جو صاحبان تقویٰ اور حاملان علم و عمل کو بھی میسر نہیں تھا ۱۴ سنہ ہجری سے ۲۲ سنہ ہجری تک درباریت

---

[۱] خلافت و ملوکیت ص ۱۰۶۔

کے جراثیم پلتے اور بڑھتے رہے سنہ ۲۳ ہجری تک درباریت کے ساتھ جاگیرداریت بھی پلتی، بڑھتی، اور جوان ہوتی رہی سنہ ۳۵ ہجری سے سنہ ۴۰ ہجری تک درباریت اور جاگیرداریت اپنے شباب پر پہنچ کر امامت سے ٹکرائی رہی سنہ ۴۰ ہجری میں اسی جاگیرداریت نے اپنا روپ بدل کر ملوکیت کی شکل اختیار کرلی اور معاویہ خلافت کا لباس اتار کر بادشاہ بن بیٹھا پھر اس کے بعد اس کی بادشاہت نے جبر و استبداد کا تاج پہن کر وہ سیاہ کارنامے انجام دئے جو دامن اسلام کے لیے بدنما داغ بن گئے۔

حضرت عثمان کا دور خلافت

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عمر کی وفات کے بعد خلافت کا مسئلہ مشروط حیثیت سے حضرت علی علیہ السلام کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور یہ شرط رکھی گئی کہ اگر آپ سیرت شیخین پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ کریں تو آپ کو خلیفہ بنا دیا جائے لیکن حضرت علیؑ نے یہ شرط ماننے سے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں صرف قرآن سیرت رسولؐ احکامات الٰہی اور اپنی صائب رائے کا تابع رہوں گا۔ سیرت شیخین پر ہرگز ہرگز عمل نہیں کروں گا۔ چنانچہ اس انکار کی بنا پر عبدالرحمٰن بن عوف کے ازاربندی رشتے نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنا دیا جنھیں حضرت عمر کی بنائی ہوئی شوریٰ کمیٹی میں ویٹو پاور استعمال کرنے کا حق حاصل تھا[۱]

اس کے بعد حضرت عثمان نے اپنے دور میں مطلق العنانی، اقرباء پروری، قرآن وسنت رسول اور سیرت شیخین کی خلاف ورزی کی جو مثال قائم کی اس کا جواب تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے انہوں نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم

۱؎ طبری ج ۵ ص ۳۷، شرح فقہ اکبر ص ۸۰ ۔

اور کلیدی عہدوں پر فائز کر کے ان کے ساتھ ایسے سلوک کو روا رکھا جو عام مسلمانوں کے درمیان ہدف ملامت بن کے رہ گیا مثلاً، انھوں نے سعد ابن ابی وقاص کو کوفہ کی گورنری سے معزول کر کے ان کی جگہ اپنے بھائی ولید بن عقبہ کو مقرر کیا اور پھر کچھ ہی دنوں کے بعد یہ منصب اپنے ایک دوسرے عزیز سعید بن عاص کے حوالے کر دیا۔ ابوموسیٰ اشعری کو بصرہ کی گورنری سے ہٹا کر ان کی جگہ اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کو مقرر کیا۔ عمرو بن عاص کو مصر کی گورنری سے معزول کر کے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا جو اسلام لانے کے بعد مرتد ہوگیا تھا اور اس کا شمار ان لوگوں میں تھا جن کے بارے میں فتح مکہ کے موقع پر پیغمبر اسلامؐ نے یہ حکم دیا تھا کہ اگر یہ لوگ خانہ کعبہ کے پردوں سے بھی لپٹے ہوں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔

حضرت عثمان کا یہ طرز عمل فطری طور پر مسلمانوں کے لیے ناپسندیدہ اور تشویش و تفکر کا سبب تھا کہ وہ لوگ جنھوں نے اسلام کو سربلند کرنے کے لیے اپنی جانیں لڑائی تھیں اور جن کی قربانیوں سے دین کو فروغ حاصل ہوا تھا، وہ تو پیچھے ہٹائے جائیں اور ان کی جگہ بدقماش لوگ امت کے سرخیل بن جائیں دوسرے یہ کہ اسلام اور اسلامی نظام کی سربراہی کے لیے یہ لوگ موزوں بھی نہیں تھے کیونکہ فتح مکہ کے موقع پر یہ ایمان تو ضرور لے آئے تھے مگر رسول کریمؐ کی صحبت اور تربیت سے فیض اٹھانے کا موقع انھیں نہیں ملا تھا جس سے کہ ان کے ذہن اور سیرت و کردار کی تطہیر ہو جاتی۔ لہٰذا اس اعتبار سے بھی یہ لوگ صحابہ و تابعین کی پچھلی صفوں میں شمار کئے جاتے تھے اس معاملے میں حضرت عثمان کے پرسنل سکریٹری مروان بن حکم کی پوزیشن کو دیکھئے اس کا باپ حکم بن ابوالعاص جو حضرت عثمان کا چچا تھا فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوا تھا اور مدینہ میں آکر مقیم ہوگیا تھا مگر اس کی بعض شیطانی حرکتوں کی وجہ سے پیغمبر اسلام نے اسے مدینہ سے طائف کی طرف جلاوطن کر دیا تھا

اس کی دیگر ذلیل ترین حرکتوں میں سے ایک حرکت تو یہ تھی کہ حضرت رسول خداؐ اپنے معتمد و معتبر صحابہ کے ساتھ اسلامی مشن کے لیے خلوت میں جو خفیہ مشورے فرماتے تھے انھیں معلوم کر کے یہ دشمنوں پر ظاہر کر دیا کرتا تھا۔ اور دوسری ذلیل حرکت یہ تھی کہ یہ پیغمبر اکرمؐ کی نقلیں اتار کر ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ سرکار دو عالمؐ نے اسے ایک مرتبہ اپنی نقل اتارتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا تھا[۱]۔

مروان اس وقت سات یا آٹھ برس کا تھا، چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ طائف میں رہ کر جلاوطنی کی زندگی بسر کرتا رہا یہاں تک کہ جب حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو بنی امیہ کے سرکشوں نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسے مدینہ واپس بلالیں مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور حضرت عمر نے بھی اپنے زمانۂ خلافت میں اسے مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی۔ لیکن حضرت عثمان نے اپنے دور میں یہ کہہ کر اسے طائف سے مدینہ واپس بلالیا کہ مجھ سے حضرت رسولِ خداؐ نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اسے معاف کر دیں گے لہٰذا ان کے وعدے کا بھرم رکھنے کے لیے میں اسے واپس بلاتا ہوں چنانچہ مروان اور حکم دونوں باپ بیٹے مدینہ میں پھر رہنے لگے[۲]

مروان کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس کا پرسنل سکریٹری یا وزیر اعظم کے عہدے پر مامور کیا جانا لوگوں کو کسی طرح بھی گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ حضرت عثمان مسلمانوں کو فریب کاری یا جھوٹی تسلی کے ذریعہ اس بات پر تو مطمئن کر سکتے تھے کہ چونکہ پیغمبر اکرمؐ نے حکم کو معاف کر دینے کا مجھ سے وعدہ کیا تھا اس لیے میں نے اسے طائف سے مدینہ بلالیا لیکن اس بات پر لوگ قطعاً تیار نہیں ہو سکتے تھے کہ جلیل القدر صحابۂ کرام

۱؎ استعیاب ص ۱۱۸ - ۱۱۹ ۔ ۲؎ اصابہ ج ۱ ص ۳۴۴ و ریاض النضرہ ج ۲ ص ۱۴۳

کی موجودگی میں حکم ایسے معتوب باپ کے بیٹے کو جس پر پیغمبرؐ نے بھی لعنت کی ہو، حکومت کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز کر دیا جائے۔ جبکہ حکم بھی اس وقت زندہ تھا اور وہ اپنے بیٹے کے ذریعہ حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا دوسرے یہ کہ ان میں سے بعض کا کردار ایسا تھا کہ ان جیسے لوگوں کو اس دور کے اسلامی معاشرے میں کلیدی عہدوں پر فائز کیا جانا مصلحت حکمرانی کے خلاف تھا۔ مثال کے طور پر ولید بن عقبہ کے معاملے کو دیکھئے۔ فتح مکہ کے موقع پر یہ بھی مسلمان ہوا تھا اور اسلام لانے کے بعد اسے سرکار دو عالمؐ نے تالیف قلوب کے خیال سے بنی مصطلق سے صدقات کی وصولی پر مامور کر دیا تھا، مگر یہ راستے ہی سے پلٹ آیا اور رسول اللہ کو یہ جھوٹی رپورٹ دی کہ بنی مصطلق نے زکوٰۃ دینے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ وہ لوگ میری جان لینے پر بھی آمادہ ہو گئے یہ سن کر حضورؐ اس حد تک غضبناک ہوئے کہ آپ نے بنی مصطلق کی سرکوبی کے لیے ایک فوجی دستہ روانہ کر دیا۔ یقیناً ایک سخت اور خونریز حادثہ پیش آجاتا مگر خیریت یہ گزری کہ بنی مصطلق کے سرداروں کو بروقت اس کا علم ہوگیا، چنانچہ وہ لوگ پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انھیں اس بات کا یقین دلایا کہ ولید بن عقبہ تو ہمارے پاس پہنچا ہی نہیں، ہم لوگ تو منتظر تھے کہ آپ کا کوئی نمایندہ آئے اور ہم سے زکوٰۃ وصول کرے۔ یہ واقعہ ایسا تھا کہ قرآن کو بھی کہنا پڑا:-

"اے ایمان والو! اگر کوئی بدکردار شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تصدیق کرایا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنی غلط فہمی کی بنا پر کسی قوم کو نقصان پہنچا دو اور پھر بعد میں پچھتاتے رہو"۔ (حجرات۔ ٦)

اسی ولید بن عقبہ کو حضرت عمر نے اپنے زمانہ میں قبیلۂ بنی تغلب پر حاکم بنایا تھا مگر سنہ ۲۵ ہجری میں حضرت عثمان نے اسے اس چھوٹی سی جگہ سے

اٹھاکر کوفہ ایسے بڑے اور اہم صوبے کا گورنر بنادیا وہاں یہ راز فاش ہوا کہ یہ شراب پینے کا عادی ہے۔ چنانچہ ایک دن اس نے بدمستی اور نشے کی حالت میں صبح کی نماز دو رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھادی اور پھر پلٹ کر لوگوں سے پوچھا کہ اگر کہو تو اور پڑھا دوں۔[1]

اس کی اس حرکت پر مسلمانوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ شکایت مرکز (مدینہ) تک پہنچائی گئی اور مور بن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن اسود نے حضرت عثمان کے بھانجے سے کہا کہ تم اپنے ماموں کے پاس جاکر انھیں مطلع کرو کہ تمھارے بھائی ولید بن عقبہ نے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کی وجہ سے عام مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ رہی ہے غرض کہ بھانجے نے ماموں کو ولید کے اس کارنامے کی تفصیل بتائی اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے میں جلد ہی کوئی مناسب قدم اٹھائیں گے لیکن بعد میں حضرت عثمان نے اس وعدہ کو اپنی اقربا پروری کے گہرے سمندر میں غرق کردیا۔ پھر کچھ دنوں بعد جب مسلمانوں کے احتجاج کا پانی سر سے اونچا ہونے لگا اور تمام مسلمان بپھر گئے تو انہوں نے مجبور ہوکر صحابہ کی ایک جماعت کے سامنے ولید پر مقدمہ چلایا، جس میں خود حضرت عثمان کے آزاد کردہ ایک غلام نے یہ بیان دیا کہ ولید نے شراب پی تھی۔ اس واقعہ کے دوسرے چشم دید گواہ جثامہ بن صعب تھے جنہوں نے بتایا کہ ان کے سامنے ولید نے مسجد میں شراب کی قے کی تھی۔ ان دونوں گواہوں کے علاوہ چار اور گواہوں، ابوزینب، ابومورع، جندب بن زہیر اور سعد بن مالک نے بھی ولید کے خلاف بیانات دئے۔ تب حضرت عثمان نے حضرت علیؑ سے مشورہ کے

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۵۵ و استیعاب ج ۲ ص ۶۰۴

بعد بڑی مجبوری کی حالت میں عبداللہ بن جعفر کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ ولید پر شرعی حد جاری کریں چنانچہ عبداللہ بن جعفر نے ولید کو چالیس کوڑوں کی سزادی۔[1]

حضرت عثمان نے اصحاب رسول پر بھی طرح طرح کے مظالم کئے تھے انہوں نے بڑے بڑے صحابیوں کو جلاوطن کیا تھا۔ معززین کو پٹوایا تھا۔ ان سے پہلے جو قرآن رائج تھا اس کے بے شمار نسخے جمع کر کے انھیں جلوایا تھا اور جن لوگوں نے اپنا قرآن دینے سے انکار کیا تھا انھیں مسجدوں میں اس بری طرح زدوکوب کرایا تھا کہ ان کی پسلیاں تک ٹوٹ گئی تھیں۔ انھوں نے حضرت عائشہ کے وظیفے میں تخفیف کے بعد ان کے بھائی محمد بن ابوبکر کو قتل کرانے کا منصوبہ بھی تیار کیا تھا جسے معاویہ نے منزل تکمیل تک پہنچایا لیکن جو چیز سب سے زیادہ فتنہ انگیز ثابت ہوئی وہ وزیر اعظم کے عہدے پر مروان بن حکم کی تقرری تھی۔ اس نے بھی بہت سے ایسے کام انجام دئے جن کی ذمہ داری براہ راست حضرت عثمان پر عائد ہوتی تھی۔ متعدد بار اس نے صحابہ کے مجمع میں ایسی تہدید آمیز تقریریں کیں جنھیں طلقاء کی زبان سے سننا سابقین صحابہ کے لیے ناقابل برداشت تھا چنانچہ حضرت عثمان کی بیوی نائلہ کی بھی اس کے بارے میں یہی رائے تھی کہ عثمان کے لیے مشکلات کی دیوار کھڑی کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری مروان پر عائد ہوئی ہے یہاں تک کہ انہوں نے ایک دن اپنے شوہر عثمان سے صاف صاف یہ کہہ دیا کہ اگر آپ مروان کے کہنے پر یوں ہی عمل کرتے رہے تو یہ آپ کو قتل کرواکے چھوڑے گا۔[2]

اگر تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو حضرت عثمان سے جو بدعنوانیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی ذمہ داریاں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر پر بھی عائد ہوتی ہیں

[1] بخاری کتاب المناقب باب مناقب عثمان بن عفان۔ [2] طبری ج ۳ ص ۳۹۶، ۳۹۷

اس لیے کہ اقتدار پرست سقیفائی خلافت ابتدا ہی سے ملوکیت کی طرف مائل رہی ہے اور اس کا اصل مقصد تعلیمات اسلامی، سنت پیغمبری، احکام شریعت حقوق بشریت اور انسانی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر اقتدار کی تمنا، ملک گیری کی ہوس اور تخت و تاج کی خواہش کے تحت ایک ایسا شہنشاہی نظام قائم کرنا تھا جس میں خواہشات نفس کی تکمیل دینی فریضہ کی ادائیگی قرار پائے۔

اور چونکہ ان لوگوں نے تزکیۂ نفس یا اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ صرف جہانبانی ان کا مطمع نظر تھا اس لیے وہ نظام الہی و نظام اسلامی کو خالص شہنشاہی نظام میں ضم کرنے کی جدوجہد میں زندگی بھر مصروف رہے۔ وہ ایک ایسے نظام کی کوششوں میں سرگرداں رہے جس میں حصول منفعت کی ہر امکانی کوشش مستحسن سمجھی جائے خواہ وہ منفعت دوسروں پر جبر و تشدد اور مظالم کے بعد ہی کیوں نہ حاصل ہو۔

یہ سلسلہ خلافت اولیٰ سے دور عثمانی تک برابر جاری رہا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ منصف مزاج مورخین نے حضرات شیخین کے نظام حکومت کو بھی دینی و الہٰی نظام تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے جیسا کہ مشہور مصری مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا بیان ہے۔

" جو لوگ اس نظام کو الہٰی نظام تصور کرتے ہیں وہ حقیقت میں ان الفاظ و کلمات سے دھوکا کھاتے ہیں جو خلفاء کے خطبات میں پڑھتے ہیں۔ نیز ان روایات سے جو خلفاء کے بارے میں عام طور سے مشہور ہیں اور جن میں اللہ کا ذکر، اللہ کا حکم اور اس کی سلطانی اور اطاعت کا تذکرہ ہے۔ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ الفاظ اور یہ روایات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کا نظام حکومت آسمانی تھا حالانکہ ان میں صرف ایک بات کی طرف اشارہ ہے جو بالکل عام

لیکن ساتھ ہی ساتھ بہت اہم ہے اور یہ کہ "خلافت" خلفاء اور عام مسلمانوں کے مابین ایک معاہدہ ہے۔"[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیخین کا رائج کردہ نظام نہ تو اسلامی تھا اور نہ سنت رسولؐ کے مطابق تھا بلکہ اس نظام کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمان ان کے نظام حکومت کو اللہ کا رائج کردہ نظام سمجھ کر ان کے ہر جائز و ناجائز افعال کو قبول کرتے رہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں نظام اسلامی، نظام الہٰی یا نظام آسمانی کا کوئی تصور نہیں تھا اور وہ لوگ صرف ایک دنیاوی حکمراں کی حیثیت رکھتے تھے۔

یہاں پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمان یا صحابہ جو ہر وقت جمال و کمال رسالت کا مشاہدہ کیا کرتے تھے اور جنھوں نے سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا تھا یا جو سیرت رسول سے متاثر تھے اور جن کے دلوں میں ایمان کا چراغ روشن تھا اور جو اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ رسولؐ اللہ دنیا پر حکومت کرنے نہیں آئے بلکہ دنیا کو امن، اخوت اور سلامتی کا درس دینے آئے ہیں اور جو یہ بھی جانتے تھے کہ رسولؐ کے دل میں فتوحات اور مال غنیمت کی تمنا نہیں ہے بلکہ وہ خلق عظیم بن کر انسانی قدروں کو بلند کرنے، اخلاق بشری کو سنوارنے توحید کا درس دینے اور مرحلۂ آخرت کو آسان بنانے کے لیے آئے ہیں۔ وہ لوگ عقل و بصیرت کیوں کھو بیٹھے کہ انہوں نے خلفاء کے ان خطرناک ارادوں اور منصوبوں کو نہ سمجھا اور ان کے غیر اسلامی رنگ ڈھنگ اور رویے کو محسوس کرتے ہوئے بھی انھیں خلیفۂ رسولؐ کی حیثیت دے دی؟

[1] ترجمہ الفتنۃ الکبریٰ عبدالنعمانی ص ۳۴

اس کا جواب یہ ہے کہ تلوار، طاقت، دولت اور خصوصاً ذہن کی نیم پختگی نے حقائق و عقائد پر گہرے پردے ڈال دئے تھے جس کی وجہ سے یہ لوگ خلفائے ثلاثہ کی ہر بات کو حقیقت سمجھ کر مجاز میں گم ہو گئے۔

ملک گیری کی تمنا نے دور اولیٰ میں فتوحات کا بازار گرم کر کے مال غنیمت کی شکل میں جو سرمایہ حاصل کیا اس کا بیشتر حصہ بغاوت کو فرو کرنے، حکومت کے استحکام اور افواج کی تنظیم کاری پر خرچ ہوا، اور جو بچ گیا وہ مسلمانوں میں تقسیم کے بعد خلیفہ کے گھریلو بیت المال میں جمع ہو گیا[1]

پھر رفتہ رفتہ فتوحات کا یہ سلسلہ دوسرے دور میں داخل ہو کر منزل کمال پر پہنچ گیا اور دنیا کی دولت سمٹ کر ڈھیر ہو گئی لیکن حضرت عمر کی جمع خوری نے وقت آخر اسے حضرت عثمان کے حوالے کر دیا اور حضرت عثمان ان کے مفتوحہ ممالک اور خزانوں کے مالک و مختار بن گئے۔

حضرت عثمان کے دور میں افراط زر کا یہ حال تھا کہ ایک لاکھ درہم میں ایک گھوڑا خرید اجاتا تھا[2] اور ایک بیگہ زمین پر لگے ہوئے باغ کی قیمت چار لاکھ درہم تھی[3]

علامہ جلال الدین سیوطی نے عثمانی عہد میں مفتوحہ ممالک سے مال غنیمت کے طور پر حاصل ہونے والی دولت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:۔

"۳۰ھ میں خراسان کے اکثر شہر، نیشاپور، طوس، سرخس، مرد اور بیہق فتح ہوئے ان وسیع شہروں کی" فتوحات کے بعد دولت و مال غنیمت کے انبار لگ گئے

---

[1] تاریخ اسلام ذاکر حسین حصہ دوم ص ۵۶ [2] تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۰۸
[3] سرگزشت معاویہ ص ۱۳۲

تو حضرت عثمان نے خزانہ بنوایا اور تمام لوگوں کو وظیفہ و یومیہ تقسیم کیا دولت کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص کو ایک ایک لاکھ بدرے دہمانیاں، یعنی سولہ سولہ ارب روپئے دئے[1]۔

دولت کی اس ریل پیل میں حضرت عثمان نے تقسیم اموال کا جو غیر مساوی طریقہ اختیار کیا وہ مسلمانوں کے لیے قطعاً نامانوس اور تکلیف دہ تھا۔ وہ شوریٰ کے اراکین، قریش کے سرکش اور بڑے لوگوں اور اپنے قریبی رشتے داروں کو خصوصی طور پر بہت زیادہ مال دیتے تھے اگر یہ سارا مال ان کی اپنی ذاتی کمائی کا ہوتا تو کسی کے لیے اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی لیکن یہ مال بیت المال سے دیا جاتا تھا جو تمام مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ تھا۔ مستزاد یہ کہ مختلف شہروں میں حضرت عثمان کے نمائندے بھی ان کی پیروی کرتے تھے اور وہ لوگ بھی اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو ترجیحاً مال دیا کرتے تھے[2]

حضرت عثمان نے دولت مند طبقہ کی دولت کو مزید بڑھاوا دینے کے لیے یہ طریقہ بھی رائج کیا کہ وہ مال غنیمت میں حاصل کی ہوئی اپنی زمینوں کو وہاں منتقل کر سکتے ہیں جہاں وہ مقیم ہیں یعنی کسی شخص کی زمین اگر شام میں ہے تو وہ اس کے عوض اس شخص سے اپنی زمین کا تبادلہ کر سکتا ہے جس کی زمین حجاز یا دوسرے عرب ممالک میں ہے۔

اس طریقہ کار سے دولت مند طبقہ نے بھی فائدہ اٹھایا اور اپنی بے پناہ دولت سے مفتوحہ علاقوں میں آراضیات کی خریداری شروع کر دی اور اپنے غلاموں و مزدوروں کو ان کی کاشت پر لگایا جس کے نتیجے میں یہ زمینیں سونا

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۱۶۰ [2] مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۱ و انساب الاشراف ج ۵ ص ۲۵

اگلنے لگیں جس سے ان کی دولت دن دونی رات چوگنی کے حساب سے بڑھنے لگی۔ اس کا خلاصہ مسعودی کی زبان قلم سے سنئے:

"زبیر کی دولت بصرہ، کوفہ، مصر اور اسکندریہ میں پچاس ہزار دینار ایک ہزار گھوڑے، ایک ہزار غلام اور لامحدود جاگیر تک پہنچ گئی تھی۔ اور طلحہ بن عبید اللہ کو عراق کے غلہ سے ایک ہزار درہم یومیہ کی آمدنی تھی۔ عبد الرحمٰن بن عوف کے پاس ان کی بے پناہ دولت کے علاوہ ایک ہزار گائیں اور دس ہزار بھیڑیں تھیں جب زید بن ثابت کا انتقال ہوا تو اس کا سونا اور چاندی کلہاڑوں سے توڑا گیا اس کے علاوہ جو رقم نقد اس نے چھوڑی وہ ایک لاکھ درہم اور پانچ لاکھ دینار پر مشتمل تھی یعلی بن منبہ جب مرا تو اس نے تین لاکھ کی جاگیر کے علاوہ پانچ لاکھ دینار نقد چھوڑے اور حضرت عثمان کی دولت کا تو کوئی ٹھکانا تھا ہی نہیں[1]

اس دولت مند طبقہ کے علاوہ غربت اور افلاس کا مارا ہوا ایک مفلس و نادار طبقہ بھی تھا جس کے پاس نہ زمینیں تھیں نہ مال و دولت اور نہ سر چھپانے کی کوئی جگہ تھی اس طبقہ میں محاذ جنگ پر لڑنے والے جانباز اور ان کے اہل و عیال شامل تھے جن کے بارے میں حضرت عثمان کا کہنا تھا کہ میدان جنگ میں لڑنے والے مسلمانوں کو صرف معمولی اجرت کا حق حاصل ہے باقی سارا مال غنیمت اللہ کا ہے[2]۔

جب سارا مال غنیمت اللہ کے لیے تھا تو حضرت عثمان کیا خدا تھے؟ یا خدا

---

[1] مروج الذہب ج ۲ ص ۳۴۱ تا ۳۴۳ ، [2] تاریخ اسلام حسن ابراہیم ج ۳

کے بیٹے تھے؟ جو اس کی ملکیت کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اپنا دست تصرف دراز کئے ہوئے تھے۔

بہر حال ـ حضرت عثمان نے اپنی اس غلط حکمت عملی سے ان دونوں طبقوں کے درمیان عدم مساوات کی ایک خلیج پیدا کر دی چنانچہ ایک طرف دولت مند طبقہ کی دولت میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور دوسری طرف غریب و مفلس طبقہ کی غریبی اور ناداری اور بڑھتی گئی یہاں تک کہ اس غیر منصفانہ نظام نے مسلمانوں کو یہ احساس دلا دیا کہ انہوں نے اسلامی اقتدار کی باگ ڈور غلط ہاتھوں کے حوالے کر دی ہے۔

یہ تھے وہ وجوہ، جن کی بنا پر حضرت عثمان کی ناقص پالیسی مسلمانوں کے درمیان غم و غصہ، بے اطمینانی، نفرت، بغاوت اور انقلاب کا سبب بن گئی اور مدینہ، مصر، کوفہ اور بصرہ کے مسلمانوں نے حضرت عثمان کو گھیر کر انھیں کے گھر میں محصور کر دیا۔ دوسرے یہ کہ حضرت عائشہ نے بھی یہ کہہ کر انقلابیوں کی حوصلہ افزائی کی کہ، اس لمبی داڑھی والے نعثل کو قتل کر دو[1]

یہ حکم صادر فرمانے کے بعد ام المومنین حج کے بہانے سے مکہ کی طرف روانہ ہو گئیں حضرت عثمان نے اپنے سر پر جب موت کا سایہ دیکھا تو انہوں نے معاویہ کو ایک فریادی خط روانہ کیا جس میں لکھا کہ:۔

" اس وقت میں ایک ایسی قوم کے ہاتھوں محصور ہوں جس کے درمیان میں مدت سے رہتا تھا انہوں نے میرے بارے میں جلدی فیصلہ کر لیا ہے۔ اب صرف دو ہی صورتیں ہیں، یا تو وہ مجھے قتل کر دیں یا پھر

---

[1] نظام ثلاثہ مولف عبد القادر چشتی ص ۱۱۲

میں خلافت واقتدار کا لباس اپنے جسم سے اتار کر ان کے حوالے کر دوں
لیکن خدا کی قسم میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا خواہ محصوری کی حالت میں
قتل ہی کیوں نہ کر دیا جاؤں میرے سوا تمھارا کوئی دوسرا خلیفہ نہیں ہے
میرے احسانات کو یاد کرو اور جلدی میری مدد کو آؤ — فریاد ہے فریاد
مگر میں جانتا ہوں کہ تم میری مدد نہیں کرو گے"۔

اس فریادی خط کے بعد حضرت عثمان انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہو کر یہودیوں کے قبرستان میں دفن بھی ہو گئے مگر معاویہ نے نہ ان کا ساتھ دیا اور نہ انکی مدد کو آیا[۱]"۔

حضرت ابوذر غفاری اور معاویہ

حضرت ابوذر غفاری مدینہ سے مشرق کی جانب واقع ایک چھوٹے سے ریگستانی گاؤں ربذہ کے رہنے والے تھے آپ کا نام جندب ابن جنادہ تھا جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چرچا سنا تو مکہ آئے اور سرور کونینؐ کی خدمت میں باریاب ہو کر آپ نے اسلام قبول کیا جس پر کفار قریش سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائیں مگر آپ کے ثبات قدم میں لغزش نہ آئی۔

اسلام قبول کرنے والوں میں آپ کا شمار پانچویں نمبر پر کیا جاتا ہے۔ اس سبقت اسلامی کے ساتھ آپ کے زہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ حضرت رسولخداؐ نے فرمایا کہ میری امت میں ابوذر زہد وورع میں عیسیٰ ابن مریم کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

جب سقیفائی خلافت کا تیسرا دور اسلام کی تقدیر کا چکر بن کر مسلمانوں پر

---

[۱] سرگزشت معاویہ ص ۲۱۰

مسلط ہوا اور حضرت عثمان کی مطلق العنانی وکنبہ پروری نے حکم خدا، سنت رسولؐ اور سیرت شیخین کے خلاف، اسلامی بیت المال کو اپنی عیش پرستی واقرباء پروری کا ذریعہ قرار دیا تو حضرت ابوذر غفاری کی جلیل القدر صحابیت تڑپ اٹھی چنانچہ آپ نے قرآن مجید کی آیتوں اور تفسیروں کے ذریعہ حضرت عثمان کی اس بے راہ روی کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اور اس آیت کریمہ کو سرنامۂ کلام قرار دیا جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں جہنم کی خبر دے دو"۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ مدینے کی گلیوں، کوچوں، بازاروں اور مسجدوں میں کھڑے ہو کر مسلمانوں کو رسول اللہؐ کا زمانہ یاد دلاتے، عثمانی نظام حکومت پر طنز وتنقید کرتے، سرمایہ داری اور جمع خوری کی مخالفت کرتے اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ کی برملا کھل کر مذمت کرتے۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابوذرؓ کا یہ طرز عمل، حضرت عثمان کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ ایک دن آپ نے انھیں طلب کیا اور کہا، میں نے سنا ہے کہ تم مجھ پر تنقید کرتے ہو اور مجمع عام میں یہ کہتے ہو کہ جب بنی امیہ کی تعداد تیس تک پہنچ جائے گی تو یہ اللہ کے شہروں کو اپنی جاگیر، اس کے بندوں کو اپنا غلام اور اس کے دین کو فریب کاری کا ذریعہ قرار دے لیں گے؟"

حضرت ابوذر نے کہا، بے شک میں نے پیغمبر اسلامؐ سے یہ حدیث سنی ہے عثمان نے کہا، تم جھوٹ کہتے ہو۔ پھر اپنے مصاحبین کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا، کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہؐ کی زبان سے یہ حدیث سنی ہے جب سبھی لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو حضرت ابوذر نے عثمان سے کہا، تمھارے یہ درباری اس حدیث کے بارے میں کیا جانیں؟ اگر پوچھنا ہی ہے تو حضرت

علیؑ سے پوچھو، وہی اس کی حقیقت بتائیں گے۔ چنانچہ عثمان نے حضرت علیؑ کو بلوا کر ان سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ابوذر سچ کہتے ہیں۔ عثمان نے کہا، آپ کس بنیاد پر اس حدیث کی صحت کی گواہی دے رہے ہیں؟ امیر المومنین نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میرے اہلبیتؑ کے علاوہ زمین و آسمان کے درمیان ابوذر سے زیادہ سچ بولنے والا کوئی انسان نہیں ہے"۔

اب حضرت عثمان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اگر جھٹلاتے تو پیغمبرؐ کی تکذیب لازم آتی لہذا پیچ وتاب کھا کر رہ گئے اور کوئی تردید نہ کر سکے۔

حضرت عثمان کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ اگر کوئی شخص ان کی بدعنوانیوں، لوٹ کھسوٹ اور اقربا پروری کے خلاف آواز احتجاج بلند کرتا تھا تو وہ اسے جبراً دمشق بھیج دیتے تھے تاکہ معاویہ کی استبدادی قوت اس کی زبان کو خاموش کر دے چنانچہ یہی سلوک انہوں نے ابوذرؓ کے ساتھ بھی کیا اور رسولؐ کے اس بزرگ صحابی کو زبردستی دمشق جانے پر مجبور کر دیا۔

حضرت ابوذر غفاری مجبوری اور بے سروسامانی کے عالم میں جب دمشق پہنچے اور وہاں انہوں نے معاویہ کا یہ حال دیکھا کہ وہ بادشاہ بنا بیٹھا ہے اس نے قیصر و کسریٰ کے طور طریقے اپنا لیے ہیں، اسلامی قدریں پامال ہو رہی ہیں مسلمانوں کے حقوق غصب کئے جا رہے ہیں اور بیت المال ذاتی ملکیت بن چکا ہے تو وہاں بھی انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں مسلمانوں کی چھوٹی بڑی جماعتیں ابوذر کے ارد گرد جمع ہونے لگیں اور معاویہ کے خلاف ایک محاذ تشکیل پانے لگا اور پھر رفتہ رفتہ ابوذرؓ کی سرگرمیاں معاویہ کی جان کا وبال بن گئیں۔

اب حضرت ابوذر پر قابو حاصل کرنا معاویہ کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔

ابوذر مسجد میں ہوتے یا دمشق کے بازاروں میں، وہ معاویہ کی عیش پرستی، دولت مندی

اور شاہی سیرت کے خلاف اپنی تقریری مہم کو جاری رکھتے یہ تقریریں کیا تھیں؟ قرآن کی آیتیں اور تفسیریں تھیں، جنھیں سن کر لوگوں کے دلوں میں معاویہ کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھرنے لگا تھا۔ چنانچہ مورخ طبری کا بیان ہے کہ:-

"ابوذر کی تقریروں سے غریب اور نادار مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دولتمند طبقہ کے لوگ بھی معاویہ سے منحرف ہونے لگے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر معاویہ نے عثمان کو لکھا کہ یہاں آنے کے بعد ابوذر میرے لیے دردسر بن گئے ہیں لہذا ان کا علاج ضروری ہے[۱]"

مولوی عبدالوحید خاں رقم طراز ہیں:-

"دمشق میں ابوذر غفاری کی حق بیانی نے معاویہ کی نیندیں حرام کر دی تھیں اس لیے اس نے ایک خط کے ذریعہ حضرت عثمان غنی کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ ان کی ہلاکت ہی ہمارے اور آپ کے لیے راحت وسکون کا سبب بن سکتی ہے[۲]"

علامہ خلیق الرحمان کا بیان ہے کہ:-

"معاویہ نے حضرت عثمان کو لکھا کہ اگر ابوذر اور کچھ دنوں تک دمشق میں رہے تو یہاں کے لوگ آپ سے برگشتہ ہو کر بغاوت پر آمادہ آئیں گے لہذا فوری طور پر ان کا تدارک ضروری ہے[۳]۔

معاویہ کے خط کے جواب میں حضرت عثمان نے لکھا کہ ابوذر کو کسی سرکش، بے کجاوہ اور تیز رفتار اونٹ پر سوار کر کے کسی بے رحم اور سنگدل رہبر کے ساتھ ہمارے پاس فوراً روانہ کر دو۔

---

[۱] تاریخ طبری حالات عثمان بن عفان [۲] سرگزشت معاویہ ص ۲۲۴ [۳] ابن ابوسفیان ص ۱۳۰

مورخین کا بیان ہے کہ جب حضرت ابوذر مدینہ پہنچے ہیں تو اذیت ناک سواری کی وجہ سے آپ کے رانوں کا گوشت جدا ہو چکا تھا اور ہڈیوں کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس عالم میں بھی حضرت عثمان کا شاہی دبدبہ ابوذر کی زبان صداقت پر خاموشی کی مہر نہ لگا سکا۔ آتے ہی وہ بھرے دربار میں کھڑے ہو گئے اور عثمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے:۔

"میرے پروردگار کا یہ ارشاد ہے کہ جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو اور انھیں یہ بتا دو کہ حشر کے دن ان کا جمع کیا ہوا سونا اور چاندی دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانیاں داغی جائیں گی، اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی سونا اور چاندی ہے جسے تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا تھا، تو اب ذخیرہ اندوزی کا مزہ چکھو"

مولوی عبدالوحید خاں کا بیان ہے کہ حضرت ابوذر قرآنی آیت کا یہ ترجمہ ہی کر پائے تھے کہ تکلیف کی شدت نے ان پر غشی کا عالم طاری کر دیا اور جب ہوش آیا تو وہ عثمان کی حراست میں تھے اور اسی حراست کے دوران حضرت عثمان نے اپنی طینت وعادت کے مطابق انھیں بھی مال وزر کا لالچ دے کر اپنے دام میں پھنسانا چاہا لیکن وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بالآخر انہوں نے حضرت ابوذر کی جلاوطنی کا فیصلہ کیا اور مروان بن حکم کو یہ تاکید کی کہ وہ ایسے جابر لوگوں کو ابوذر پر مسلط کرے جو انھیں مدینہ سے نکال کر ربذہ کے ریگستانوں میں چھوڑ آئیں [۱]

بعض تاریخی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابوذر کے بارے میں خلیفہ عثمان نے یہ فرمان بھی جاری کیا تھا کہ جس وقت ابوذر اور ان کے اہل وعیال

---

[۱] سرگزشت معاویہ ص ۲۲۶

کو مدینہ سے نکالا جائے اس وقت کوئی بھی شخص نہ انھیں الوداع کہے اور نہ ہی ان سے کسی طرح کی کوئی بات کرے۔ مگر امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام، امام حسنؑ، امام حسینؑ جناب عقیل، عبداللہ ابن جعفر اور عمار یاسر وغیرہ نے اس عثمانی فرمان کو نہیں مانا۔ ان لوگوں نے اشکبار آنکھوں سے ابوذر کو رخصت کیا اور کافی دور تک انھیں چھوڑنے بھی گئے۔

اس کے بعد ربذہ کے صحرائی علاقوں میں ابوذر کی مسافرانہ زندگی انتہائی مصائب وآلام میں کٹی۔ آپ کے فرزند "ذر" اور اہلیہ نے یہیں انتقال کیا جو بھیڑ بکریاں اپنے ساتھ گزارے کے لیے لائے تھے وہ بھی ہلاک ہو گئیں صرف ایک بیٹی رہ گئی جو دکھوں اور فاقوں میں باپ کی شریک تھی۔ جب تمام سروساماں زندگی ناپید ہو گیا اور مسلسل فاقوں پر فاقے ہونے لگے تو ایک دن اس نے باپ سے کہا، باباجان! یہ زندگی کے دن کیسے کٹیں گے؟ کہیں آنا جانا چاہیئے اور رزق کا سامان فراہم کرنا چاہیئے بیٹی کی اس تجویز پر حضرت ابوذر اسے اپنے ہمراہ لے کر صحرا کی طرف نکل پڑے مگر رزق کی فراہمی تو درکنار، گھاس پھونس اور درختوں کے پتے بھی میسر نہ آسکے۔ آخر کار تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ صحرائی ریت اکٹھا کی اور اس پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔ اسی عالم میں سانسیں اکھڑنے لگیں اور نزاعی کیفیت طاری ہو گئی۔ بیٹی نے باپ کی یہ حالت دیکھی تو مضطرب وپریشان ہو کر کہنے لگی کہ باباجان! اگر آپ نے اس لق ودق صحرا میں انتقال فرمایا تو میں تنہا کفن ودفن کا انتظام کیسے کروں گی؟

ابوذر نے فرمایا، گھبراؤ نہیں بیٹی، رسول اللہ نے مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ اے ابوذر تم عالم غربت میں انتقال کرو گے اور کچھ عراقی تمہاری تجہیز وتکفین کریں گے لہذا میں جب دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو تم اپنی چادر مجھ پر ڈال دینا اور سر راہ جا کر بیٹھ جانا جب ادھر سے کوئی قافلہ گزرے تو اس قافلے کے لوگوں سے کہنا کہ رسولؐ کے صحابی ابوذر نے انتقال کیا ہے۔

چنانچہ حضرت ابوذر کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی سر راہ جا کر بیٹھ گئی تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک قافلہ آیا جس میں بلال بن مالک، احنف بن قیس تمیمی، صعصعہ بن صوحان، اسود بن قیس تمیمی اور مالک اشتر وغیرہ شامل تھے ان لوگوں کو جب ابوذر کے انتقال کا حال معلوم ہوا تو بے چین ہو گئے۔ سواریاں روک دی گئیں اور تجہیز وتکفین کی خاطر سفر ملتوی کر دیا گیا۔ اس وقت مالک اشتر نے ابوذر کو جو کفن دیا تھا اس کی قیمت چار ہزار درہم تھی۔ حضرت ابوذر کو سپرد خاک کرنے کے بعد دوسرے دن یہ لوگ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے اور اپنے ساتھ ابوذر کی غمزدہ بیٹی کو بھی لے گئے یہ واقعہ ۸ ذی الحجہ ۳۲ھ کا ہے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ابوذر کو دفن کرنے کے بعد مالک اشتر اور ان کے ساتھیوں نے معاویہ اور عثمان کو ان کا قاتل قرار دیتے ہوئے ان پر لعنت ملامت کی اور ان کے حق میں بددعائیں کیں:

معاویہ اور عثمان

حضرت عمر کے دور ہی میں معاویہ نے شاہانہ روش اختیار کر لی تھی، لیکن اس کے اندر اس محدود بادشاہت پر قناعت کا جذبہ نہ تھا بلکہ وہ پوری مملکت اسلامیہ پر بادشاہت کا خواب دیکھ رہا تھا چنانچہ حضرت عثمان کے خلاف جب بغاوت کے آثار نمودار ہوئے تو اس کے دل کی کلیاں بھی کھلنے لگیں مگر اس نے بظاہر ہمدردی جتلاتے ہوئے انھیں یہ مشورہ دیا کہ آپ فی الحال وقتی طور پر مدینہ کی سکونت ترک کر کے شام میں رہائش اختیار کر لیں اس طرح معاویہ نے دارالخلافہ کو شام میں منتقل کرنے کی تجویز پیش کی لیکن اس بات پر حضرت عثمان جب تیار نہ ہوئے تو اس نے دوسرا حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا، اگر آپ کہیں تو میں آپ کی جان کی

حفاظت کے لیے مدینہ میں ہی شام کے فوجی دستے تعینات کر دوں۔ مگر حضرت عثمان اس پر بھی راضی نہ ہوئے۔

معاویہ کی ان تجاویز پر تاریخ دانوں کا اتفاق تو ہے لیکن ان تجاویز کی تہ میں اس کی کیا غرض پوشیدہ تھی؟ اس راز سے پردہ کسی نے نہیں ہٹایا۔

بات یہ تھی کہ حضرت عثمان اگر مدینہ میں رہ کر طبعی وفطری موت سے ہمکنار ہوتے تو معاویہ کی طرف خلافت کا آنا تقریباً غیر ممکن تھا، کیونکہ اہل مدینہ ہی خلیفہ کا انتخاب کرتے اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ معاویہ طلقاء میں سے ہے اور اس کا اسلام مجبوری کا اسلام ہے لہذا دوسرے مقتدر صحابہ کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی اور اگر عثمان معاویہ کے جال میں آجاتے اور دارالخلافہ شام منتقل ہو جاتا تو ان کے جیتے جی خلافت کی باگ ڈور معاویہ اپنے ہاتھ میں لے لیتا اور دھونس دھاندلی کی بنیاد پر خلافت کا راستہ اپنے حق میں ہموار کر لیتا اور پھر خلیفہ کو ٹھکانے لگا کر بغیر کسی دشواری اور رکاوٹ کے تمام بلاد اسلامیہ کا خلیفہ بن جاتا اور وہ اپنی خلافت کو مسلمانوں سے اسی طرح تسلیم کرا لیتا جس طرح اس نے اپنے فاسق وفاجر بیٹے یزید کی خلافت کو تسلیم کرایا۔

مدینہ میں شامی افواج کی تعیناتی کی پیش کش معاویہ نے محض اس لیے کی تھی کہ اگر حضرت عثمان انقلابیوں کے ہاتھوں قتل کر دئے جائیں تو شامی تلواریں خلافت کا رخ معاویہ کی طرف موڑ سکیں مگر اس کی یہ تمام تدبیریں اس وقت ناکام ہو گئیں جب حضرت عثمان کی اقتدار پرستی نے اسے موقع ہی نہیں دیا یہاں تک کہ وہ خود قتل ہو گئے اور معاویہ ہاتھ مل کر رہ گیا؛

حضرت علیؑ کی بیعت

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد خلافت کے تین دور جب اسلام کی تقدیر کا چکر بن کر گزر گئے اور تخت خلافت ۳۵ سنہ ہجری میں حضرت عثمان کے وجود سے خالی ہوگیا تو مسلمانوں کی نظریں حضرت علیؑ ابن ابیطالب کی طرف اٹھیں جن کی انصاف پسندی، حق گوئی، اصول پرستی، سلامت روی، اور سیاسی بصیرت کا تجربہ انھیں ہو چکا تھا۔

حالات کو پرکھنے اور حق و باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے ۲۳۔۲۴ سال کی مدت کافی ہوتی ہے چنانچہ مسلمانوں نے متفقہ طور پر یہ طے کیا کہ اب اسلام کی بقا اسی میں ہے کہ تخت خلافت کو بلا شرط حضرت علیؑ کے حوالے کر دیا جائے اس کے بعد مدینہ، شام، مصر، عراق، حجاز، فلسطین، اردن اور یمن وغیرہ کے مسلمان حضرت علیؑ کی طرف اس طرح دوڑ پڑے جس طرح بھولے بھٹکے مسافر منزل کی جھلک دیکھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ طبری کا بیان ہے کہ لوگ ہجوم کر کے حضرت علی پر ٹوٹ پڑے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام پر کیا کیا مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں اور پیغمبرؐ کے قرابت داروں کے بارے میں ہماری کیسی کیسی آزمائشیں ہو رہی ہیں[1]

مگر امیر المومنین نے ان کی بیعت قبول کرنے سے انکار کیا جس پر ان لوگوں نے خوب واویلا مچایا، اور کہنے لگے اے ابوالحسن! آپ اسلام کی

[1] ۔ طبری ج ۵ ص ۱۵۶

تباہی و بربادی پر نظر کیوں نہیں کرتے؟ فتنہ و شر کے امنڈتے ہوئے طوفان اور ظلم و ستم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو کیوں نہیں دیکھتے؟

مسلمانوں کی اس عاجزانہ اور خوشامدانہ درخواست کے باوجود حضرت علیؑ کے انکار کی وجہ یہ بھی کہ مسلمانوں کا اسلامی زاویہ بدل چکا تھا، ان کی عادتیں بگڑ چکی تھیں، اسلامی خلافت، اقتدار اور دنیاوی حکومت کے پیکر میں ڈھل چکی تھی، قیصریت و کسرویت کے آثار اس میں بدرجہ اتم نمایاں تھے، معاشرۂ اسلام میں تبدیلیاں آچکی تھیں، رسول اللہؐ کی بہت سی سنتوں کو ختم کیا جا چکا تھا اور دین کی جگہ سازشی سیاست نے لے لی تھی۔

آپ کی نگاہ امامت یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ پیغمبرؐ کے بعد جو ماحول بن گیا تھا اس کے اثرات لوگوں کے دل و دماغ پر مرتب ہو چکے ہیں، طبیعتوں میں خود غرضی اور اقتدار پسندی جڑ پکڑ چکی ہے اور اب یہ لوگ خلافت الٰہیہ کو بھی مادیت کا رنگ دے کر اس سے کھیلنا چاہیں گے۔ لہٰذا ان حالات میں ذہنوں کو بدلنے اور طبیعتوں کا رخ موڑنے میں لوہے لگ جائیں گے۔

آپ اس امر سے بھی بخوبی واقف تھے کہ اگر میں خلافت کی ذمہ داریاں اپنے سر لیتا ہوں تو مجھے اپنے ضمیر کے خلاف زمانے کی سازشی ہوا کے رخ پر چلنا پڑیگا یا پھر زمانہ ساز افراد سے معرکہ آرائی ہوگی جو فی الحال مناسب نہیں ہے کیونکہ تلوار کی جھنکار مملکت اسلامی میں خلفشار و انتشار کا سبب بنے گی اور بحیثیت حاکم میرا دور ناکامیاب سمجھا جائے گا۔

آپکے انکار میں یہ مصلحت بھی کارفرما تھی کہ ان لوگوں کو سوچنے سمجھنے کا ایک موقع اور دیا جائے تاکہ یہ اپنی مادی توقعات سے محرومی کے بعد کل یہ نہ کہنے لگیں کہ یہ بیعت وقتی اور ہنگامی جذبہ کے زیر اثر ہوگئی تھی اور اس معاملے میں سوچ بچار سے

کام نہیں لیا گیا تھا، جیساکہ خلافت اولیٰ کے متعلق حضرت عمر کا یہی نظریہ تھا، جوان کے قول سے ظاہر ہے کہ ابوبکر کی خلافت بے سوچے سمجھے عمل میں آگئی تھی اور اگر اب کوئی ایسا کرے تو اسے قتل کر دینا[1]۔

غرض کہ مسلمانوں کا اصرار جب حد سے آگے بڑھا تو اس موقع پر آپنے ایک خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں اس امر کو واضح کیا کہ :۔

"اگر تم لوگ مجھے دنیاوی مقصد کے تحت مسند خلافت پر بٹھانا چاہتے ہو تو میں تمھارا آلۂ کار بننے کو تیار نہیں ہوں، مجھے چھوڑ دو اور اس مقصد کے لیے کسی اور کو منتخب کر لو جو تمھاری توقعات کو پوری کر سکے۔ تم لوگ میری سابقہ اور موجودہ سیرت سے اچھی طرح واقف ہو میں قرآن اور رسولؐ کی سنت کے علاوہ کسی کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کو تیار نہیں ہوں اور نہ ہی حکومت کے لیے اپنے اصولوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم لوگ میرا پیچھا چھوڑ دو اور اگر تم لوگ یہ ٹھان چکے ہو کہ میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھے بغیر میری جان نہیں چھوڑو گے تو پھر یاد رکھو کہ چاہے تمھاری پیشانیوں پر بل آئیں، اور چاہے تمھاری زبانیں میرے ہی خلاف کیوں نہ کھلیں، میں تمھیں حق کے راستے پر چلنے کے لیے مجبور کر دوں گا اور کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ اب اس کے بعد بھی تم لوگ اگر میرے ہاتھوں پر بیعت کرنا ہی چاہتے تو اپنا شوق پورا کر لو[2]۔

خلافت سے حضرت علیؑ کا انکار اس بات کی دلیل ہے کہ وہ وقت اہلبیت کی حکومت و اقتدار کے لیے سازگار نہیں تھا چنانچہ ویسا ہی ہوا جیسا کہ آپ

[1] ۔ تاریخ الخلفاء ص ۶۰ ۔ [2] نہج البلاغہ ۔

سمجھ رہے تھے۔ بہت سے مفاد پرست مسلمان آپ کے احکامات کی پابندی اور تعلیمات کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ کتنوں نے آپ کی بیعت سے انحراف کیا، لیکن مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے چونکہ آپ کی بیعت مکمل ہو چکی تھی اس لیے منحرف مسلمانوں کا انحراف غلط تھا۔ اور جب تک یہ لوگ آپکے خلاف کسی عملی اقدام کے مرتکب نہ ہوتے یا مخالفت نہ کرتے یا انتظامی امور میں دخل اندازی نہ کرتے، اس وقت تک کیا ضرورت تھی کہ آپ ان سے تعرض کرتے یا ان پر سختی کے لیے کوئی رائے قائم کرتے۔ لہٰذا آپ "لااکراہ فی الدین" کے اصولوں کو نظر میں رکھتے ہوئے خاموش رہے۔

۲۵ ذی الحجہ ۳۵ سنہ ھ کو بیعت کے فوراً بعد جب آپنے اپنی ان پالیسیوں کا اعلان فرمایا جس کے لیے آپنے خلافت قبول کی تھی تو کچھ لوگوں نے آپ کو یہ مشورہ دیا کہ عثمانی گورنروں میں فی الحال آپ معاویہ کو اس کے عہدہ پر اس وقت تک برقرار رکھیں جب تک حالات پر آپ کی گرفت مضبوط نہ ہو جائے، لیکن آپنے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ دنیاوی سیاست کے اعتبار سے تمھارا مشورہ درست سہی مگر میں معاویہ یا کسی بھی عثمانی گورنر کے مظالم کو اپنے اعمال میں شریک نہیں کر سکتا[1] یہ انتہائی فلسفیانہ، منطقی اور دور رس نتائج کی حامل گفتگو تھی جو صاحبان مشورت اور امیر المومنین کے مابین ہوئی۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اپنی ماتحتی میں معاویہ ایسے سفاک و فتنہ پرداز کی حکومت کو دینی فریضہ کے تحت برداشت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا پہلی فرصت میں آپنے معاویہ کو اس مضمون کا ایک خط روانہ کیا!

[1] نہج البلاغہ ج ۲ ص ۱۴۰

" امابعد ـ تمھیں معلوم ہو کہ میں نے مسلمانوں کے معاملات میں اپنے دامن کو سیاسی آلودگی سے ہر طرح پاک وصاف رکھا، اور ہمیشہ خلافت سے بے اعتنائی اختیار کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ ہوا جو ٹل نہیں سکتا تھا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا اور اب جو حالات ہیں وہ نظروں کے سامنے ہیں۔ تمھیں چاہئے کہ تم شام کے لوگوں سے میرے حق میں بیعت کا مطالبہ کرو اور اولین فرصت میں ایک وفد کے ہمراہ میرے پاس آجاؤ[1]۔"

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر معاویہ پہلے سے حضرت علیؑ کی مخالفت وعداوت پر آمادہ نہیں تھا تو اصولی طور پر بحیثیت گورنر اسے خلیفۂ وقت کے اس تاکیدی حکم پر عمل کرنا چاہئے تھا، مگر اس کے دل میں تو عناد ونفرت کی آگ پہلے ہی سے بھڑک رہی تھی جس کے نتیجے میں اس نے امیر المومنین پر قتل عثمان کی تہمت عائد کی اور آمادۂ پیکار ہوا۔ اس نے اپنی مکارانہ وعیارانہ چالوں کے ذریعہ پورے شامی معاشرے کو اور وہاں کے عوامی ذہنوں کو حضرت علیؑ کے خلاف مشتعل کیا۔ اس نے ماتمی جلسے منعقد کئے اور حضرت عثمان کا خون بھرا کرتا منبر پر رکھوادیا جس کے گرد ہزاروں کا مجمع گریہ وزاری کیا کرتا تھا اور معاویہ کے گماشتے انھیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے تھے کہ حضرت علیؑ ہی عثمان کے قاتل ہیں اور تمھیں ان سے خون عثمان کا قصاص لینا ہے[2]۔

ہو سکتا ہے حضرت علیؑ کے مخالفین اس خوش فہمی کا شکار رہے ہوں کہ یہ چوتھائی صدی تک میدان جنگ سے علیحدگی کے بعد آپ کے بازوؤں میں وہ کس بل نہ رہ گیا ہو جو تلوار کے لیے درکار ہوتا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ جنگ سے پہلے

---

[1] طبری ج ۵ ص ۱۶۳۔ [2] طبری ج ۵ واقعات جمل

پہلے ہی آپ معاویہ کے مفاد میں کسی سمجھوتہ پر رضامند ہو جائیں، مگر ان کے خوابوں کا سارا طلسم اس وقت ٹوٹ کر بکھر گیا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ جوانی گزار کے بڑھاپے میں بھی علیؑ کے اندر سر فروشی کا وہی جذبہ برقرار ہے جو اسلامی غزوات اور معرکوں میں فتح کا ضامن ہوا کرتا تھا اور جب مخالفین کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ آپ دینی اصولوں اور اسلامی نظریات کی حفاظت کے لیے جنگ پر تیار ہیں تو ان کی سرگرمیاں اور بھی بڑھ گئیں۔

تاریخ کا یہ واضح بیان ہے کہ معاویہ کی سرزنش کے بارے میں حضرت علیؑ کسی خصوصی اقدام پر ابھی غور ہی فرما رہے تھے کہ اچانک آپ کو یہ خبر موصول ہوئی کہ ام المومنین عائشہ کی قیادت میں طلحہ وزبیر وغیرہ نے آپ کے خلاف ایک جنگی محاذ قائم کر لیا ہے اور اب وہ لوگ میدان کارزار کی جستجو میں سرگرداں ہیں چنانچہ اس اطلاع کے ملتے ہی آپ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور جمل کے میدان میں ایک خونی معرکہ در پیش آیا۔"

جنگ جمل

اس ہولناک جنگ کی تفصیلی کیفیت ہم اپنی کتاب "حضرت عائشہ کی تاریخی حیثیت" میں بیان کر چکے ہیں اس کتاب کے دامن میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان حالات کو پھر دہرایا جائے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ اہم نکات کا خلاصہ از سر نو میں اپنے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دوں۔

یہ بات واضح رہے کہ حضرت علی علیہ السلام جب مسلمانوں کے حاکم کی حیثیت سے مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے تو سیاسی اور دینی دونوں اعتبار سے آپ کی حکومت گذشتہ خلفاء کی حکومتوں سے کہیں بہتر اور

اعلیٰ ثابت ہوئی، نیز آپ کے انتظامی امور ومنصفانہ طرز عمل میں ذرہ برابر بھی ضعف ظاہر نہیں ہوا مگر امتداد زمانہ کی کروٹوں کو کیا کیا جائے کہ آپ کے پاس خلافت اس وقت آئی جب لوگوں کی نیتیں فاسد ہو چکی تھیں اور حکومت کے والیوں اور ماتحتوں میں حرص وہوس کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور ان میں سب سے زیادہ مکار ولالچی معاویہ تھا کیونکہ اس نے اپنی حکومت جمانے کے لیے لوگوں کو دھوکا دے کر اور بے پناہ مال ودولت خرچ کر کے انھیں اپنے ساتھ ملا لیا تھا[1]۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو اگر سرکار دو عالم کی وفات کے بعد ہی خلیفہ تسلیم کر لیا جاتا تو دنیا سیرت نبوی پر عمل پیرا ہو کر دین حق کی شاہراہ پر چلتی رہتی مگر مصلحت اور دور اندیشی کے نام پر جو آئین سابقہ حکمراں جماعتوں کا جزو زندگی اور اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا اس نے حضرت علیؑ کی پوزیشن کو ناہموار اور موقف کو نا استوار بنا دیا تھا اس لیے آپ کو گزشتہ دور کی غیر اسلامی رسموں اور امتیاز پسند ذہنوں کی اصلاح کے سلسلے میں کرب واضطراب اور پریشانیوں کے راستوں سے بھی گزرنا پڑا لیکن اس کے باوجود آپ کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ کیوں کہ لوگوں کی طبیعتیں اور ذہنیتیں عدم مساوات کی خوگر اور منصفانہ معاشرتی نظام سے منحرف ہو چکی تھیں چنانچہ بیعت کے دوسرے دن جب آپ نے بیت المال کا جائزہ لیا اور مساوی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا تو قریشی غلاموں کو برابر حصہ ملا، جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کی پیشانیوں پر ناگواری کی سلوٹیں ابھریں، اور انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ دوسری طرف بنی امیہ کے سرداروں کو بھی اپنی دال گلتی نظر نہ آئی چنانچہ ان میں سے کچھ تو معاویہ کے گروہ میں شامل ہو گئے اور کچھ

---

[1] تاریخ تمدن اسلام ج ۴ ص ۳۷

ام المومنین عائشہ کے پاس مکے چلے گئے جو قتل عثمان کا فتویٰ صادر فرمانے کے بعد حج کے بہانے سے مدینہ چھوڑ کر وہاں چلی گئی تھیں اور اپنے فتوے کے انجام کی خبر سننے کے لیے قیام پذیر تھیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے پیش نظر ایک اہم اور مشکل مرحلہ یہ بھی تھا کہ سارا عالم اسلام اموی گورنروں اور حاکموں کے مظالم سے تنگ آچکا تھا، اگر انھیں بدستور ان کی جگہ پر برقرار رکھا جاتا تو حکومت کی خواہش اور کوشش کے باوجود مسلمانوں کو چین وسکون نصیب نہ ہوتا اور اگر ہٹا دیا جاتا تو مخالفین کی تعداد بڑھ جاتی کیونکہ اموی حکام اور عامل مدت سے خودسری کے عادی اور بیت المال کو لوٹنے کے خوگر ہو چکے تھے اور پھر ان میں سے اکثر ایسے بھی تھے جن کے باپ دادا یا خاندانی افراد حضرت علیؑ کی تلوار سے موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور انھیں اس بات کا گہرا احساس تھا کہ علی ہیں تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے اور اگر رہے بھی تو من مانی نہیں کر سکتے لہٰذا انہوں نے وہ کمین گاہیں تلاش کیں جہاں سے چھپ کر وہ علیؑ پر اپنی سازشوں کے تیر چلا سکیں۔

امیر المومنین کے سامنے دوسرا مرحلہ گورنروں کی معزولی کے بعد ان کی تقرری کا تھا چنانچہ حالات کے پیش نظر آپ نے زیادہ تر ان لوگوں کو اس عہدے پر فائز کیا جن پر آپ کو اعتماد وبھروسہ تھا ـ آپ نے عبداللہ کو یمن کا، سعید کو بحرین کا، سماعہ کو تہامہ کا، عون کو یمامہ کا، قثم کو مکہ کا، قیس کو مصر کو، عثمان بن حنیف کو بصرہ کا، عمار کو کوفہ کا، اور سہل کو شام کا گورنر مقرر کیا لیکن معاویہ کی سرکشی نے سہل کو شام سے واپسی پر مجبور کر دیا۔ اس موقع پر مغیرہ بن شعبہ اور اس کے کچھ ساتھیوں نے حضرت علیؑ کو ایک بار پھر یہی مشورہ دیا کہ آپ معاویہ کو مصلحتاً اس کی جگہ پر برقرار رہنے دیں لیکن آپ نے حق اور راستی کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کے مشورے

کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ میں امت رسولؐ پر بے ایمان و بد قماش لوگوں کو حکمراں نہیں رکھ سکتا۔

غرض کہ حضرت علی علیہ السلام نے جن گورنروں کو ہٹایا ان میں سے کچھ تو معاویہ کے پاس شام چلے گئے اور کچھ ام المومنین عائشہ کے پاس مکے میں جمع ہو گئے طلحہ اور زبیر پہلے ہی حضرت علیؑ کی بیعت توڑ کر عائشہ کی پناہ میں آگئے تھے چنانچہ "قصاص خون عثمان" کے نام سے ایک تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی اور اس تحریک کو عبداللہ بن عامر اور یعلی بن منبہ نے مالی امداد فراہم کی جو بیت المال کا سارا اثاثہ سمیٹ کر بھاگ نکلے تھے:

جنگ جمل کی ہلاکت خیز روداد کے بارے میں مورخین کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ، عثمان بن عفان کے ہاتھوں اپنے وظیفے میں تخفیف کے سبب ان کی مخالف تھیں لہذا محاصرہ کے دوران انقلابیوں کو یہ حکم دے کر وہ مدینہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوگئیں کہ اس نعثل کو قتل کر دو کیونکہ یہ کافر ہوگیا ہے

اس کے بعد مکے میں عبداللہ بن ابی سلمہ کی زبانی جب آپ کو قتل عثمان کا حال معلوم ہوا تو آپ نے مسرت آمیز لہجے میں پوچھا کہ خلافت کا کیا ہوا؟ عبداللہ بن ابی سلمہ نے بتایا کہ مسلمانوں نے بلا اتفاق حضرت علیؑ کے ہاتھوں پر بیعت کر لی ہے — یہ سننا تھا کہ آپ سکتے میں آگئیں اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا کہ اگر علیؑ کے ہاتھ پر بیعت ہوگئی ہے تو خدا کی قسم عثمان بے گناہ قتل کئے گئے ہیں اور میں علیؑ سے خون عثمان کا قصاص لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گی

عبداللہ ابن سلمہ نے جب ام المومنین کے تلون آمیز مزاج میں اچانک تغیر و تبدیلی کا یہ حیرت انگیز کرشمہ دیکھا تو کہنے لگے کہ عثمان کے بارے میں آپ ہی نے تو یہ فرمایا تھا کہ "اس نعثل کو قتل کر دو یہ کافر ہوگیا ہے" اب آپ کے

اندر یہ تغیر کیسا؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ ایک میں ہی کیا سبھی لوگ یہی کہتے ہیں۔ عبداللہ نے پوچھا، آپ کے علاوہ اور کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا، خیر چھوڑو ان باتوں کو اب جو کچھ میں نے کہا ہے اسے دھیان میں رکھو۔"

ام المومنین کی اس بدلی ہوئی مزاجی کیفیت کو دیکھ کر ابن ابی سلمہ نے کچھ اشعار پڑھے جن کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ: "آپ ہی نے پہل کی اور آپ ہی نے عثمان کی مخالفت کا طوفان کھڑا کیا اور اب آپ ہی گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدل رہی ہیں"

(۲) آپ ہی نے خلیفۂ وقت کے قتل کا حکم دیا اور ہم سے کہا کہ وہ بے دین ہو گئے ہیں"

(۳) یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نہ تو آپ پر آسمان پھٹا، نہ آفتاب کو گہن لگا اور نہ ہی زمین شگافتہ ہوئی کہ وہ آپ کو بھی نگل جاتی"

(۴) اب مسلمانوں نے ایسے کے ہاتھ پر بیعت کی ہے جو قوت، شکوہ اور دبدبے میں اپنی مثال آپ ہے وہ ایسا شجاع ہے کہ تلواروں کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتا اور بڑے بڑے گردن کشوں کے بل نکال دیتا ہے"

عبداللہ ابن ابی سلمہ کے ان اشعار کو سننے کے بعد ام المومنین کا پارہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ انہوں نے ابن ابی سلمہ کو الٹے سیدھے کلمات سے نوازا اور اسی وقت سے انھوں نے حضرت علیؑ کے خلاف جنگی مہم چھیڑنے کے لیے لوگوں کو ابھارنا اور بھڑکانا شروع کر دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے عبداللہ بن عامر حضرمی آپ کے دام فریب میں گرفتار ہوئے۔ یہ مکے میں حضرت عثمان کے گورنر رہ چکے تھے اور پھر ان کے ساتھ ہی مروان بن حکم، سعید ابن عاص نیز بنی امیہ کے دیگر افراد بھی آپ کے ہمنوا بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ کے بعد باہمی منصوبہ بندی میں لگ گئے"

جنگ بہر حال طے ہو چکی تھی مگر رزم گاہ کی تلاش میں فکریں لڑ رہی تھیں

ام المومنین کا خیال تھا کہ مدینہ ہی کو تاراجی و تباہی کا نشانہ بنایا جائے لیکن کچھ لوگوں نے مخالفت کی اور کہا کہ اہل مدینہ سے ٹکر لینا آسان نہیں ہے کسی اور مقام کو جنگ کا مرکز بنایا جائے۔ آخر کار بڑی کدوکاوش کے بعد یہ طے پایا کہ بصرہ زیادہ ٹھیک رہے گا کیونکہ وہاں ہمارا ساتھ دینے والوں کی کمی نہیں ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عامر کی بے پناہ دولت اور یعلی بن منبہ کے چھ لاکھ درہم اور چھ سو اونٹوں کی پیش کش کے سہارے یہ لوگ تیس ہزار کا لشکر لے کر حضرت عائشہ کی قیادت میں بصرہ کی طرف چل پڑے۔

راستے میں ایک رکاوٹ پیدا ہوئی جس کی وجہ سے حضرت عائشہ نے آگے بڑھنے کا ارادہ طے کرنا چاہا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک مقام پر آپ نے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنیں تو ساربان سے پوچھا یہ کون سی جگہ ہے؟ اس نے جگہ کا نام "حوأب" ہے۔ یہ نام سنتے ہی ام المومنین کو حضرت رسولخدا صلعم کی تنبیہ یاد آگئی کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنی بیویوں سے فرمایا تھا کہ میری جس بیوی پر حوأب کے کتے بھونکیں گے وہ حق پر نہ ہوگی۔

اس تنبیہ کے یاد آتے ہی ام المومنین سمجھ گئیں کہ پیغمبر اکرمؐ کا روئے سخن میری ہی طرف تھا لہذا انہوں نے اونٹ کو بٹھایا اور سفر ملتوی کر دینے کا ارادہ کر لیا مگر طلحہ و زبیر وغیرہ کی سیاست نے اس بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالا اور جھوٹی قسمیں کھا کر نیز جھوٹی گواہیاں دلوا کر ام المومنین کو یہ باور کرا دیا کہ یہ حوأب نہیں ہے اس کے بعد ام المومنین پھر اسی جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھنے لگیں یہاں تک کہ جب یہ سپاہ بصرہ کے قریب پہنچی تو ام المومنین کو اونٹ کی پشت پر دیکھ کر وہاں کے لوگوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جاریہ ابن قدامہ نے آگے بڑھ کر کہا، اے ام المومنین! قتل عثمان سے بڑی مصیبت تو یہ ہے آپ خدا اور

رسولؐ کے حکم کی پروا کئے بغیر اس ملعون اونٹ پر بیٹھ کر نکل کھڑی ہوئیں اور اپنا دامن حرمت اپنے ہی ہاتھوں سے چاک کر ڈالا"

لیکن جب حوأب کا واقعہ معظمہ کی پاؤں کی زنجیر نہ بن سکا تو جاریہ بن قدامہ کی یہ احتجاجی باتیں ان پر کیوں کر اثر انداز ہو سکتی تھیں، انہوں نے ایک کان سے سب کچھ سنا اور دوسرے کان سے ہوا میں اڑا دیا۔

ادھر حضرت علی علیہ السلام کو جب ان ہنگامہ آرائیوں کا حال معلوم ہوا تو آپ بھی ام المومنین کی اس پیش قدمی کو روکنے اور عام مسلمانوں کو تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے ایک لشکر لے کر اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ ستر بدری صحابہ اور چار سو بیعت رضوان کے مقتدر اصحاب آپ کے ہم رکاب تھے۔

مختصر یہ کہ جب جمل کے میدان میں طرفین کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوئیں تو امیر المومنین حضرت علیؑ نے قرآن ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ تم میں سے کون ایسا ہے جو اس قرآن کو دشمنوں کی صف میں لے جائے اور اس پر انھیں عمل پیرا ہونے کی دعوت دے مگر یہ واضح کئے دیتا ہوں کہ وہ قتل کر دیا جائے گا۔ مسلم مجاشعی نامی ایک نوجوان اس کام کے لیے تیار ہوا اور وہ قرآن کے دشمنوں کی صف میں گیا اور انھیں اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی مگر اس کا وہ ہاتھ کاٹ دیا گیا جس میں قرآن تھا اس نے تیزی سے قرآن کو دوسرے ہاتھ پر بلند کیا اور دشمنوں کو پھر اس پر عمل کی دعوت دی جس کے نتیجے میں دوسرا ہاتھ کاٹ دیا گیا، آخر کار اس نے قرآن کو دونوں کٹے ہوئے بازوؤں سے سنبھالا اور اپنے سینے سے لگایا۔ لیکن جب کلام الہٰی کو پامال کرنے والوں نے مسلم کو قتل کر دیا اور قرآن تیروں و تلواروں کی زد میں آکر پارہ پارہ ہوگیا تو امیر المومنین نے بھی فرمایا کہ خدا کی قسم، اب ان بے دینوں سے جنگ حلال ہوگئی"

اس کے بعد دنیا نے دیکھا کہ وہ تلوار جو بدر، احد، خندق اور خیبر وغیرہ کے معرکوں میں چمکی تھی، پچیس برس کی پیہم خاموشی اور مسلسل گوشہ نشینی کے بعد ایک بار پھر چمکی اور جمل کا معرکہ مخالفین کی بدترین شکست پر ختم ہوگیا اس جنگ میں حضرت علی علیہ السلام نے اپنی حریفہ عائشہ کے ساتھ جو شریفانہ برتاؤ کیا اس کی مثال کسی فاتح کی اپنے مفتوح کے ساتھ نہیں ملتی۔"

یہ جنگ ماہ جمادی الثانیہ ۳۶ سنہ ہجری میں لڑی گئی۔ مقتولین کی تعداد میں مورخین نے اختلاف کیا ہے لیکن مختلف مصدقہ روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ کے تیس ہزار کے لشکر میں سے بیس ہزار افراد مارے گئے اور حضرت علیؑ کی طرف کے ایک ہزار ستر افراد درجۂ شہادت پر فائز ہوئے اور اس خوں ریز جنگ کے خاتمہ پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے دار الخلافہ کو کوفہ منتقل کیا تاکہ وہاں رہ کر معاویہ کی بغاوت پر قابو حاصل کیا جاسکے۔"

جنگ صفین ۳۶-۳۷ سنہ ھ

صفین اس جگہ کا نام ہے جو "برقہ" اور "بالس" کے درمیان واقع ہے[۱]۔ اسی مقام پر ۳۶-۳۷ سنہ ہجری میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور حاکم شام معاویہ کے درمیان وہ خوں ریز جنگ ہوئی تھی جو تاریخ میں جنگ صفین کے نام سے مشہور ہے۔

اس جنگ کا بنیادی سبب صرف یہ تھا کہ معاویہ جو حضرت عمر کے دور سے شام کا خود مختار حکمراں چلا آرہا تھا، حضرت علی کے ہاتھوں پر بیعت کر کے

[۱] معجم البلدان ص ۳۷۰

تخت حکومت سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا وہ قتل عثمان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اقتدار کو نہ صرف برقرار رکھنا چاہتا تھا بلکہ اسے اور مضبوط بنانا چاہتا تھا، جیساکہ بعد کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ اس نے "تحکیم" کے ذریعہ حکومت حاصل کر لینے کے بعد خون عثمان کے سلسلے میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور نہ ہی بھولے سے کبھی عثمان کے قاتلوں کا نام لیا"

بیعت عامہ کے ذریعہ حصول خلافت کے بعد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو معاویہ کی ابتدائی سرکشی نے یہ احساس دلایا تھا کہ ایک نہ ایک دن اس سے جنگ بہر حال ضروری ہے، تاہم اتمام حجت کے لیے آپ نے جنگ جمل سے فراغت کے بعد ۱۲ رجب ۳۶ سنہ ہجری کو جریر ابن عبداللہ بجلی کے ذریعہ معاویہ کو ایک خط روانہ کیا جس میں لکھا تھا کہ "مہاجرین وانصار میرے ہاتھوں پر بیعت کر چکے ہیں لہٰذا تم پر لازم ہے تم بھی میری اطاعت قبول کرتے ہوئے میری بیعت کرو، اور پھر اس کے بعد قتل عثمان کا مقدمہ میرے سامنے پیش کرو تاکہ میں کتاب وسنت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کر کے مجرموں کی نقاب کشائی کر دوں[۱]"

حضرت علیؑ کے اس خط کا مثبت یا منفی جواب دینے کے بجائے معاویہ نے اپنی گندی ذہنیت کا ثبوت یہ دیا کہ ایک پیشہ ور مکار عمرو بن عاص کے مشورہ پر جریر ابن عبداللہ کو حیلے بہانے سے روک لیا اور قصاص خون عثمان کی آڑ میں اپنے باغیانہ منصوبوں کو ایک نئی جہت دینے میں تیزی سے مصروف ہوگیا۔ اس نے شام کے سربرآوردہ لوگوں کو منھ مانگے داموں پر خریدا اور پھر ان کے ذریعہ وہاں کے تنگ ونظر و نافہم عوام کو یہ یقین دلایا کہ قتل عثمان کی اصل ذمہ داری

[۱] سرگزشت معاویہ ص ۱۹۵.

حضرت علی پر ہی عائد ہوتی ہے کیونکہ وہی اپنے طرز عمل کے ذریعہ محاصرین کو پناہ دینے والے ہیں۔ جنگ جمل کی حریفۂ عائشہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے ایک شاطرانہ حربہ یہ بھی استعمال کیا کہ جامع مسجد دمشق کے منبر پر عثمان کا خون آلود و بوسیدہ پیراہن اور ان کی زوجہ نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں رکھوادیں تاکہ عوام انھیں دیکھ کر مشتعل ہوں چنانچہ تاریخ نگاروں کا بیان ہے کہ اس منبر کے چاروں طرف ہزاروں کا مجمع رات و دن گریہ وزاری میں مشغول رہتا تھا۔

جب معاویہ نے شامیوں کے جذبات کو اس حد تک بھڑکا دیا کہ وہ کٹنے مرنے اور جان دینے پر آمادہ ہو گئے تو علوی ایلچی جریر ابن عبداللہ کو اس نے اپنے یہاں سے رخصت کر دیا۔

اہل شام کو ورغلانے، بھڑکانے اور مشتعل کرنے میں معاویہ اس لیے کامیاب ہوگیا کہ ان کے علاقے مسلمانوں کے مرکز مدینہ سے کافی دور واقع تھے دوسری خاص بات یہ تھی کہ شامی کافر تھے کیوں کہ یہ لوگ معاویہ اور اس کے بھائی یزید کے ہاتھوں پر اسلام لائے تھے جن کا اسلام خود ہی "ناقص" تھا تیسرے یہ کہ وہ لوگ صرف اس رسول کو جانتے تھے جس رسول سے ابوسفیان کی ان دونوں اولادوں کی مکارانہ سیاست نے انھیں متعارف کرایا تھا چوتھے یہ کہ وہ لوگ معاویہ کو احترام اور تشکر کی نظر سے دیکھتے تھے اور اسی کو اپنے قیاسی وخیالی رسول کا جانشین سمجھتے تھے۔

معاویہ اس مہم میں اپنی فریب کاریوں کے ذریعہ کچھ صحابہ کو بھی شریک کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے عبداللہ ابن عمر، سعد ابن ابی وقاص اور محمد بن مسلمہ کو خطوط بھی لکھے لیکن منھ کی کھائی۔ اس زمانے میں رشک وحسد کی بنا پر عبداللہ

اور سعد دونوں ہی حضرت علیؑ سے کھنچے کھنچے رہتے تھے لہٰذا معاویہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا تھا کہ یہ لوگ اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر چونکہ ان میں ابھی تھوڑی سی شرافت اور غیرت باقی تھی اس لیے یہ حضرات ایک طلیق باغی کے بھرّے میں نہیں آئے محمد بن مسلمہ کا خاندانی رشتہ بنی امیہ سے ضرور تھا لیکن وہ عثمان کے مخالفین میں تھے اور انھوں نے ان کے خلاف باغیوں کو اکسانے اور ابھارنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ معاویہ کی خواہش تھی کہ وہ اس کے حامی بن کر حضرت علیؑ کے خلاف لوگوں کو ورغلانے اور بھڑکانے کا کردار ادا کریں مگر انہوں نے بھی اس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا اور خط کے جواب میں اسے لکھا کہ :- "عثمان تم سے امداد کے طالب ہوئے تھے لیکن قدرت کے باوجود تم نے ان کی کوئی مدد نہیں کی اس لیے کہ تمھیں مزید حکومت کا موقع فراہم ہو اور اب تم خود عثمان کے قصاص کا شاخسانہ کھڑا کر کے یہ چاہتے ہو کہ حکومت کا تاج ہمیشہ کے لیے اپنے سر پر رکھ لو اور اقتدار کی انگوٹھی کو سدا کے لیے اپنی نجس وناپاک انگلیوں میں پہن لو۔ خدا تمھاری یہ خواہش کبھی پوری نہ کرے[۱]"

مختصر یہ کہ ایک طرف معاویہ کی باغیانہ روش اور مخالفانہ سرگرمیاں ایک خطرناک جنگی محاذ کو جنم دے رہی تھی اور دوسری طرف علوی قاصد جریر ابن عبداللہ شام سے پلٹ کر جب وارد کوفہ ہوئے اور انہوں نے جو حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، ان سے امیر المومنین کو مطلع کیا تو آپ بھی معاویہ کے خلاف عملی اقدام پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ آپ نے مالک بن حبیب کو وادی نخیلہ

[۱] روضتہ الصفاء ج ۲ ص ۲۸۷ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ

سے فوجوں کی فراہمی کا حکم دیا جس کے نتیجے میں کوفہ اور اس کے اطراف سے سمٹ سمٹ کر لوگ علوی پرچم کے نیچے جمع ہونے لگے، یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے مجاہدین کی تعداد اسّی ہزار سے تجاوز کر گئی۔

امیرالمومنین علیہ السلام نے اپنی پیش قدمی کے ابتدائی مراحل میں آٹھ ہزار فوجوں پر مشتمل ایک ہراول دستہ زیاد ابن نصر حارثی کے زیر قیادت اور چار ہزار جانبازوں کا دوسرا دستہ شریح بن ہانی کی سرکردگی میں شام کی جانب روانہ کیا، اور پھر اس مقدمتہ الجیش کی روانگی کے بعد ۵ شوال ۳۶ سنہ ہجری کو خود بھی بقایا لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے۔ حدود کوفہ کے باہر آپ نے نماز ظہر ادا کی اور دیر ابوموسیٰ، قبہ قبین، بابل، دیر کعب، کربلا، ساباط اور انبار وغیرہ سے گزرتے ہوئے رقہ کے اس مقام پر پہنچے جہاں کے لوگ حضرت عثمان کے ہوا خواہوں میں تھے اور اسی مقام پر سماک بن مخرمۃ اسدی بنی اسد کے ۸ سو آدمیوں کو لیے خیمہ زن تھا، یہ لوگ معاویہ کے پاس جانے کے لیے نکلے تھے۔ جب انہوں نے امیرالمومنین کے لشکر کو آتے دیکھا تو دریائے فرات پر بنے ہوئے کشتیوں کے پل کو توڑ دیا تاکہ علوی فوج دریا کو عبور کر کے دوسری طرف نہ آسکے۔ مگر مالک اشتر کی حکمت عملی ٹوٹے ہوئے پل کی کشتیوں کو باہم جوڑ کر پورے لشکر کو دریا کے دوسری طرف اتار دیا۔

امیرالمومنین اپنے لشکر سمیت جب دریا کے اس پار اترے تو یہاں آپ کی ملاقات زیاد اور شریح سے ہوئی جو خشکی کا راستہ طے کر کے اپنے اپنے دستوں کے ساتھ یہاں پہنچ چکے تھے اور پہنچنے کے بعد انھیں یہ اطلاع ملی تھی کہ معاویہ ایک جم غفیر لیے ہوئے فرات کی طرف بڑھ رہا ہے، لہٰذا اس خیال سے کہ کہیں ٹکراؤ نہ ہو جائے یہ لوگ امیرالمومنین کے انتظار میں یہاں ٹھہر گئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے جب اپنے رکنے کی وجہ بیان کی تو امیرالمومنین نے ان کے عذر کو

معقول قرار دیتے ہوئے اس مقام سے انھیں آگے پھر روانہ کر دیا۔ جب یہ لوگ فیصل روم کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ معاویہ کا جرنیل ابوالاعور سلمی شامی فوجوں کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ زیاد ابن نصر حارثی نے ایک خصوصی قاصد کے ذریعہ امیرالمومنین کو اس کی اطلاع دی جس پر آپ نے مالک اشتر کی سپہ سالاری میں ایک بڑا دستہ ابوالاعور سلمی کے عقب میں روانہ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرما دی کہ جنگ میں پہل نہ کی جائے بلکہ جہاں تک ہو سکے سمجھا بجھا کر انھیں اس جنگ سے دست بردار ہونے پر رضامند کیا جائے۔ چنانچہ جب مالک اشتر وہاں پہنچے تو انہوں نے مصالحہ طرز عمل کو نگاہ میں رکھتے ہوئے شامی فوجوں کی پشت پر تھوڑے فاصلے کو چھوڑ کر اپنے خیمے بھی لگا دئے۔ لیکن ابوالاعور نے رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مالک اشتر کے فوجیوں پر شب خوں مارا جس کے نتیجے میں ادھر سے بھی تلواریں نکل آئیں اور کچھ دیر آپس میں جھڑپیں ہوتی رہیں آخر کار ابوالاعور اور اس کے سارے سپاہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ جنگ کی ابتدا ہو چکی تھی صبح ہوتے ہی دونوں طرف سے جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے یہاں تک کہ مالک اشتر نے ابوالاعور کو اپنے مقابلے کے لیے للکارا مگر وہ ان کے مقابلے میں آنے کی ہمت نہ کر سکا اور شام ہوتے ہوتے اپنے لشکر کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ دوسرے دن امیرالمومنین حضرت علی ابن ابیطالب بھی اپنے لشکر کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور مالک اشتر وغیرہ کو اپنے ہمراہ لے کر صفین کی طرف بڑھے جہاں معاویہ نے پہلے ہی سے فوجی مورچے قائم کر رکھے تھے اور دریائے فرات پر قبضہ کر کے گھاٹ پر مسلح پہرہ بٹھا دیا تھا تاکہ آپ کی فوجوں کو پانی میسر نہ آسکے۔

معاویہ کی اس غیر اصولی اور انسانیت سوز حرکت کا پتہ جب امیرالمومنین کو چلا تو آپ نے اپنا نمایندہ بھیجا اور حاکم شام سے پہرہ ہٹانے کو کہا لیکن جب

وہ نہیں مانا تو آپ نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ گھاٹ صاف کر دیں اور پھر ایک ہی جھڑپ میں معاویہ کے قبضہ سے گھاٹ چھین لیا گیا مورخین کا بیان ہے کہ گھاٹ چھیننے والوں میں حضرت امام حسینؑ اور حضرت عباس ابن علیؑ پیش پیش تھے۔ لیکن اس کے باوجود حضرت علیؑ کی کریم النفسی اور اعلیٰ ظرفی نے یہ گوارہ نہ کیا کہ کسی مخلوق خدا پر پانی کو بند رکھا جائے چنانچہ آپ نے یہ اعلان کر دیا کہ کسی پر فرات کا پانی بند نہیں ہے خواہ وہ ہمارا دشمن ہی کیوں نہ ہو"۔

جب یہ مرحلہ سر ہو گیا تو امیرالمومنین نے بشیر ابن عمرو انصاری، سعید بن قیس ہمدانی اور شیث بن ربعی تمیمی کو معاویہ کے پاس بھیجا تاکہ یہ لوگ اسے جنگ کے نشیب و فراز کے بارے میں سمجھائیں اور مصالحت و بیعت پر آمادہ کریں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ہم خون عثمان کو رائیگاں نہیں ہونے دیں گے اور اب فیصلہ صرف تلوار کے ذریعہ ہوگا۔

آخر کار ماہ ذی الحجہ ۳۶ سنہ ہجری کے وسط میں فریقین کے درمیان جنگ کی ٹھن گئی، دونوں طرف کی فوجوں نے میدان سنبھالا اور تیغ زنی کا انفرادی سلسلہ شروع ہو گیا۔ تقریباً دو ہفتہ تک جاری رہنے والی اس لڑائی میں معاویہ کی طرف کے دو سو ساٹھ اور علوی فوج کے نو آدمی کام آئے اس کے بعد جب ماہ محرم الحرام کا چاند نمودار ہوا تو جنگ روک دی گئی اور یکم صفر ۳۷ سنہ ہجری سے پھر دونوں کی طرف کی فوجیں، تلواروں، نیزوں اور تیروں سے مسلح ہو کر میدان میں آترآئیں۔

امیرالمومنین حضرت علی کی طرف سے اہل کوفہ کے سواروں پر مالک اشتر پیادوں پر عمار بن یاسر سپہ سالار مقرر ہوئے۔ نیز اہل بصرہ کے سواروں پر سہل بن حنیف اور پیادوں پر قیس بن سعد کو متعین کیا گیا۔ علم لشکر ہاشم بن عتبہ کے سپرد ہوا اور شام کے میمنہ پر ابن ذی الکلاع اور میسرہ پر حبیب بن مسلمہ، سواروں پر عمرو بن عاص اور پیادوں پر ضحاک بن قیس امیر سپاہ بنائے گئے۔

پہلے دن مالک اشتر اپنے دستہ کے ساتھ میدان کارزار میں اترے اور معاویہ کی طرف سے ان کے مقابلہ کے لیے حبیب بن مسلمہ اپنی فوج کو لے کر سامنے آیا۔ دونوں طرف سے دن بھر تلواریں چلتی رہیں اور نیزوں سے نیزے ٹکراتے رہے، یہاں تک کہ مالک نے معاویہ کے متعدد آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا۔

دوسرے دن سپاہ علوی کے ساتھ ہاشم بن عتبہ میدان میں آئے اور دشمنوں کی صف سے ابوالاعور سواروں اور پیادوں کو لے کر مقابلے میں آیا اور جب دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو سوار، سواروں پر، اور پیادے پیادوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس معرکہ آرائی میں علوی سپاہ کے دو اور معاویہ کے ۲۳ آدمی مقتول ہوئے۔

تیسرے دن امیرالمومنین کی طرف سے عمار بن یاسر اور زیاد بن نضر اپنے اپنے دستوں کے ساتھ میدان میں آئے اور معاویہ کی طرف سے عمرو بن عاص لشکر کثیر لے کر آگے بڑھا۔ عمار یاسر نے فوج مخالف کے پیادوں پر اور زیاد بن نضر نے سواروں پر وہ دلیرانہ حملے کئے کہ پہلے ہی ریلے میں عمرو عاص اپنے سپاہیوں کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا تاہم علوی سرداروں نے اس کے دس آدمیوں کو گرا لیا،

چوتھے دن محمد بن حنفیہ اپنا دستہ لے کر میدان میں اترے اور معاویہ کی طرف سے عبیداللہ بن عمر شامی فوجیں لے کر سامنے آیا۔ گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں علوی فوج کے تین اور شامی فوج کے ۳۶ آدمی مارے گئے۔

پانچویں دن عبداللہ ابن عباس آگے بڑھے اور ادھر سے ولید بن عتبہ اپنے لشکریوں کے ہمراہ میدان میں آیا لیکن وہ علوی جانبازوں کے تیور دیکھ کر جنگ سے پہلے ہی میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

چھٹے دن علوی سپاہ کی طرف قیس بن سعد انصاری اپنے دستے کے

ساتھ میدان وغا میں آئے، ان کا مقابلہ ذوالکلاع اور اس کے دستے سے ہوا اور ایسی سخت جنگ ہوئی کہ چاروں طرف دشمنوں کی لاشیں تڑپنے لگیں اور خون کا سیلاب بہتا ہوا نظر آنے لگا۔ آخر کار رات کے اندھیرے نے دونوں لشکریوں کو جدا کیا اور اس لڑائی میں ایک سو بارہ شامی، نیز علوی فوج کے ۱۵، افراد مقتول ہوئے۔

ساتویں دن مالک اشتر پھر اپنے دستے کے ہمراہ میدان میں نکلے اور ان کے مقابلے میں معاویہ نے حبیب ابن مسلمہ کو کثیر التعداد شامیوں کے ساتھ بھیجا وقت ظہر تک معرکہ کار زار گرم رہا اور معاویہ کے سترہ آدمی مارے گئے"؛

آٹھویں دن امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام خود لشکر کے جلوس میں تلوار سونت کر آگے بڑھے اور اس طرح حملہ کیا کہ میدان کارزار میں ایک زلزلہ سا آگیا۔ آپ صفوں کو چیرتے اور تیروں کی بارش میں تلواروں اور سنانوں کو روکتے ہوئے دونوں صفوں کے درمیان آکر کھڑے ہوگئے اور وہاں سے معاویہ کو للکارا کہ اے بزدل، مسلمانوں کو کیوں کٹواتا ہے؟ خود میرے مقابلے میں نکل اور تلوار سے حکومت کے استحقاق کا فیصلہ کرلے"؛

اس پر عمرو عاص نے معاویہ سے کہا، علیؑ بات تو انصاف کی کہتے ہیں، ہمت کرو اور علی کو زیر کر کے حکومت کا تاج ہمیشہ کے لیے پہن لو۔ لیکن معاویہ یہ کہہ کر اپنے خیمے میں گھس گیا کہ میں تمھارے بھرے میں آکر اپنی جان نہیں گنوا سکتا۔ امیر المومنین نے جب اسے بھاگ کر خیمے میں جاتے دیکھا تو مسکراتے ہوئے خود بھی پلٹ آئے۔ اس دن امیر المومنین نے دشمنوں پر جس بے جگری کے ساتھ حملے کئے اسے اعجازی قوت کا کرشمہ ہی کہا جا سکتا ہے آپ میدان میں جدھر سے گزرتے تھے دشمنوں کی صفیں ابتری اور سراسیمگی

کے عالم میں منتشر ہو جاتی تھیں اور بڑے بڑے سورما آپ کے سامنے آنے سے کتراتے تھے اسی لیے آپ نے بھیس بدل بدل کر متعدد حملے کئے اور نامی وگرامی شامی شمشیر زنوں کو موت کے گھاٹ اتارا"؛

نویں دن فریقین کے اجتماعی حملوں سے میدان کارزار پوری طرح گرم ہو چکا تھا۔ معاویہ کی طرف سے حبیب ابن مسلمہ شامی فوجوں کی قیادت کر رہا تھا، علوی میمنہ عبداللہ ابن بدیل، میسرہ عبداللہ ابن عباس اور قلب لشکر خود امیر المومنین کے زیر کمال تھا۔ دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں، تلواروں سے تلواریں ٹکرا رہی تھیں اور نیزوں سے نیزے لڑ رہے تھے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے آسمان سے خون کی برسات ہو رہی ہے۔

علوی لشکر کا باوقار علم بنی ہمدان کے ہاتھوں میں گردش کر رہا تھا جب ایک علمبردار شہید ہو جاتا تھا تو دوسرا آگے بڑھ کر علم کو سنبھال لیتا تھا۔ چنانچہ کریب ابن شریح، بشرحیل ابن شریح، مرثد ابن شریح، ہبیرہ ابن شریح، عمیر ابن ابن شریح، ندیم ابن بشیر، حارث ابن بشیر اور وہب ابن کریب یہ سب کے سب علمبرداری کے فرائض انجام دیتے ہوئے درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

اس لڑائی کے دوران شامیوں کا زیادہ تر زور علوی میمنہ پر تھا اور ان کے حملے اتنے شدید تھے کہ بہت سے لوگ میمنہ چھوڑ کر ہٹ گئے اور بہت سے لوگوں کے حوصلوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ شامیوں کے نرغے میں گھرے ہوئے عبداللہ ابن بدیل کے ہمراہ علوی فوج کے دو سو ساٹھ آدمی میمنہ پر رہ گئے۔ امیر المومنین نے یہ صورت حال دیکھی تو آپ میسرہ کی طرف بڑھے اور دشمنوں کو تہ تیغ کرتے ہوئے میمنہ کے اس مقام پر پہنچے جہاں شامی چاروں طرف سے عبداللہ کو گھیرے ہوئے تھے۔ آپ نے ایک ہی حملے میں سب کو منتشر کر دیا۔ یہ دیکھ کر

عبداللہ ابن بدیل کا حوصلہ بھی بڑھ گیا، چنانچہ وہ دشمنوں کو تلوار کی باڑھ پر رکھتے ہوئے تیزی سے معاویہ کے خیمے کی طرف لپکے حالانکہ مالک اشتر نے انھیں روکنا چاہا مگر وہ ناکام رہے۔ ادھر معاویہ نے جب بدلے ہوئے تیور کے ساتھ عبداللہ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس نے پتھراؤ کا حکم دے دیا جس سے آپ نڈھال ہو کر گر پڑے اور شامیوں نے ہجوم کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ مالک اشتر نے یہ دیکھا تو وہ بھی بنی مذحج کے جنگجوؤں کو ساتھ لے کر معاویہ کی طرف بڑھے اور اس کے گرد حلقہ بگوش حفاظتی دستوں کو منتشر کرنا شروع کیا جب چار حفاظتی دستے منتشر ہو گئے اور ایک دستہ رہ گیا تو معاویہ نے گھوڑے کی رکابوں میں پاؤں ڈال دئے اور بھاگنے پر آمادہ ہو گیا لیکن عمرو عاص نے تسلی دے کر اسے روک لیا۔

دوسری طرف عمار یاسر اور ہاشم بن عتبہ کے حملوں سے شامیوں کی صفوں میں تلاطم برپا تھا۔ عمار جدھر رخ کرتے تھے صحابہ ہجوم کر کے ان کے ساتھ ہو لیتے تھے اور جب ایک ساتھ مل کر حملہ کرتے تھے تو معاویہ کی صفوں میں تہلکہ مچ جاتا تھا حاکم شام نے جب شجاعت وپیکار کا یہ منظر دیکھا تو اس نے گھبرا کر اپنی تازہ دم فوجیں ان کی طرف جھونک دیں مگر پھر بھی ان کے ثبات قدم کو کوئی جنبش نہ ہوئی حضرت عمار پورے عزم واستقلال کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ ابو عادیہ عامری نے دور سے نیزہ پھینک کر عمار پر اچانک وار کیا جس کی وجہ سے آپ لڑکھڑانے لگے اور ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ابن جون نے تیزی سے آگے بڑھ کر آپ کے سر پر تلوار ماری اور آپ درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے۔

حضرت عمار یاسر کی شہادت سے معاویہ کی فوج میں ہلچل مچ گئی کیونکہ ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے رسول اللہؐ کی اس حدیث کو سن رکھا تھا کہ عمار کو وہ گروہ قتل کرے گا جو باغی اور اسلام سے منحرف ہوگا چنانچہ

ان کی شہادت سے پہلے ذوالکلاع نے عمرو عاص سے اپنا یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ میں عمار کو علیؑ کے ساتھ دیکھ رہا ہوں کہیں ہم لوگ باغی گروہ میں سے تو نہیں ہیں۔ اس پر عمرو عاص نے ذوالکلاع کو یہ فریب کارانہ جواب دیا تھا کہ تم دیکھنا، عمار آخر میں ہم لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے"؛

مگر جب وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے تو باغی گروہ خود بخود بے نقاب ہو گیا اور کسی تاویل کی گنجائش نہیں رہی لیکن اس کے باوجود شامیوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ عمار یاسر کے قتل کی ذمہ داری علیؑ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہی انھیں اپنے ساتھ میدان جنگ میں لے کر آئے تھے۔ امیر المومنین نے یہ سنا تو فرمایا کہ معاویہ اپنی مکاری کی بنا پر رسول اللہ کو بھی حمزہ کا قاتل قرار دے سکتا کیوں کہ وہی انھیں اپنے ساتھ احد کی جنگ میں لے گئے تھے غرض کہ حضرت عمار یاسر کے بعد اس معرکہ میں ابن منذر کے ہاتھوں علوی لشکر کے سپہ سالار وعلمبردار ہاشم بن عتبہ بھی شہید ہو گئے اور علم ان کے فرزند عبداللہ نے سنبھالا"؛

لیلۃ الہریر

جب ایسے ایسے جانباز وجاں نثار ختم ہو چکے تو امیر المومنین نے قبیلہ ہمدان اور ربیعہ کے جواں مردوں سے فرمایا کہ تم لوگ میرے نزدیک زرہ اور نیزہ کے مانند ہو، اٹھو، اور ان باغیوں کو کیفر کردار تک پہنچا دو۔ چنانچہ بارہ ہزار نبرد آزما شمشیر بکف اٹھ کھڑے ہوئے اور دشمنوں کی صفوں میں گھس کر اس طرح حملے کئے کہ شامیوں کے سر تنوں سے جدا ہو ہو کر گھوڑوں کے سموں کی ٹھوکریں کھانے لگے لاشوں کے انبار لگ گئے اور میدان کارزار خون سے لبریز ہو گیا یہاں تک کہ علوی جانبازوں

کا فاتحانہ دباؤ معاویہ کی فوجوں پر بتدریج بڑھتا جا رہا تھا کہ دن اپنی ہولناکیوں کے ساتھ سمٹنے لگا، اور شام کے بھیانک اندھیرے روشنی پر محیط ہونے لگے اور وہ دہشت انگیز و بلاخیز رات شروع ہوئی جسے تاریخ میں "لیلۃ الہریر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس میں تلوار کی جھنکار، نیزوں کی کھنک، تیروں کی سنسناہٹ اور دشمنوں کی چیخ پکار کے علاوہ دوسری کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ امیر المومنین کے باطل شکن نعروں سے ایک طرف علوی جانبازوں کے دلوں میں ہمت و شجاعت کی لہریں دوڑ رہی تھیں تو دوسری طرف شامی لشکر کے چہرے پر خوف و دہشت اور مایوسی کے نقوش ابھر رہے تھے یہاں تک کہ صبح ہوتے ہوتے تیروں سے ان کے ترکش خالی ہو چکے تھے نیزوں کی انیاں ٹوٹ چکی تھیں تلواریں کند ہو گئیں اور شامی مقتولین کی تعداد تیس ہزار سے تجاوز کر گئی۔

دسویں دن جنگ اپنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہی تھی امیر المومنین کے لشکریوں کے دم خم وہی تھے، میمنہ پر مالک اشتر اور میسرہ پر ابن عباس معین تھے اور ان کی طرف سے کیے جانے والے مسلسل حملوں نے شامیوں کو شکست کا آئینہ دکھا کر میدان سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اچانک معاویہ کی طرف سے پانچ سو قرآن نیزوں پر بلند کر کے جیتی ہوئی جنگ کا نقشہ بدل گیا چلتی ہوئی تلواریں رک گئیں اور حاکم شام کے اس شاطرانہ حربے نے اپنے حق میں باطل کے اقتدار کا راستہ ہموار کر لیا حالانکہ امیر المومنین اپنے فوجیوں کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کرتے رہے کہ معاویہ نہ تو اہل قرآن میں سے ہے اور نہ ہی اسلام سے اس کا کوئی تعلق ہے[1]

[1] طبری ج ۶ ص ۲۷، ارشاد ص ۱۴۴

لیکن اس یقین دہانی کے باوجود آپ کے فوجی اس بات پر اڑ گئے کہ ہم قرآن کے سائے میں خوں ریزی نہیں کریں گے اس لیے مجبور ہو کر آپ نے معاویہ کی طرف کا حکم صادر فرما دیا۔ اور پھر رہی سہی بازی اس وقت بالکل ہی پلٹ گئی جب تحکیم کے معاملے میں لوگوں نے معاویہ کی طرف سے عمرو عاص اور حضرت علیؑ کی طرف سے ان کی مرضی کے خلاف ابو موسیٰ اشعری کو حکم مقرر کر کے دومۃ الجندل فیصلہ سنانے کو کہا۔ اس موقع پر ایک معاہدہ بھی عمل میں لایا گیا جس کی اردو عبارت مندرجہ ذیل مضمون پر مشتمل ہے۔

" علی ابن ابیطالب اور معاویہ ابن ابوسفیان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اللہ اور اس کی کتاب کے اس فیصلہ پر عمل کریں گے جو حکمین کی طرف سے ان کے حق میں صادر ہوگا نیز حکمین کے لیے بھی یہ لازم ہوگا کہ کتاب خدا میں جو کچھ ملے وہ اس کی پابندی کریں اور قرآن میں انھیں کوئی ہدایت نظر نہ آئے تو اس سنت رسول پر عمل کیا جائے خواختلافی نہ ہو[1]"

اس معاہدہ سے صاف ظاہر ہے کہ حکمین کو اپنی ذاتی رائے سے فیصلے کا کوئی حق و اختیار نہیں دیا گیا تھا اور شائد اسی لیے امیر المومنین نے بھی ان سے یہ فرمایا تھا کہ تم لوگ اس شرط کے ساتھ حکم ہو کہ کتاب خدا کی رو سے فیصلہ کرو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو تمھیں اپنے کو حکم نہیں سمجھنا چاہیے[2]

اس جنگ میں معاویہ کے ایک لاکھ تیس ہزار کے لشکر میں سے پینتالیس ہزار شامی مارے گئے اور نوے ہزار کی علوی فوج میں سے پچیس ہزار مجاہدین شہید ہوئے[3]

[1] سرگزشت معاویہ بحوالہ طبری حالات صفین۔ [2] طبری ج ۶ ص ۲۸، اسد الغابہ ج ۴ ص ۲۴۶۔ [3] کتاب صفین نصر بن مزاحم المنقری المتوفی ۲۱۲ھ و تاریخ طبری۔

معاویہ کے دو فتنہ پرداز جرنیل عمرو بن عاص اور بسر بن ارطاۃ حیدری تلوار کی زد میں آنے کے بعد بھی اپنی جان بچانے میں اس لیے کامیاب ہو گئے تھے کہ یہ لوگ برہنہ ہو کر زمین پر لیٹ گئے تھے اور علیؑ نے جب اپنا منھ پھیرا تو یہ دونوں بھاگ نکلے تھے۔"

حکمین کا سازشی فیصلہ

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان صفین کے میدان میں جو تحریری معاہدہ ہوا تھا اس کی بنیاد پر حضرت علیؑ نے ۱۳ صفر ۳۷ سنہ ہجری کو اپنے ساتھیوں کے اصرار پر جنگ بندی کا اعلان کر دیا تھا لیکن آپ حکمین کی تقرری سے مطمئن نہیں تھے چنانچہ جب فیصلے کا وقت آیا تو حکمین نے معاہدے میں معین کی گئی شرطوں کی پابندی نہیں کی اور انہوں نے کتاب خدا یا سنت رسول سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ ابو موسیٰ اشعری چونکہ ایک سادہ لوح اور نافہم انسان تھے، نیز انھیں حضرت علیؑ کی ذات سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی، اس لیے عمرو عاص نے انھیں بڑی آسانی سے اپنی مکارانہ سیاست کا شکار بنا لیا اور یہ پٹی پڑھائی کہ ہم اور آپ مل کر دونوں فریق، یعنی حضرت علیؑ اور معاویہ کو ایک ساتھ معزول کر کے مسلمانوں کو یہ اختیار دے دیں کہ وہ جسے بھی چاہیں اپنا خلیفہ از سر نو منتخب کر لیں کیوں کہ ایسا فیصلہ ہونے پر معاویہ اور علیؑ کے مابین جو بھی جھگڑا ہے وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا اور مسلمانوں کو راحت مل جائے گی۔

ابو موسیٰ، عمرو عاص کے اس فریب میں آ گئے اور جب فیصلے کا وقت آیا اور "اذرح" کے مقام پر طرفین کے تمام لوگ جمع ہو گئے تو عمرو عاص نے

ابو موسیٰ سے کہا، آپ چونکہ بزرگ اور مجھ سے افضل ہیں اس لیے پہلے اپنی رائے ظاہر کریں۔ ابو موسیٰ بلا عذر تقریر کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا کہ ہم نے انتہائی غور و فکر کے بعد وہ صورت نکالی ہے جس سے موجودہ افتراق و انتشار کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ ہم علی اور معاویہ دونوں کو خلافت سے معزول کر کے مسلمانوں کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ ان دونوں کے علاوہ جسے چاہیں اپنا خلیفہ چن لیں۔"

یہ کہہ کر ابو موسیٰ جیسے ہی بیٹھے ویسے ہی عمرو عاص نے کھڑے ہو کر کہا کہ بھائیو! آپ حضرات نے ابو موسیٰ کا فیصلہ سن لیا کہ انہوں نے علیؑ کو معزول کر دیا ہے حالانکہ وہ علی ہی کے نمائندے تھے۔ میں معاویہ کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے علی کی معزولی پر ابو موسیٰ کی رائے پر اتفاق کرتا ہوں لیکن معاویہ کو ان کے منصب پر برقرار رکھنے کا اعلان بھی کرتا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ تمام حضرات میرا یہ فیصلہ قبول فرمالیں۔"

یہ سننا تھا کہ ابو موسیٰ برہم ہو گئے اور کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ مسلمانو! عمرو عاص نے میرے ساتھ غداری اور بے ایمانی کی ہے اور طے شدہ باتوں سے منحرف ہو گیا ہے۔ یہ ایک ایسا کتا ہے جو کسی بھی حال میں بھونکنے سے باز نہیں آتا۔ عمرو عاص نے ابو موسیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تیری مثال تو اسی گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں۔

اس کے بعد مجمع میں افراتفری مچ گئی کوئی ابو موسیٰ پر حملہ آور ہوا اور کوئی عمرو عاص پر جھپٹ پڑا جس کے نتیجے میں دونوں زخمی ہوئے اور یہ اجتماع منتشر ہو گیا۔

[1] طبری ج ۶ ص ۵۴

کیا اس سازشی دھاندلی کو کسی باضابطہ فیصلے کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟ اور شائد یہی سبب تھا کہ اس کو فریقین میں سے کسی نے بھی قبول نہیں کیا اور تمام اختلافات اپنی جگہ باقی رہ گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے امیرالمومنین کی جماعت میں انتشار اور بڑھ گیا۔

یہ تھا تحکیم کا مختصر سا خاکہ جس کی اساس قرآن وسنت کو قرار دیا گیا تھا مگر کیا یہ قرآن وسنت کا فیصلہ تھا یا ان فریب کاریوں کا نتیجہ جو دنیا والے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے کام میں لایا کرتے ہیں؟ کاش کہ تاریخ کے ان اوراق کو مستقبل کے لیے مشعل راہ بنایا جائے اور قرآن وسنت کو حصول اقتدار کا ذریعہ نہ بننے دیا جائے۔

جنگ نہروان

اس جنگ کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ تحکیم کی قرارداد کے بعد جب امیرالمومنین کوفہ کی طرف پلٹ رہے تھے تو وہ لوگ جو تحکیم کے منوانے میں پیش پیش تھے یہ کہنے لگے کہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو حکم ٹھہرانا کفر ہے اور امیرالمومنین تحکیم کو مان کر (معاذ اللہ) کافر ہو گئے۔ چنانچہ ان لوگوں نے "لاحکم الاللہ" (حکم اللہ کے لیے مخصوص ہے) کو غلط معنی پہنا کر سیدھے سادے مسلمانوں کو اپنا ہم خیال بنالیا اور امیرالمومنین کا ساتھ چھوڑ کر کوفہ کے قریب "حدوارا" نامی ایک مقام پر خیمہ زن ہو گئے۔

کوفہ پہنچنے کے بعد جب امیرالمومنین علیہ السلام کو ان کی ریشہ دوانیوں کا علم ہوا تو آپ نے صعصعہ ابن صوحان اور زیاد ابن نضر حارثی کو ابن عباس کی قیادت میں ان کی طرف روانہ کیا جنھوں نے سمجھا بجھا کر انھیں منتشر کر دیا۔

جب یہ لوگ ادھر ادھر سے گھوم پھر کے کوفہ پہنچے تو انہوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ حضرت علی نے تحکیم کے معاہدے کو توڑ دیا ہے اور وہ پھر شامیوں سے جنگ پر آمادہ ہیں۔ اور جب امیرالمومنین نے اس کی تردید فرمائی تو یہ لوگ فتنہ انگیزی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور بغداد سے تقریباً ۱۹ کلومیٹر کے فاصلے پر نہر کے نشیبی علاقہ میں (جسے نہروان کہا جاتا ہے) انہوں نے اپنے ڈیرے ڈال دئے اور بال بچوں سمیت وہاں رہنے لگے۔

ادھر حکمین نے جب اپنا سازشی فیصلہ سنایا تو امیرالمومنین علیہ السلام نے اسے مسترد کر دیا اور ایک بار پھر حاکم شام سے جنگ کی تیاریوں اور فوجوں کی فراہمی میں مصروف ہو گئے اور آپ نے خوارج کو بھی تحریر کیا کہ حکمین نے کتاب وسنت سے استفادہ کرنے کے بجائے خواہشات نفسانی کے زیر اثر جو فیصلہ کیا ہے وہ ہمیں منظور نہیں ہے اس لیے ہم نے پھر جنگ کا ارادہ کر لیا ہے تاکہ مکمل طور پر دشمن کو ختم کیا جا سکے لہذا تم لوگوں کو بھی ہمارا ساتھ دینا چاہیے"۔

خوارج نے اس کا جواب امیرالمومنینؑ کو یہ دیا کہ تحکیم کی قرارداد کو مان کر آپ ہمارے نزدیک کافر ہو چکے ہیں۔ اب اگر آپ اپنے کفر کا اقرار کرتے ہوئے توبہ کے لیے تیار ہوں تو ہم بھی آپ کی اس تجویز کے بارے میں سوچیں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کون سا طریقہ اختیار کرنا ہے"۔

اس جواب کے بعد امیرالمومنین علیہ السلام کے لیے اس نتیجے تک پہنچنا آسان ہوگا کہ ان کی سرکشی وگمراہی اپنی حد سے تجاوز کر چکی ہے نیز اب ان سے کسی قسم کی کوئی امید رکھنا بیکار ہے۔ چنانچہ آپ نے انھیں فی الحال نظر انداز کر دیا اور شام کی طرف کوچ کرنے کے لیے وادی نخیلہ میں فوجی کیمپ لگا دئے۔

جب لشکر مرتب ہو چکا تو امیرالمومنین سے کہا گیا کہ لشکریوں کی یہ خواہش ہے کہ پہلے اہل نہروان سے نپٹ لیا جائے پھر شام کی طرف رخ کیا جائے مگر امیرالمومنین نے فرمایا کہ میرے خیال میں ابھی ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے اور پہلے شام کی طرف بڑھنا چاہیئے۔ اس پر لوگوں نے کہا آپ کا حکم سر آنکھوں پر ہے، خواہ ادھر چلیئے یا ادھر ۔ لیکن ابھی لشکر نے حرکت بھی نہ کی تھی کہ خوارج کی شورش انگیزیوں کی خبریں موصول ہونے لگیں اور معلوم ہوا کہ انھوں نے عامل نہروان عبداللہ ابن جناب اور ان کی کنیز کو اس بچے سمیت ذبح کر ڈالا ہے جو شکم میں تھا نیز ان کے علاوہ بنی طے کی تین عورتوں کے ساتھ ام سنان صیداویہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

اس خبر کے بعد امیرالمومنین کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ وہ پہلے اس سرکشی اور غنڈہ گردی کو ختم کریں لہذا آپ نے حاکم شام پر چڑھائی کا ارادہ ملتوی کر کے نہروان کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر خوارج کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ جن لوگوں نے عبداللہ ابن خباب اور بے گناہ عورتوں کو قتل کیا ہے انھیں ہمارے حوالے کر دیا جائے تاکہ ہم ان سے مقتولین کے خون کا قصاص لیں۔ مگر خوارج کی طرف سے قاتلوں کو حوالے کرنے سے انکار کیا گیا اور یہ جواب دیا گیا کہ ہم سب نے مل کے انھیں قتل کیا ہے اور ہمارے نزدیک تم سب لوگوں کا خون بھی مباح ہے۔

لیکن اس جاہلانہ اور سرکشانہ جواب کے بعد بھی امیرالمومنین علیہ السلام نے جنگ میں پہل یا عجلت نہیں کی بلکہ آپ نے انھیں ایک موقع اور دیا، اور وہ یہ کہ آپ نے ابوایوب انصاری کے ذریعہ انھیں امن کا پیغام دیا اور یہ اعلان کرایا کہ تم میں سے جو شخص ہمارے پرچم کے سائے میں آجائے گا یا شرپسندوں سے علیحدہ ہو کر کوفہ یا مدائن کی طرف چلا جائے گا اسے امان دی جائے گی اور

اس سے کسی طرح کی کوئی باس پرس نہیں کی جائے گی"۔

اس اعلان کا اثر یہ ہوا کہ فروہ ابن نوفل اشجعی نے کہا کہ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم کس بنیاد پر امیرالمومنین سے آمادۂ پیکار ہو رہے ہیں، چنانچہ وہ اپنے پانچ سو ساتھیوں کے ساتھ الگ ہو گیا۔ اور پھر اس اقدام کو دیکھ کر دیگر افراد بھی چھوٹے بڑے گروہوں کی شکل میں چھٹنا شروع ہو گئے، یہاں تک کہ طبری کے مطابق ان کی تعداد صرف دو ہزار آٹھ سو اور دیگر مصدقہ روایات کے مطابق چار ہزار رہ گئی۔ لیکن ان کی سرکشی میں کوئی کمی نہیں آئی، حتیٰ کہ یہ لوگ مرنے مارنے پر تل گئے، انھوں نے کمانوں میں تیر جوڑے، نیاموں سے تلواریں نکالیں اور علوی لشکر پر یکبار ٹوٹ پڑے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر امیرالمومنین کے جانبازوں نے بھی تلواریں سونت لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کا سفایا کر دیا۔ صرف ۹، آدمی جان بچانے میں کامیاب ہوئے اس لئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلے تھے۔

لیکن تاریخ کا بیان یہ ہے کہ اس پسپائی کے بعد بھی ان کی فتنہ پردازیاں اور شورش انگیزیاں ختم نہیں ہوئیں۔ اور وہ خواج جو اس جنگ سے دامن کش تھے، یا مختلف مقامات پر روپوش تھے، ہمیشہ امیرالمومنین علیہ السلام کے خلاف سازشوں میں منہمک رہے اور انتشار و پریشانی کا سبب بنتے رہے۔

یہ جنگ ۹، صفر ۳۸ سنہ ہجری کو لڑی تھی۔ اور اس جنگ میں مشہور منافق و خارجی "ذوالثدیہ" بھی مارا گیا، جس کا اصل نام موزج تھا اور چونکہ اسکے ایک ہاتھ کی جگہ لمبا سا پستان تھا اس لئے اسے ذوالثدیہ بھی کہا جاتا ہے"۔

شام پر حملہ ملتوی

نہروان کی مہم سر کرنے کے بعد امیر المومنین علیہ السلام نے جب شام کی طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا تو آپ کے لشکر کے سرداروں نے کہا کہ ہمارے ترکش تیروں سے خالی ہو چکے ہیں، نیزوں کی انیاں ٹوٹ چکی ہیں، اور تلواریں کند ہو چکی ہیں، ہمیں اپنے گھروں کو جانے دیجئے تاکہ کچھ آرام بھی کر لیں اور ہتھیاروں کو بھی درست کر لیں۔ اس کے بعد شامیوں سے لڑنے کے قابل ہو سکیں گے۔ لیکن امیر المومنینؑ نے ان کا یہ عذر قبول نہیں کیا بلکہ یہ حکم دیا کہ وادئ نخیلہ میں سب جمع ہو جائیں اور جب تک میں اجازت نہ دوں کوفہ میں کوئی قدم نہ رکھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظریں بچا کر تھوڑے تھوڑے لوگ خاموشی سے کھسکنے لگے، یہاں تک کہ آپ کے لشکریوں کی تعداد اتنی گھٹ گئی جو شام پر حملہ کرنے کے لئے ناکافی تھی۔

یہ لوگ وہ تھے کہ جو پورے جوش و جذبے کے ساتھ شام پر حملے کے لئے تیار ہوئے تھے لیکن حالات کے تقاضوں کے تحت نہروان گئے، وہاں خوارج سے معرکہ آرائی کی اور فتح یاب ہوئے۔ اس جنگ کے سر ہونے میں دیر نہیں لگی تھی اور مقابلہ بھی زیادہ سے زیادہ چار ہزار خوارج سے تھا۔ پھر یہ عذر کیسا کہ ترکش خالی ہو گئے، نیزے ٹوٹ گئے اور تلواریں کند ہو گئیں ؟ جب کہ کچھ عرصہ پہلے صفین میں مسلسل دس دن گھمسان کی جنگ لڑی گئی اور ایک لاکھ تیس ہزار شامیوں کے مقابلے میں نوے ہزار آدمی تھے لیکن نہ ترکش خالی ہوئے، نہ نیزوں کی انیاں ٹوٹیں اور نہ تلواریں کند ہوئیں۔

بات دراصل یہ تھی کہ نہروان کی جنگ میں علوی سپاہ کے زیادہ تر لوگوں کے دل شکستہ اور ارادے ٹوٹ چکے تھے۔ اس لئے کہ جن چار ہزار خوارج کا صفایا ہوا

ان میں زیادہ تر عراقی اور کچھ بصری تھے اور ان میں سے ہر ایک کا تعلق ان دونوں شہروں کے کسی نہ کسی خاندان سے تھا، نیز امیر المومنین کی جس فوج نے انھیں قتل کیا وہ انھیں لوگوں کے قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی۔ مثلاً عدی بن حاتم نہروان کی جنگ میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھے اور ان کا بیٹا زید خارجیوں کے ساتھ تھا جو قتل کر دیا گیا۔ اسی طرح کتنے ہی چچازاد بھائی اور کتنے ہی قریبی رشتے دار تھے جو ایک دوسرے کے قاتل بنے۔۔۔۔۔ لیکن اس کے باوجود بہرحال سب کے سب انسان اور ان کے دلوں میں بھی رنج و غم کی وہی کیفیتیں تھیں جو ایک انسان کے دل میں بیٹے، بھائی یا دوست کے قتل ہو جانے پر پیدا ہوتی ہیں۔

اور چونکہ نہروان کی جنگ میں خود کوفہ والوں نے کوفہ والوں کو قتل کیا، بصرہ والوں کی جان لی اس لئے ایسی حالت میں اگر دلوں پر رنج و الم کا غبار چھا جائے تو حیرت زدہ نہیں ہونا چاہئے۔

بہرحال جب امیر المومنین کی فوج کے زیادہ تر نخیلہ سے چھپ کر چلے گئے تو آپ بھی باقی ماندہ لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر کوفہ آ گئے اور لوگوں کو از سر نو اہل شام سے جنگ پر آمادہ کرنے کی کوششیں کرتے رہے لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ بہت ہی کم لوگوں نے جنگ پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا اور یہی لوگ حضرت علیؑ کے مخلص شیعہ تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے اس مایوسی کے بعد آپ نے شام پر حملے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

مصر پر معاویہ کا قبضہ

مسئلہ تحکیم کے خاتمہ پر اہل شام نے معاویہ کو اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا۔ چنانچہ اس عملی خلافت کے حصول کے بعد معاویہ نے عمر بن عاص، عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید، بسر بن ارطاۃ، شبرحیل بن السمط، ضحاک بن قیس فہری، ابوالاعور سلمی، اور حمزہ بن

سنان ہمدانی وغیرہ کے ساتھ ایک میٹنگ کی اور اس میں ان لوگوں سے مصر کے بارے میں مشورہ کیا۔ طے پایا کہ مصر پر حملہ کیا جائے اور کامیابی کی صورت میں حکومت عمرو عاص کو دے دی جائے۔ اس لئے کہ عمرو عاص نے معاویہ کے ہاتھ پر بیعت ہی اس شرط کے ساتھ کی تھی کہ مصر کی حکومت ہمیشہ کے لئے اس کے حوالے کر دی جائے گی۔[1]"

چنانچہ مصر کی طرف فوج روانہ کرنے سے پہلے معاویہ نے وہاں کے دو سرداروں مسلمہ بن مخلد انصاری اور معاویہ بن خدیج السکونی کو خطوط تحریر کئے اور اس میں لکھا کہ میں بہت جلد مصر کی طرف ایک فوج بھیجنے والا ہوں، تم لوگ وہاں کے حالات سے مجھے مطلع کرو۔

مسلمہ بن مخلد اور معاویہ بن خدیج دونوں ہی ان لوگوں کے سردار تھے جنھوں نے ابھی تک حضرت علیؑ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی، حالانکہ محمد ابن ابوبکر جو اس وقت مصر کے گورنر تھے ان پر دوبار فوج کشی بھی کر چکے تھے مگر ناکام رہے تھے، ان کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی۔

مسلمہ اور معاویہ بن خدیج کی طرف سے اطمینان بخش جواب ملنے کے بعد معاویہ نے عمرو عاص کی سرکردگی میں چھ ہزار کا لشکر روانہ کیا۔ عمرو عاص نے مصر پہنچتے ہی حضرت علیؑ کے مخالف گروہ کی قیادت بھی سنبھالی اور اپنی طرف سے وہاں کے علوی گورنر محمد بن ابوبکر کو ایک خط لکھا اور اس کے ساتھ ہی ایک خط معاویہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ان کے پاس بھجوایا۔ محمد بن ابوبکر نے یہ دونوں خطوط حضرت علیؑ کے پاس روانہ کر دئے اور مدد کی درخواست کی، نیز انھوں نے عمرو عاص اور

---

[1] ۔ طبری سوم باب ۱۸۔

معاویہ کو ان خطوط کے جو جوابات بھیجے ان میں سخت لہجے کا استعمال بھی کیا۔

امیر المومنین حضرت علیؑ علیہ السلام کو جب محمد بن ابوبکر کا خط جب موصول ہوا تو جواب میں آپ نے انھیں یہ ہدایت دی کہ دشمن کے خلاف وہ بھرپور طاقت کا مظاہرہ کریں، نیز مرکز کی طرف سے انھیں مالی امداد اور فوجی کمک جلد ہی روانہ کر دی جائے گی۔

اس کے بعد امیر المومنین نے لوگوں کو جمع کر کے ایک پر تاثیر خطبہ دیا اور محمد بن ابوبکر کی مدد پر آمادہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ دوسرے دن آپ نے کوفہ اور اس کے اطراف کے سر برآوردہ لوگوں کو طلب کیا اور انھیں غیرت دلائی۔ چنانچہ مالک بن کعب کی قیادت میں دو ہزار مجاہدین کا ایک دستہ مصر جانے پر تیار ہو گیا۔ لیکن یہ دستہ ابھی روانہ ہی ہوا تھا کہ امیر المومنین کے پاس محمد بن ابوبکر کی شکست کی خبر آ گئی۔ چنانچہ آپ نے کعب کے فرزند کو راستے سے ہی واپس بلا لیا اور مصر پر عمرو بن عاص کا قبضہ ہو گیا۔

معاویہ کے قریبی حربے

وہ افراد جو اخلاق و تہذیب سے بیگانے، مذہب کے قید و بند سے آزاد اور سزا و جزا کے تصور سے ناآشنا ہوتے ہیں، انھیں اپنے مطلب براری کے لئے ذرائع کی کمی نہیں ہوتی، وہ ہر منزل میں کامیابی و کامرانی کے راستے نکال لیتے ہیں اور اپنا مقصد پورا کر لیتے ہیں۔ لیکن جہاں انسانی و اسلامی تقاضے سد راہ ہو جاتے ہیں وہاں تدبیروں اور حیلوں کا میدان تنگ اور جولان گاہ عمل کی وسعتیں محدود ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ معاویہ کا نفوذ و تسلط انھیں حیلوں اور تدبیروں کا نتیجہ تھا کہ جن پر عمل پیرا ہونے میں اس کے سامنے کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ نہ

حلال وحرام کا سوال اس کے لئے سدِ راہ ہوتا تھا اور نہ پاداش آخرت کا خوف اسے اس کی مطلق العنانیوں اور بے باکیوں سے روکتا تھا۔ جیسا کہ امام راغب اصفہانی نے اس کی سیرت و کردار کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:۔

"معاویہ کا مطمع نظر یہی تھا کہ جس طرح بن پڑے اپنا اُلّو سیدھا کرے' نہ حلال وحرام سے اسے کوئی واسطہ تھا' نہ دین کی کوئی پروا تھی اور نہ ہی خدا کے قہر و غضب کی کوئی فکر تھی[1]۔"

چنانچہ اس نے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے غلط بیانیوں سے کام لیا۔ اقتدار پردازیوں کے بہانے ڈھونڈھے' مکر فریب کے حربے استعمال کئے اور جب یہ دیکھا کہ حضرت علیؑ علیہ السلام کو جنگ میں الجھائے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی تو طلحہ اور زبیر کو آپ کے خلاف ابھار کر کھڑا کر دیا۔ اور جب اس صورت سے بھی کامیابی نہیں ملی تو شامیوں کو بھڑکا کر صفین کا فتنہ برپا کر دیا۔ اور پھر حضرت عمار یاسر کی شہادت سے اس کا ظلم بے نقاب ہونے لگا تو عوام کو فریب دینے کے لئے کبھی تو یہ کہہ دیا کہ عمار کے قاتل علیؑ ہیں کیونکہ وہی اپنے ساتھ انھیں میدان میں لائے تھے' اور کبھی حدیث پیغمبرؐ میں لفظ فتۂ باغیۃ کی یہ تاویل کی کہ اس کے معنی باغی گروہ کے نہیں ہیں بلکہ طلب کرنے والی جماعت کے ہیں' یعنی عثمان اس گروہ کے ہاتھوں قتل ہوں گے جو عثمان کے قصاص کا طالب ہوگا۔ حالانکہ اس حدیث کا دوسرا ٹکڑا "یدعوھم الی الجنۃ ویدعوننھم الی النار" (یعنی عمار ان کو بہشت کی دعوت دیں گے اور وہ انھیں جہنم کی طرف بلائیں گے) اس تاویل کی کوئی گنجائش پیدا ہی نہیں کرتا۔"

---

[1] محاضرات ص ۲۷۰۔

جب ایسے اوچھے حربوں سے بھی فتح و کامرانی کے آثار نظر نہ آئے تو اس نے قرآن کو نیزوں پر بلند کرنے کا پر فریب حربہ استعمال کیا' حالانکہ اس کی نظروں میں نہ قرآن کا کوئی وزن تھا اور نہ اس کے فیصلہ کی کوئی اہمیت تھی۔ اگر اسے قرآن کا فیصلہ مطلوب ہوتا تو وہ یہ مطالبہ جنگ چھڑنے سے پہلے بھی کر سکتا تھا۔ اور پھر جب اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ عمرو عاص نے ابو موسیٰ کو فریب دے کر اس کے حق میں فیصلہ صادر کیا ہے اور اس کے اس فیصلے قرآن سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہے تو وہ اس فریب کار تحکیم کے فیصلہ پر رضامند نہ ہوتا اور عمرو عاص کو مکاری کی سزا دیتا یا کم از کم تنبیہہ و سرزنش ہی کرتا۔ مگر اس نے تو عمرو عاص کے ان کارناموں کو سراہا اور اس کارکردگی کے بدلے میں اسے مصر کی حکومت دے دی۔

اس کے برعکس امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی سیرت، شریعت و اخلاق کے اعلیٰ معیار کا جیتا جاگتا نمونہ تھی وہ ناسازگار حالات میں بھی حق و صداقت کے تقاضوں کو نظر میں رکھتے تھے اور اپنی پاک و پاکیزہ زندگی کو مکر و فریب کی کثافتوں سے مس نہیں ہونے دیتے تھے۔ حالانکہ وہ چاہتے تو معیاری وسیاسی حربے استعمال کر کے معاویہ کی غلیظ و ذلیل حرکتوں کا جواب بڑے حکیمانہ انداز میں دے سکتے تھے۔ مثلاً اس نے فرات پر پہرہ بٹھا کر پانی روک دیا تھا' تو اس کو اس امر کے جواز میں پیش کیا جا سکتا تھا کہ جب عراقیوں نے فرات پر حملہ کر کے اس کے ہاتھ سے چھین لیا تو معاویہ اور اس کے لشکر پر بھی پانی بند کر دیا جاتا اور اس کے ذریعہ ان کی قوت حرب و ضرب کو مضمحل کر کے انھیں مغلوب بنا لیا جاتا۔ مگر امیر المومنین نے ایسے ننگ انسانیت اقدام سے جس کی کوئی آئین و اخلاق اجازت نہیں دیتا' اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ حالانکہ دنیا والے ایسے حربوں کو دشمن کے مقابلے میں جائز سمجھتے ہیں اور اپنی کامیابی و کامرانی

کے لئے دو رنگی سیاست کو جن تدبیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر امیر المومنین کسی موقع پر فریب کاری اور دو رنگی سیاست کے ذریعہ اپنے اقتدار کے استحکام کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جب لوگوں نے آپ کو مشورے دئے کہ عثمان دور کے عمّالوں کو ان کے عہدوں پر برقرار رہنے دیا جائے اور طلحہ و زبیر کو کوفہ و بصرہ کی امارت دے کر انھیں ہمنوا بنا لیا جائے اور معاویہ کو شام کا اقتدار سونپ کر اس کے دنیاوی تدبیر سے فائدہ اٹھایا جائے تو آپ نے دنیاوی مصلحتوں پر شرعی تقاضوں کو ترجیح دیتے ہوئے انھیں سختی سے جھڑک دیا اور معاویہ کے متعلق صاف صاف لفظوں میں فرمایا۔

"اگر میں معاویہ کو اس کے مقبوضہ علاقوں پر برقرار رہنے دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا قوت بازو بنا رہا ہوں[1]۔"

ظاہر میں لوگ صرف ظاہری کامیابی کو دیکھتے ہیں اور یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ یہ کامیابی کن ذرائع سے حاصل ہوئی ہے۔ وہ شاطرانہ چالوں اور مکارانہ حربوں کے ذریعہ جسے کامیاب و کامراں ہوتے دیکھتے ہیں اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور اسے مدبّر' بافہم' بیدار مغز اور سیاست داں' نیز خدا جانے کیا کیا سمجھنے لگتے ہیں اور جو الٰہی تعلیمات اور اسلامی ہدایات کی پابندی کی وجہ سے چالوں اور ہتھکنڈوں سے دور رہے اور غلط طریقوں سے حاصل کی ہوئی کامیابی پر محرومی کو ترجیح دے اسے وہ سیاست سے ناآشنا اور سوجھ بوجھ کے لحاظ سے کمزور سمجھتے ہیں۔ انھیں اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی کہ وہ یہ سوچیں کہ ایک پابند اصول و شرع

---

[1] استعیاب ج ۱ ص ۲۵۹۔

کی راہ میں کتنی مشکلیں اور رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں کہ جو منزل کامرانی سے انتہائی قریب ہو جانے کے باوجود اس کے قدموں کو آگے بڑھنے سے روک دیتی ہیں۔ کاش یہ وقت اور اقتدار کی پرستش کرنے والے معاویہ کے مکارانہ حربوں اور علیؑ کی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔

جنگ وقتال کا ذمہ دار کون؟

امیر المومنین حضرت علیؑ علیہ السلام اور معاویہ کے درمیان جو جنگ وقتال کی صورت رونما ہوئی اس کی تمام تر ذمہ داریاں معاویہ پر عائد ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ اس نے آپ پر خون عثمان کا غلط الزام عائد کر کے جنگ کے لئے غلط قدم اٹھایا۔ حالانکہ یہ حقیقت اس سے مخفی نہ تھی کہ قتل عثمان کے کیا وجوہ ہیں اور کن لوگوں کے ہاتھوں وہ قتل ہوئے ہیں؟ مگر اسے جنگ کے بغیر اپنے مقصد میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس لئے اس نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے جنگ چھیڑ دی جو سراسر جارحانہ تھی اور جسے کسی صورت سے جواز کے حدود میں نہیں لایا جا سکتا کیونکہ امام وقت کے خلاف بغاوت و سرکشی باتفاق امت حرام ہے۔ چنانچہ امام نودی نے تحریر کیا ہے۔

"حکومت کے معاملات میں فرمانرواؤں سے ٹکر نہ لو اور نہ ان پر اعتراض کرو۔ البتہ تم کو ان میں کوئی ایسی بُرائی نظر آئے جو پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہو اور تم جانتے ہو کہ وہ اصول اسلام کے خلاف ہے تو اسے ان کی بُرائی تصور کرو اور اس کے بارے میں حق بیانی سے کام لو لیکن ان پر خروج کرنا اور ان لوگوں سے جنگ کرنا باجماع امت حرام ہے[1]۔"

---

[1] شرح مسلم نودی ج ۲ ص ۱۲۵۔

عبدالکریم شہرستانی رقم طراز ہیں:۔

"جو شخص اس امام برحق پر خروج کرے جس پر جماعت نے اتفاق کر لیا ہو تو خروج کرنے والا شخص خارجی کہلائے گا۔ خواہ یہ خروج صحابہ کے دور میں ائمہ راشدین پر ہو یا ان کے بعد ان کے تابعین پر ہو۔[۱]

اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں کہ معاویہ کا اقدام بغاوت وسرکشی کا نتیجہ تھا اور کسی باغی کے مظالم کو ختم کرنے کے لئے تلوار اٹھانا کسی طرح آئین امن پسندی و صلح جوئی کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ یہ مظلوم کا ایک قدرتی حق ہے اور اگر اسے اس حق سے محروم کر دیا جائے تو دنیا میں ظلم واستبداد کی روک تھام اور حقوق کی حفاظت کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے۔ اسی لئے قدرت نے باغی کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت دی ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ

(اگر ایک جماعت دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو تم اس زیادتی کرنے والی جماعت سے لڑو، یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف پلٹ آئے)

یہ پہلی حجت تھی کہ جس کی طرف حضرت علیؑ علیہ السلام نے "انتم بحمد اللہ حجۃ" کہہ کر اشارہ دیا تھا اور جو نہج البلاغہ حصہ سوم خطبہ ۱۴ میں محفوظ ہے۔ مگر اس حجت کے تمام ہونے کے باوجود آپ نے اپنی فوج کو دشمن پر ہاتھ اٹھانے یا لڑائی میں پہل کرنے سے روک دیا کیونکہ آپ چاہتے تھے ہماری طرف سے جنگی اقدام کی ابتدا نہ ہو بلکہ صرف دفاع کے لئے تلوار اٹھائی جائے۔ اور جب آپ کی طرف سے کی گئی امن وصلح کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور دشمن نے جنگ کے لئے

---

[۱] الملل والنحل ص ۵۳

قدم اٹھا دیا تو یہ ان پر دوسری حجت تھی، جس کے بعد امیرالمومنینؑ کے آمادۂ جنگ ہونے پر نہ کسی قسم کی کوئی حرف گیری کی جا سکتی ہے اور نہ آپ پر جارحانہ اقدام کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ تعدی کی طغیانیوں کو روکنے کے لئے ایک ایسا فریضہ تھا جسے آپ کو انجام دینا ہی چاہئے تھا اور کھلے لفظوں میں جس کی اجازت اللہ نے بھی دی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:۔

وَاَنْفِقُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ

(جو شخص تم پر جیسی زیادتی کرے تم بھی اس پر ویسی ہی زیادتی کرو اور اللہ سے ڈرو، اور اس بات کو دھیان میں رکھو کہ اللہ پرہیزگاروں کا ساتھی ہے۔)

اس کے علاوہ امیرالمومنینؑ سے صف آرا ہونا پیغمبرؐ اسلام سے صف آرا ہونا ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی ہے کہ "یا علیؑ حربک حربی" اے علیؑ تم سے جنگ کرنا مجھ سے جنگ کرنا ہے" اس کی شاہد ہے۔ تو اس صورت میں جو سزا پیغمبرؐ اسلام سے لڑنے والوں کے لئے تجویز ہوگی وہی سزا حضرت علیؑ سے جنگ وپیکار کرنے والوں کے لئے تجویز کی جائے گی۔ اور پیغمبرؐ سے محاذ آرائی کرنے والوں کے لئے جو سزا قدرت نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے:۔

"جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ پر آمادہ ہوں اور زمین پر فساد برپا کریں، ان کی سزا یہ ہے کہ یا تو وہ قتل کر دئے جائیں، یا انھیں سولی دی جائے یا ان کا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کاٹ دیا جائے، یا انھیں جلا وطن کر دیا جائے تاکہ دنیا میں ان کی رسوائی ہو اور آخرت میں تو ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔"

(قرآن مجید)

اس کے بعد امیرالمومنین نے جنگ کے سلسلے میں جو ہدائتیں دی ہیں کہ کسی

بھاگنے والے کا پیچھا نہ کیا جائے، ہتھیار ڈالنے والوں یا زخمی ہونے والوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، کسی مقتول کی لاش کی بے حرمتی نہ کی جائے، یا کسی کا مال واسباب نہ لوٹا جائے وہ اخلاقی اعتبار سے اس قدر بلند ہیں کہ انھیں اخلاقی قدروں کا اعلیٰ نمونہ اور اسلامی جنگوں کا بلند معیار قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ ہدایتیں صرف قول تک محدود نہ تھیں، بلکہ امیرالمومنین نے خود بھی ان کی سختی سے پابندی کی اور اپنے فوجیوں کو بھی ان ہدایات پر پابند رہنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ جمل کے میدان میں جہاں فوج مخالف کی باگ ڈور ایک عورت کے ہاتھ میں تھی، آپ نے اپنے اصولوں کو نہیں بدلا بلکہ دشمن کی شکست وہزیمت کے بعد اپنی بلند کرداری کا ثبوت دیتے ہوئے آپ نے ام المومنین کو حفاظت کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یقیناً وہی سزا تجویز کرتا جو اس نوعیت کے اقدام کی ہونا چاہئے تھی۔ چنانچہ ابن ابی الحدید کا کہنا ہے کہ:۔

"ام المومنین نے حضرت علیؑ کے ساتھ جو برتاؤ کیا، اگر وہی برتاؤ وہ حضرت عمر کے ساتھ کرتیں اور ان کے خلاف رعیت میں بغاوت پھیلاتیں تو وہ ان پر قابو پانے کے بعد انھیں قتل کر دیتے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔ مگر امیرالمومنین اتنے بردبار وبلند نفس تھے کہ انھوں نے انھیں معاف کر دیا۔[۱]"

مالک اشتر اور محمد بن ابوبکر

مالک بن حارث اشتر، امیرالمومنین حضرت علیؑ علیہ السلام کی نگاہ میں حسن عمل، اخلاق وکردار، حق پرستی وخدا شناسی، اور وفاداری وجاں نثاری

---

[۱] شرح ابن ابی الحدید ج ۴ ص ۲۰۲

کے اس درجہ پر فائز تھے کہ ان کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا:۔ "لقد کان لی مثل ما کنت لرسول اللہ" یعنی مالک میری نظر میں ایسے ہیں جیسا کہ میں رسول اللہ کی نظر میں تھا۔"

مالک اشتر کی مجاہدانہ سرشت میں وہ جذبۂ سرفروشی کارفرما تھا کہ تمام اسلامی مہمات میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اہم ترین جنگی معرکوں میں امیرالمومنین کے دست وبازو بنے رہے۔ شمشیر زنی وصف شکنی کا یہ حال تھا کہ تمام عرب میں آپ کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔"

ان اوصاف وخصوصیات کے علاوہ آپ کے اندر نظم وانصرام مملکت کی بھی بھرپور صلاحتیں موجود تھیں۔ چنانچہ جب مصر میں عثمانی گروہ نے تخریبی جراثیم پھیلانا شروع کئے اور شر وفساد کی آندھیاں ملک کے نظم ونسق کو درہم برہم کرنے لگیں تو وہاں کے لئے امیرالمومنین کو ایک طاقتور حاکم کی ضرورت محسوس ہوئی، حالانکہ مصر کی حکومت پر اس وقت امیرالمومنین کی طرف سے محمد بن ابوبکر حاکم مقرر تھے لیکن شر پسندوں اور فتنہ پردازوں کے مقابلے میں وہ کمزور پڑ رہے تھے۔ لہٰذا بگڑتے ہوئے حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے امیرالمومنین نے مصر کے صوبے پر بحثیت گورنر محمد بن ابوبکر کی جگہ مالک اشتر کی تقرری کا فیصلہ کیا۔

مالک اشتر اس وقت صوبۂ نصیبین کی گورنری پر مامور تھے۔ چنانچہ حضرت علیؑ علیہ السلام نے انھیں ایک مکتوب کے ذریعہ طلب کیا اور وہ شبیب بن عامر ازدی کو اپنے عہدے کا چارج سونپ کر امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

اس کے بعد امیرالمومنین نے مالک اشتر سے مصر کی صورت حال کے بارے

میں گفتگو کی، انھیں انتظامی امور کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور ان کے حق میں حکومت کا پروانہ لکھ کر ایک لشکر کے ساتھ مصر کی طرف روانہ کر دیا۔

معاویہ کو جب اپنے جاسوسوں کے ذریعہ اس تبدیلی کا علم ہوا تو وہ چکرا گیا کیونکہ وہ عمرو عاص سے یہ وعدہ کر چکا تھا کہ اس کی مکارانہ کارگزاریوں اور کارکردگیوں کے صلے میں وہ اسے مصر کی حکومت دے گا۔ مگر اس خبر کے بعد اسے مایوسی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ عمرو عاص، محمد بن ابوبکر کو شکست دے کر اقتدار ان کے ہاتھ سے چھین لے گا۔ لیکن اب مالک اشتر کو مغلوب کر کے مصر پر اقتدار حاصل کر لینا عمرو عاص کے لئے آسان نہیں تھا، چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کہ مالک کے ہاتھوں میں مصر کا اقتدار منتقل ہو، وہ انھیں ٹھکانے لگا دے گا۔

اس اقدام جرم کے لئے معاویہ نے شہر عریش کے ایک تعلقدار کو اپنا ہمنوا بنایا اور اس سے ساز باز کر کے اس بات پر رضامند کیا کہ جب مالک مصر جاتے ہوئے اِدھر سے گزریں تو کسی بہانے سے وہ ان کا کام تمام کر دے۔ اس کے عوض اس کا خراج معاف کر دیا جائے گا۔

چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ جب مالک اشتر اپنے لشکر کے ہمراہ شہر عریش میں داخل ہوئے تو اس تعلقدار نے آپ کا زبردست خیر مقدم کیا اور آپ کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ آپ اس کے یہاں فروکش ہوئے اور جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے شہد کے شربت میں زہر ملا کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ جسے پینے کے بعد تلواروں کے سائے میں کھیلنے والا اور دشمنوں کی صفوں کو الٹنے والا یہ بہادر انسان بڑی آسانی سے موت کی آغوش میں چلا گیا۔

معاویہ کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو وہ اپنی کامیابی پر جھوم اٹھا اور اس کی

زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا کہ شہد بھی اللہ کا ایک لشکر ہے[1]۔"

پھر ایک خطبہ کے دوران اس نے کہا:۔

علیؑ ابن ابیطالب کے دو ہاتھ تھے۔ ایک صفین میں کٹ گیا، وہ عمار یاسر تھے اور دوسرا عریش میں کاٹ دیا گیا، اور وہ مالک اشتر تھے[2]۔"

معاویہ نے ادھر مالک اشتر کو شہید کرایا اور ادھر عمرو عاص کو لکھا کہ اب کسی تاخیر کے بغیر محمد بن ابوبکر پر حملہ کر دو۔ چنانچہ عمرو عاص نے چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ محمد بن ابوبکر پر چڑھائی کر دی۔ آپ نے جم کر مقابلہ کیا اور متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارا لیکن آخر کار شکست کھانے کے بعد گرفتار کر لئے گئے۔

جب معاویہ کو ان کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو اس نے ایک کمینہ خصلت انسان معاویہ ابن خدیج کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ ان کا قصہ پاک کر دے۔ چنانچہ معاویہ ابن خدیج نے محمد بن ابوبکر کو گدھے کی کھال میں سلوا کر زندہ جلا دیا۔

ام المومنین عائشہ اپنے بھائی کی اس المناک موت پر بے حد رنجیدہ اور ملول ہوئیں، یہاں تک کہ وہ جب تک زندہ رہیں معاویہ اور عمرو عاص کے حق میں بد دعا کرتی رہیں[3]۔"

یہ دونوں واقعات صفر ۳۸ سنہ ہجری میں یکے بعد دیگرے رونما ہوئے اور اس دوہری شہادت پر جہاں ایک طرف معاویہ اور اس کے حاشیہ برداروں نے خوشیاں منائیں وہاں دوسری طرف امیر المومنین کو دلی اور قلبی صدمات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مالک اشتر اگر آپ کے جاں نثاروں اور وفاداروں میں تھے تو محمد بن ابوبکر آپ کی آغوش کے پروردہ تھے۔ اس لئے کہ ابوبکر کی وفات کے بعد آپ نے

---

[1] تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۴۱ [2] طبری ج ۶ ص ۵۴ [3] تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۴۳۔

ان کی ماں اسماء بنت عمیس سے عقد فرما لیا تھا۔

۳۹ سنہ ہجری کا قتل عام

۳۹ سنہ ہجری میں طاقت اور اقتدار حاصل کر لینے کے بعد معاویہ نے مظالم اور دہشت گردی کا جو بازار گرم کیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ چنانچہ خود معاویہ ہی کے ایک فوجی جرنیل سفیان بن عوف کا بیان ہے کہ:۔ معاویہ ابن ابوسفیان نے مجھے چھ ہزار پر مشتمل ایک خونخوار لشکر کی قیادت سپرد کرتے ہوئے کہا کہ تم فرات کے کنارے چلتے رہنا، یہاں تک کہ ہیت کو اپنے مقبوضات میں شامل کر کے وہاں قتل عام کرنا اور پھر آگے بڑھ جانا، اگر رستے میں کسی لشکر کا سامنا ہو تو اس پر حملہ کر کے اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لینا۔ ورنہ اور آگے نکل جانا یہاں تک کہ انبار کو تباہ و برباد کرتے ہوئے مدائن پہنچ جانا اور وہاں کے باشندوں پر قہر و غضب کے پہاڑ توڑ دینا۔ یہ حملے عراقیوں میں خوف و دہشت پیدا کریں گے۔ چنانچہ جب لوگ خوفزدہ ہو جائیں تو انھیں میرا ہمنوا بنانے کی کوشش کرنا، اور جو شخص انکار کرے اسے موت کے گھاٹ اتار دینا۔ اور سنو، جس علاقے سے بھی تمہارا گزر ہو اسے پوری طرح تباہ و برباد کرنے کے بعد وہاں کے لوگوں کا مال ضرور لوٹنا، کیونکہ مال کا لوٹنا قتل کے بعد ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ دردناک ہے۔

سفیان کہتا ہے کہ میں نے معاویہ کی ان تمام ہدایتوں پر سختی سے عمل کیا جس کے نتیجے میں میرے ہاتھ سے ڈیڑھ ہزار انسانی جانیں ضائع ہوئیں جن میں مرد، عورت، بوڑھے، بچے اور جوان سبھی شامل تھے، نیز لاتعداد گھر اجڑ گئے، کیونکہ میں جس گاؤں میں گھستا تھا اس میں آگ لگا دیتا تھا[1]۔"

---

[1] سرگزست معاویہ ص ۲۹۶ بحوالہ شرح ابن الحدید ج ۲ ص ۸۵-۸۶۔

عین التمر پر حملہ:۔ معاویہ نے نعمان بن بشیر کو دو ہزار کا لشکر دے کر عین التمر پر حملہ کی غرض سے روانہ کیا جہاں حضرت علیؑ کا اسلحہ خانہ تھا اور کعب بن مالک آپ کی طرف سے امیر تھے۔

چنانچہ نعمان بن بشیر نے جب حملہ کیا تو کعب نے مثالی شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ آپ کے پاس صرف ایک ہزار کا لشکر تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنے لشکریوں کو یہ اجازت دے دی تھی کہ تم میں سے جو شخص جانا چاہتا ہو وہ چلا جائے۔ نتیجے میں صرف سو آدمی رہ گئے تھے جنھوں نے دو ہزار کے لشکر سے مقابلہ جاری رکھا۔ اسی دوران مخنف بن سلیم نے اپنے بیٹے عبد الرحمٰن کو پچاس بزد آزما سواروں کے ساتھ کعب کی مدد کو بھیج دیا جسے دیکھ کر شامی یہ سمجھے کہ کوفہ سے لشکر کی آمد شروع ہو گئی ہے لہٰذا وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس جھڑپ میں طرفین کے تیس ۳۰ آدمی مقتول ہوئے[1]۔

تیما پر حملہ:۔ معاویہ نے عبد اللہ بن مسعد فرازی کو اس کی قوم کے سترہ سو افراد کے ساتھ تیما کی طرف روانہ کیا اور یہ تاکید کر دی کہ جن جن مقامات سے اس کا گزر ہو وہاں کے لوگوں سے زکواۃ وصول کرے۔ اور اگر کوئی انکار کرے تو اسے قتل کر دے اور یہی سلوک مکہ اور مدینہ کے لوگوں کے ساتھ بھی کرے۔ چنانچہ معاویہ کو زکواۃ نہ دینے کے جرم میں اس نے مختلف مقامات کے بیاسی ۸۲ آدمیوں کی گردنیں اڑا دیں[2]۔"

حضرت علیؑ علیہ السلام کو جب یہ افسوس ناک خبر معلوم ہوئی تو آپ نے مسیب بن نخبتہ فزاری کو ایک ہزار کا لشکر دے کر عبد اللہ بن مسعد کی روک تھام کے لئے روانہ کیا۔ تیما میں دونوں کے مابین مڈبھیڑ ہوئی اور تلواریں چلنے لگیں

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۲۹۷ [2] سرگزشت معاویہ ۲۹۸، ۲۹۹

یہاں تک کہ عبداللہ شکست کھا کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے ساتھ ایک قلعہ میں روپوش ہوگیا۔ مسیّب نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور تیسرے دن انھوں نے قلعے کے دروازے میں آگ لگا دی۔ شامی محصورین نے جب دیکھا کہ موت ان سے قریب ہوتی جا رہی ہے تو وہ قلعے کی دیوار پر چڑھ گئے اور پکار کر مسیّب سے کہا کہ ہم لوگ تمہاری ہی قوم کے افراد ہیں اور تم ہمیں ختم کر دینا چاہتے ہو۔ یہ سُن کر مسیّب کو غیرت آئی اور اس نے آگ بجھانے کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد جب رات ہوئی تو انھوں نے اپنے حریف عبداللہ کو ان کے ساتھیوں سمیت وہاں سے نکل جانے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس طرح مسیّب نے قوم پرستی کے جذبہ سے مغلوب ہو کر امیرالمومنین سے غداری کی [۱]"

ثعلبیہ پر حملہ

ضحاک بن قیس کو معاویہ نے پانچ ہزار کا لشکر دے کر ثعلبیہ کی طرف روانہ کیا اور اسے حکم دیا کہ واقصہ کے نشیبی علاقوں سے گزرو اور ان علاقوں میں جتنے بھی دیہات نظر آئیں اور جہاں جہاں علی کے شیعہ آباد ہوں اُنھیں تباہ و برباد کر دو، وہاں کے لوگوں کو قتل کر دو اور سارا اثاثہ لوٹ لو۔ چنانچہ امیرالمومنین کے حامیوں کو تہ تیغ کرتا اور لوٹ مار کرتا ہوا یہ لشکر جدھر سے گزرتا تھا ایک کہرام برپا ہو جاتا تھا۔

حضرت علیؑ علیہ السلام نے اس کے مقابلے پر حجر بن عدی کو چار ہزار لشکر کا امیر بنا کر روانہ کیا۔ "قدمر" کے مقام پر دونوں لشکروں میں مڈبھیڑ ہوئی

---

[۱] سرگزشت معاویہ ص ۲۹۸، ۲۹۹

اور جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے لیکن جب رات کی تاریکی پھیلی تو ضحاک اپنے مقتولین کے انیس [۱۹] لاشے چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ اس کے بعد حجر بھی اپنے دو ساتھیوں سے محروم ہو کر امیرالمومنین کے پاس واپس چلے گئے۔

بسر بن ارطاۃ کی خوں ریزی

معاویہ نے بسر بن ارطاۃ کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ یمن کی طرف اس ہدایت کے تحت روانہ کیا کہ وہ مکہ اور مدینہ کو مسمار و تاراج کرتا ہوا یمن کی طرف پیش قدمی کرے اور جہاں جہاں بھی حضرت علیؑ کے حامی نظر آئیں اُنھیں قتل کر دے۔

چنانچہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتا ہوا بسر جب مدینہ کے حدود میں داخل ہوا تو وہاں کے علوی گورنر ابوایوب انصاری خوفزدہ ہو کر شہر سے باہر نکل گئے جس کی بنا پر اسے کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا حالانکہ مسجد نبوی کے منبر پر کھڑے ہو کر اس نے ایک ایک قبیلے کا نام لے لے کر للکارا لیکن کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس کے مقابلے کے لئے کھڑا ہوتا۔ اس نے اہل مدینہ کا قتل عام کیا، انھیں سولیاں دیں، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے، ان کی آنکھیں نکلوائیں، ان کا مال و اسباب لوٹا، انھیں بے گھر کیا۔ یہاں تک کہ زیادہ تر لوگوں نے جب معاویہ کی بیعت کی تو ان کی جان بخشی ہوئی۔

اہل مدینہ سے "خوف و دہشت کی بیعت" حاصل کرنے کے بعد اس سفاک نے ان مسلمانوں کے مکانوں کو مسمار کرا دیا جو معاویہ کی بیعت سے بچنے کے لئے اِدھر اُدھر روپوش ہو گئے تھے۔

اس کے بعد بسر مکہ گیا اور وہاں قتل و غارت گری اور لوٹ مار سے فارغ

ہو کر یمن کی طرف روانہ ہوا۔ یمن میں عبداللہ بن عباس علوی گورنر تھے انھیں جب اس کی آمد کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ ان تمام واقعات مظالم سے امیرالمومنینؑ کو باخبر کر دیا جائے اور ان کے مشوروں کی بنیاد پر بسر سے نپٹنے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ چنانچہ وہ عجلت میں کوفہ روانہ ہوئے اور اپنی جگہ عبداللہ ابن عبدالمدان کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ لیکن ابھی عبیداللہ ابن عباس کوفہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ بسر نے یمن پر حملہ کر کے وہاں کے قائم مقام گورنر عبداللہ ابن عبدالمدان کو مع ان کے اہل و عیال سمیت قتل کر دیا۔ اس کے بعد یمن میں تاریخ مظالم کا خون آشام باب کھلا اس کی وضاحت کے لئے پتھر کا دل چاہیئے۔ مختصر یہ ہے کہ مکہ، مدینہ اور یمن کے تیس [۳۰] ہزار آدمی بسر کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے گئے [۱]"

جب عبداللہ ابن عباس کے ذریعہ امیرالمومنین علیہ السّلام کو بسر کی اس بربریت کا حال معلوم ہوا تو آپ نے جاریہ ابن قدامہ اور وہب بن مسعود کو فوری طور پر دو ہزار کے لشکر پر سپہ سالار معین کر کے اس کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ ان لوگوں نے ہزاروں عثمانیوں کو تہ تیغ کیا اور بسر مقابلے کی تاب نہ لا کر شام کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

نام رسولؐ سے معاویہ کی عداوت

حضرت رسولؐ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نام سے معاویہ کو کتنی نفرت اور عداوت تھی؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے مندرجہ ذیل روایت کافی ہے۔

---

[۱] سرگزشت معاویہ ص ۳۰۵۔

"مطرب بن مغیرہ بن شعبہ ثقفی سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں اپنے والد کے ہمراہ شام گیا اور وہاں معاویہ سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران میرے والد نے کہا کہ آپ بنی ہاشم پر التفات کیوں نہیں کرتے؟ اس پر معاویہ نے جواب دیا کہ افسوس، بنی تیم میں سے ایک بھائی (ابوبکر) نے حکومت پائی اور حکمراں رہے مگر جب ان کی حکومت ختم ہوئی تو ان کا نام بھی ختم ہوگیا۔ پھر قبیلۂ بنی عدی میں سے ایک بھائی (عمر) کو حکومت کا موقع ملا لیکن حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ان کا نام بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اس کے بعد ہمارے خاندانی بھائی (عثمان) نے شوریٰ کے ذریعہ اقتدار حاصل کیا اور بالآخر انھوں نے اپنے اعمال کی سزا پائی اور قتل کر دئے گئے، اس طرح ان کی ہلاکت کے ساتھ ان کا نام بھی ہلاک ہو گیا اور اب صرف ان کے کاربد کا تذکرہ باقی ہے۔ لیکن ہاشمی بھائی رسولؐ اللہ کا نام پابندی کے ساتھ "اشھدان محمّدالرسول اللہ" کہہ کر پانچوں وقت کی اذانوں میں پکارا جاتا ہے۔ اس نام کے باقی رہنے سے ہمارا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہم اس کوشش کی طرف ملتفت ہیں کہ یہ نام بھی ہمیشہ کے لئے دفن ہو جائے [۱]"

شیعوں پر مظالم

مولوی عبدالوحید خاں اپنی کتاب سرگزشت معاویہ میں رقم طراز ہیں کہ:-

کوفہ میں چونکہ شیعوں کی اکثریت تھی، لہٰذا معاویہ نے زیاد بن سمیہ کو وہاں کا والی بنایا۔ یہ شخص حضرت علیؑ کے عہد میں کوفہ میں رہ چکا تھا اور وہاں

---

[۱] مروج الذہب ج ۲ ص ۱۸۱ مطبوعہ مصر ۱۳۴۶ھ

کے شیعوں سے اچھی طرح واقف تھا، چنانچہ اس نے انھیں چن چن کر قتل کیا، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے، آنکھیں نکالیں اور انھیں کھجوروں کے درختوں پر لٹکا لٹکا کر سولیاں دیں۔ جو لوگ بچ گئے تھے ان کا سارا اثاثہ چھین کر ملک بدر کر دیا۔

معاویہ نے اپنے گورنروں کے نام بھی یہ فرمان جاری کیا تھا کہ جو شخص بھی علیؑ کی محبت کا مجرم قرار پائے اسے مع اس کے اہل و عیال کے قتل کر دو اور اس کے گھر کو تباہ کر دو۔ چنانچہ اس فرمان کے تحت معاویہ کے ظالم و جابر گورنروں نے مجموعی طور پر اٹھاون ہزار شیعوں کو قتل کیا جن میں دس۱۰ ہزار بوڑھے، تیرہ۱۳ ہزار عورتیں، چوبیس۲۴ ہزار جوان اور گیارہ ہزار معصوم بچے شامل تھے۔ اس کے علاوہ کوفہ میں زیاد بن سمیہ نے جن شیعوں کو قتل کیا ان کی تعداد تاریخی شواہد کے مطابق سولہ۱۶ ہزار ہے۔[۱]"

ان افسوسناک واقعات کا اجمالی حال امام محمد باقر علیہ السلام کی زبان سے بھی سنئے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "ہمارے شیعہ ہر شہر میں مارے گئے۔ اور صرف شک و شبہہ کی بنا پر ان کے ہاتھ پیر کاٹے گئے، انھیں درختوں پر لٹکا کر موت کی سزا دی گئی، انھیں آنکھوں سے محروم کیا گیا، انھیں جلا وطن کیا گیا اور ان کے گھروں کو تباہ و برباد کیا گیا، غرض کہ ہر وہ شخص معاویہ کے ظلم کا شکار ہوا جو ہماری جماعت میں تھا۔[۲]"

اس کے علاوہ معاویہ کی ظالمانہ وجابرانہ فطرت و طینت اور اس کے کریہہ المنظر کردار کی آئینہ داری کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ حضرت علیؑ، امام حسنؑ، ام المومنین عائشہ، مالک اشتر، عمار یاسر، محمد بن ابوبکر اور عبدالرحمٰن بن خالد

---

[۱] سرگزشت معاویہ ص ۳۰۷، ۳۰۸۔ [۲] شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۴۳۔۴۴۔

وغیرہ کا مسلم الثبوت قاتل ہے۔"

حضرت علیؑ اور معاویہ کا موقف

حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السّلام اور معاویہ ابن ابوسفیان کے موقف کی نوعیت ابتدا ہی سے کچھ ایسی تھی کہ جس کا قدرتی نتیجہ وہی تھا جو ان دونوں کے درمیان جنگ کی صورت میں سامنے آیا۔

حضرت علیؑ علیہ السّلام اور معاویہ کی کشمکش کو سمجھنے کے لئے ہمیں درج ذیل قابل ذکر تاریخی نکات و قرائن کو نظر میں رکھنا ہوگا۔"

(الف) حالات کی پیچیدگیوں اور باہمی نزاع کے تحت حضرت علیؑ علیہ السّلام کے موقف کا تقاضہ یہی تھا کہ آپ معاویہ پر حملہ آور ہو کر اسے سیاسی میدان سے خارج کر دیتے۔ اس لئے کہ جب حضرت علیؑ علیہ السّلام نے اسلامی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو آپ نے اپنے کاندھوں پر براہ راست یہ ذمہ داری محسوس کی کہ بنی امیہ کی بغاوت کو کچل دیں، کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جو طلقاء یعنی آزاد شدگان کے نام سے مشہور تھے اور جنھوں نے شام کی حکومت پر ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ بنی امیہ کی روش اسلام کے مقابلے میں ہمیشہ مخاصمانہ رہی، یہ لوگ یا تو جان کے خوف سے مسلمان ہوئے تھے یا نفاق کی بنا پر۔ مختصر یہ کہ امت مسلمہ کے بدن سے فتنہ و فساد کے ناسور کا ازالہ حضرت علیؑ کے سامنے بنیادی اہمیت کا حامل اور فوری اقدام کا طالب امر تھا۔

جب آپ نے کوفہ میں اپنے دار الحکومت کی بنیاد رکھی اور عوامی مقبولیت و حمایت حاصل کی تو آپ کا پہلا سیاسی مطمع نظر اس عوامی حمایت کو مضبوط و منظم بنانا تھا۔ تاکہ اس کے بعد معاویہ کے غیر اسلامی اقدامات سے امت مسلمہ کے درمیان

رونما ہونے والے اختلافات کو ختم کیا جا سکے۔

سیاسی تطہیر کے عمل کی منصوبہ بندی کا تقاضہ یہ تھا کہ امیر المومنینؑ علیہ السّلام معاویہ پر حملہ کرنے میں پہل فرماتے، اپنی حامی عوامی قوت کو حرکت میں لاتے اور لوگوں کو حکم دیتے کہ وہ گھر کا گوشہ چھوڑ کر راہ خدا میں نکلیں، تاکہ اس انحرافی بحران سے نپٹا جا سکے جو معاویہ اور بنی امیہ کے ہاتھوں امت مسلمہ کے دو حصوں میں بٹ جانے کی صورت میں ظاہر ہوا تھا اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کا سرحدی علاقہ شام علیٰحدگی پسندوں اور دہشت گردوں کا مرکز بن چکا تھا۔

اس کے برعکس معاویہ کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ خدا کی راہ میں جہاد یا حملہ کرنے کے حق میں نہیں تھا بلکہ اسے صرف اس بات کی فکر لاحق تھی کہ کسی نہ کسی طرح شام کی مملکت اس کے قبضہ میں رہے اور مرکزی حکومت سے شام کی علیٰحدگی کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جائے۔

اس کے علاوہ ہمیں اس عظیم تفاوت کو بھی سمجھنا چاہئے جس سے امیر المومنینؑ اور معاویہ کی پالیسیوں کے درمیان بنیادی فرق واضح ہوتا ہے اور باہمی کشمکش کی نوعیت پر اس کا اثر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ امیر المومنینؑ علیہ السّلام اپنی فوجوں کو محض رضائے الٰہی کی خاطر دشمن پر حملہ آور ہونے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑنے کا حکم دیتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے پیش نظر کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا، کیونکہ شام کی علیٰحدگی سے عراقیوں کے مفاد پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا اور نہ شامیوں سے محض ان کے شامی ہونے کی بنا پر عراقیوں کو کوئی رنجش تھی، وہ تو محض دین اور انسانی تقاضوں کے تحت جنگ کے میدان میں آئے تھے۔ وہ صورت حال کی حقیقت اور اس کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ تھے یہاں تک

کہ اس مشن کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرنے کی منزل پر پہنچ گئے تھے۔

اس کے برعکس معاویہ کے منصوبے میں اس قسم کی فداکاری کو دخل نہ تھا۔ وہ تو بس شامیوں کو آزادی و خود مختاری کا خواب دکھا رہا تھا۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنے لئے مستقبل میں خلافت کا خواہاں تھا۔

ادھر امیر المومنینؑ علیہ السّلام کے جاں نثاروں اور آپ کی قیادت میں لڑنے والوں کی ایک بڑی جماعت بیدار مغز افراد پر مشتمل تھی یہی وہ لوگ تھے جو شروع سے آپ کی آواز پر لبیک کہتے آئے تھے اور اس بات کو اپنی شرعی ذمہ داری سمجھتے تھے کہ علیٰحدگی پسندی کا قلع قمع کر کے بغاوت کی روک تھام کی جائے۔ اسی بنا پر انھوں نے قربانیاں دیں۔ شدید ترین معرکوں میں حصہ لیا اور امیر المومنینؑ کے پیش کردہ اسلامی لائحہ عمل کے لئے مستحسن فداکاری کا مظاہرہ کیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ ایثار و قربانی کا جذبہ ہمیشہ یکساں نہیں رہ سکتا بلکہ امیر المومنینؑ کے ساتھ ان کی وفاداری، اور صورت حال سے آگاہی میں کمی بیشی کے سبب اس جذبے میں بتدریج اضمحلال کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔

البتہ قبائلی سرداروں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ ایک طرف امیر المومنین کی حکومت کے تابع ہونے کی بنا پر اور دوسری طرف شامیوں کے مقابلے میں عراقیوں کی حمایت کے قومی جذبے کے تحت؛ یا اس لئے کہ فتح کی صورت میں انھیں اقتدار اور دولت کے حصول کی امید تھی، جنگ میں شریک ہوئے تھے۔"

ان تمام باتوں کی روشنی میں یہ واضح ہوا کہ جدوجہد، منصوبہ بندی، اور اسباب و محرکات کے درجات کے حوالے سے امیر المومنینؑ علیہ السّلام کا موقف

معاویہ کے موقف سے مختلف تھا۔ کیونکہ امیر المومنینؑ کا موقف اپنے لشکریوں سے اس امر کا متقاضی تھا کہ وہ راہ خدا میں جہاد کے لئے ہجرت کریں۔ اور معاویہ کے موقف کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کے افراد اپنے گھروں میں ہی رہ کر شام کی خود مختاری کی حفاظت پر اکتفا کریں۔ امیر المومنینؑ اور معاویہ کے مقاصد اور مطلوبہ جدو جہد میں گہرے اختلاف کا ان کے متضاد موقف اختیار کرنے میں بڑا دخل تھا۔

(ب) امیر المومنینؑ علیہ السّلام کو اپنی قلمرو میں شامل اسلامی معاشرے میں اندرونی انحراف کا سامنا تھا جو آپ کی حکومت سے قبل کے سیاسی حالات اور پیچیدگیوں کا نتیجہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ علیٰحدگی پسندی اور بغاوت کے ناسور کا صفایا کرنے کی ذمہ داری بھی آپ کے سر تھی اور جس پر آپ کی پوری توجہ مبذول تھی۔ کیونکہ آپ کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس داخلی انحراف کا پوری قوت سے مقابلہ کرتے جس کا عالم اسلام، خصوصاً عراق و حجاز کو سامنا تھا۔ خلاصہ یہ کہ آپ کو دو طرح کی جنگوں کا سامنا تھا۔ ایک جنگ باغیوں اور علیٰحدگی پسندوں کے ساتھ، اور دوسری جنگ اسلامی حکومت کے اندر موجود انحراف کے مقابلے میں تھی۔ جو سابقہ دور کے متعصبانہ سیاسی استبداد کا نتیجہ تھی۔

یہاں تک کہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ کچھ ہی عرصہ بعد اسلامی نظام کی "تجرباتی عمارت" ان منافقین کی زد میں آکر کس طرح منہدم ہونا شروع ہو گئی۔ اس سے پہلے یہ لوگ حکمرانوں کو فریب دے کر با اثر اسلامی مراکز میں گھسنے اور نہایت بے شرمی و منہ زوری کے ساتھ قیادت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حتیٰ کے خلافت اس موروثی حکومت میں تبدیل ہو گئی جس کا کام اعلیٰ اقدار کی ہتکِ حرمت، صالح افراد کا قتل، اموال کی لوٹ مار احکام شریعت و قوانین الٰہیہ کی پامالی سے عبارت تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر امیر المومنینؑ نے اس گمراہ کن صورت حال

سے نپٹنے، غضب شدہ اموال کو واپس لینے، اور غیر اسلامی افکار و نظریات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک بھرپور مہم شروع کرنے کا عزم کیا۔

امیر المومنینؑ کے اقدامات کی زد میں بعض با اثر روساء بھی آتے تھے۔ مثال کے طور پر طلحہ اور زبیر وغیرہ۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ ان دونوں نے انتقام خون عثمان کے بہانے امیر المومنینؑ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے بصرہ میں باغیانہ کارروائی کا منصوبہ تیار کر کے اس پر عمل بھی کیا، لیکن ناکام رہے۔ بہر حال امیر المومنینؑ علیہ السّلام کو اپنی مملکت میں ناسازگار حالات کی وجہ سے ایک سخت اور طویل داخلی جنگ کا سامنا تھا اور مذکورہ افراد کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ علیٰحدگی پسندوں کے ساتھ امیر المومنین کی بیرونی جنگ میں آپ کا ساتھ دیتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔"

ادھر معاویہ کا معاملہ یہ تھا کہ اسے اپنی مملکت میں اصلاحی کارروائی کے لئے داخلی جنگ کا سامنا نہ تھا، بلکہ وہ مال و دولت کے ذریعے لوگوں کے ضمیروں کو خریدنے اور غیر عادلانہ طریقے سے بعض طبقوں کو نوازنے میں اور بعض کو محروم کرنے میں منہمک تھا۔ اسے ٹیکس اور مالیہ ادا کرنے والے کسانوں اور تاجروں پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ ان لوگوں کے ذریعہ حاصل شدہ آمدنی سے معاویہ بعض قبائلی سرداروں کی آتش طمع کو خاموش کرتا تھا تاکہ ان سرداروں کو ہر قسم کی حریت پسندانہ عوامی سرگرمیوں کو کچلنے یا ان کی روک تھام پر آمادہ رکھا جا سکے۔"

یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ شام فوجی کارروائی کے نتیجے میں اسلامی حکومت میں شامل ہوا تھا اور مشہور یہی ہے کہ اسلام یہاں کے لوگوں پر مکمل طور پر اثر انداز نہیں ہوا تھا بلکہ رسمی اور ابتدائی شناخت کی حد تک

ان کے دلوں میں داخل ہوا تھا۔ چنانچہ شامی اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آشنا نہ تھے، اسی لئے یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کے نظریات و رسوم سے متاثر رہے۔ یہاں تک کہ ان کے ذہنی، معاشرتی اور سیاسی حالات، عہد جاہلیت کے حالات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے، اور معاویہ کو بھی ایک طرف سے اپنے اہداف و مقاصد اور دوسری طرف سے شامی معاشرے کے مابین کوئی تضاد نظر نہ آتا تھا، نیز اہل شام اپنی فکری، اقتصادی، سیاسی اور سماجی صورت حال کے لحاظ سے معاویہ کی پالیسیوں کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگی کے لئے آمادہ تھے، اس لئے وہ اپنی جگہ مطمئن تھا کیونکہ اس کا اصل مقصد قیصر و کسریٰ کے طرز پر استبدادی حکومت کا حصول تھا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حقیقی رابطے پر مبنی حکومت کا قیام نہیں۔

جب کہ دوسری طرف امیر المومنینؑ علیہ السّلام کے لائحہ عمل کو پیغمبرؐ کی وفات کے بعد سے ایک شدید انحراف کا مقابلہ کرنا پڑا۔ خلاصہ یہ ہے کہ امیر المومنینؑ کو جن اندرونی مسائل کا سامنا تھا وہ معاویہ کو درپیش نہ تھے۔ شام کا معاشرہ فکری، سیاسی، سماجی اور اقتصادی نکتۂ نظر سے معاویہ کے نظریے کو قبول کرنے پر مکمل طور پر آمادہ تھا جب کہ حضرت علیؑ جس معاشرے میں تھے اس میں آپ کے نظریے کو قبول کرنے کا یارانہ نہ تھا۔

(ج) حصول خلافت، اور معاویہ کے ساتھ جنگ سے پہلے امیر المومنینؑ کو مسلمانوں کی نظر میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ اس حیثیت سے مختلف تھی جو معاویہ کو آپ کے ساتھ (جنگ سے پہلے) حاصل تھی۔ امیر المومنینؑ کو حکومت سنبھالنے سے پہلے مسلمانوں میں بہت کم لوگ رسولؐ کا حقیقی جانشین اور خلیفہ سمجھتے تھے۔ مسلسل گوشہ نشینی، خاموشی اور صبر و تحمل کی وجہ سے مسلمانوں کی نظر میں آپ کی حیثیت ایک ایسے بزرگ صحابی سے زیادہ نہ تھی جس نے رسولؐ کی زندگی اسلام کی راہ میں قابل قدر

خدمات انجام دی ہوں۔

امیر المومنینؑ علیہ السّلام سقیفہ کی ان غیر منصفانہ کارروائیوں کو بھی مسترد کرتے رہے جن کے نتیجے میں فکری و سیاسی لحاظ سے آپ کے قائدانہ منصوبے بے اثر ہو کر رہ گئے اور خلافت کی باگ ڈور استبدادی ہاتھوں میں چلی گئی۔

بہت سے تنگ نظر صحابہ امیر المومنین اور اپنے آپ کے درمیان زیادہ سے زیادہ معمولی فرق کے قائل تھے، ورنہ وہ خود کو امیر المومنینؑ کے مساوی تصور کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح وہ پیغمبرؐ کے اصحاب میں شامل ہیں، اسی طرح امیر المومنینؑ بھی ہیں۔ اگر وہ علم و فضل اور دینی خدمات کے سلسلے میں آپ کی برتری تسلیم کرتے بھی تھے تو محض چند درجات کی حد تک...... زیادہ نہیں۔"

امام علیؑ علیہ السّلام کو لوگوں کی نظروں میں حاصل اس حیثیت کے برعکس، معاویہ کو شامیوں کے درمیان حاصل شدہ حیثیت کی نوعیت کچھ اور تھی۔ اہل شام کسی کو بھی معاویہ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے تھے کیونکہ وہ لوگ معاویہ اور اس کے بھائی یزید کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے جو حضرت ابوبکر کی طرف سے شام کا حاکم تھا اور جب یزید مرا تو اس کا منصب معاویہ کو دیا گیا۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ فیصلہ کوئی مشکل امر نہیں رہ جاتا کہ معاویہ کے بارے میں شامیوں کا نقطۂ نظر، امیر المومنینؑ کے بارے میں اہل مدینہ و عراق کے نقطۂ نظر سے مختلف تھا۔ اور اسی بنا پر امیر المومنینؑ علیہ السّلام کو اپنی زندگی میں مخالفتوں، متضاد نظریات اور اکثر مواقع پر حکم عدولی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جب کہ معاویہ کے اوامر کو اہل شام بسر و چشم قبول کرتے تھے۔

غرض کہ امیر المومنینؑ علیہ السّلام کے خلاف معاویہ کے بے بنیاد دعوے اور مخالفانہ جدوجہد کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ علیؑ نے عثمان بن عفان کے خلاف لوگوں کو

بغاوت پر اکسایا، علیؑ اور ان کے ہمنوا عثمان کے جانی دشمن تھے اس لئے انھوں نے ان کے قتل کا منصوبہ تیار کیا اور ان کے مقتول ہو جانے پر تخت خلافت پر قابض ہو گئے۔

اسی کو بنیاد بنا کر معاویہ مسلسل واویلا مچاتا رہا، جب کہ اس نے اپنے اصل مقصد کو دل کے اندر پنہاں رکھا۔ ہوتے ہوتے اس کی ہٹ دھرمیوں کے نتیجے میں حقیقت لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ جب کہ قتل عثمان کے معاملے میں معاویہ جن لوگوں کی فہرست پیش کر رہا تھا، ان سے کون واقف نہیں تھا۔ مثال کے طور پر محمد ابن ابوبکر، ابوذر غفاری، مالک اشتر، عمار یاسر، محمد بن ابی حذیفہ، اور عبید اللہ بن مسعود وغیرہ حضرت علیؑ کی حکومت کے اہم اراکین تھے۔

عمار یاسر نے خلیفہ کے خلاف کارروائی میں کھل کر حصہ لیا۔ اسی طرح ابوذر نے بھی بر سر عام خلیفہ اور اس کے عمال پر شریعت اسلامیہ کی مخالفت کا الزام عائد کیا اور تونگروں کو مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی سے پرہیز کی ترغیب دی۔ یہاں تک عثمان نے انھیں مدینہ سے نکال دیا اور شام بھیج دیا تاکہ وہ وہاں معاویہ کی نگرانی میں رہیں۔ ابوذر لوگوں کو انقلاب اور بغاوت کی دعوت دیتے تھے۔ ادھر محمد بن ابوبکر اور محمد بن ابی حذیفہ بھی مصر میں اسی قسم کی تبلیغ کرتے رہے۔ نیز کوفہ میں مالک اشتر نے ولولہ انگیز اور آتشیں تقریر کرتے ہوئے عثمانی حکومت پر زبردست تنقید کی اور اس پر مظالم و تشدد کا الزام لگایا۔

ان حقائق کے تحت ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ معاویہ کی جانب سے امیر المومنین پر عائد کردہ یہ غلط الزامات بھی عام اور پست ذہنوں کے لئے قابل قبول تھے، کیونکہ مشاہدات سے قریب تر تھے۔ لیکن امیر المومنینؑ علیہ السّلام کے موقف کی پہچان کے لئے کافی بیدار مغزی اور آگاہی و تفکر کی ضرورت تھی۔

آج ہم معاویہ کی سرشت، طینت، فطرت سے مکمل طور پر آگاہی کے بعد اس پر

تبصرہ کر رہے ہیں۔ اس نے عام الجماعۃ (جس سال صلح حسنؑ کے نتیجے میں اسے پوری حکومت مل گئی) میں سر منبر کہا تھا کہ:-

"میری جنگ تم لوگوں سے اس لئے نہیں تھی کہ تم نمازیں پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو اور نیکوکار بن جاؤ۔ بلکہ میں تم سے صرف اس لئے لڑ رہا تھا کہ میں تمہارا امیر بن جاؤں۔ خدا نے میرا مقصد پورا کیا، حالانکہ تم لوگ ایسا نہیں چاہتے تھے[1]"

آج ہم معاویہ کے بارے میں یہ جانتے ہیں کہ اس نے حجر بن عدی، عمار یاسر، محمد بن ابوبکر، مالک اشتر، عمرو بن حمق، ام المومنین عائشہ اور امام حسنؑ علیہ السّلام کے قتل سے اپنے دامن کردار کو داغدار بنایا، اپنے فاسق و فاجر اور بدکردار بیٹے کو ولی عہد مقرر کیا اور امام حسنؑ کے ساتھ ہونے والے معاہدۂ صلح کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اس نے کہا،

"میں نے حسنؑ کو سبز باغ دکھاتے ہوئے ان کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا اس کی تمام شرطیں میرے پیروں تلے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو پورا نہیں کروں گا[2]"

مختصر یہ کہ آج ہم ان واضح حقائق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں معاویہ کا مطالعہ کرتے ہیں جب کہ وہ تاریخ کا ایک پارینہ حصہ بن چکا ہے۔ لیکن خود معاویہ کے دور کے مسلمان معاویہ کے بارے میں یہ نظریہ نہیں رکھتے تھے کیونکہ وہ مذکورہ حالات و حقائق کا ہماری طرح مطالعہ نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اس دور کے مسلمانوں سے یہ پوچھا جاتا کہ معاویہ کون ہے؟ تو زیادہ سے زیادہ وہ یہی جواب دے سکتے تھے کہ تمام صحابہ میں معاویہ رسول اللہ کے جانشین اور

[1،2] عیان الشیعہ ج ۴ ص ۲۶۔

ابوبکر کے معتمدین میں سے ہے، جنھوں نے اپنی فوج کا سردار بنا کر اسے شام بھیجا تھا۔ اور جو حضرت عمر کے دور میں پوری مملکت شام کا مالک بن گیا، کیونکہ حضرت عمر بھی اسے خاص تقدس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اس اعتبار سے معاویہ کی جو تصویر کشی ہوتی ہے وہ اس معاویہ سے مختلف ہے جسے ہم تاریخی حقائق کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ یہ معاویہ حضرت علیؑ سے خون عثمان کے قصاص کا طالب تھا۔ یہ حضرت علیؑ کو قتل عثمان پر لوگوں کو اکسانے کا ملزم ٹھہراتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت علیؑ، عثمان کے قاتلوں سے قصاص لینے پر قادر ہونے کی صورت میں ان سے قصاص کیوں نہیں لیتے؟ نیز یہ کہ، یہ معاویہ حضرت علیؑ کی خلافت و بیعت سے منحرف اور باغیانہ اقدام کا مجرم نظر آتا ہے اور اس کا غیر اسلامی و غیر شرعی موقف حضرت علیؑ کے اسلامی و شرعی موقف سے بالکل الگ ہے۔"

حضرت علیؑ علیہ السّلام کی شہادت

جنگ صفین کے بعد حکمین کے سازشی فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے حضرت علیؑ علیہ السّلام نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ معاویہ کی سرکشی اور بغاوت کو ختم کرنے کے لئے اس کے خلاف دوبارہ جنگی اقدام بہر حال ضروری ہے۔

چنانچہ اس ارادے کے تحت آپ نے جو فوجی تیاریاں کیں ان کے بارے میں ابن خلدون کا بیان یہ ہے کہ: "معرکۂ صفین کے بعد معاویہ پر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے جو لشکر تیار کیا تھا اس میں چالیس ہزار آزمودہ کار، سترہ ہزار رنگروٹ اور آٹھ ہزار مزدور پیشہ لوگ شامل تھے۔"

مولوی عبدالوحید خاں رقم طراز ہیں کہ: "نہراوان کی جنگ خوارج کی

پسپائی کے بعد حضرت علیؑ معاویہ کی طرف جنگ کے ارادے سے پھر متوجہ ہوئے لیکن کوچ کا وقت آنے سے پہلے ہی ایک خارجی عبدالرحمٰن ابن ملجم کی زہر آلود تلوار نے آپ کا کام تمام کر دیا[1]" علامہ عبدالرزاق تحریر فرماتے ہیں کہ ابن ملجم نے صرف حضرت علیؑ ہی کو قتل نہیں کیا بلکہ تمام امت مسلمہ کو قتل کر ڈالا[2]"

زیادہ تر مورخین کا خیال ہے کہ عبدالرحمٰن ابن ملجم اس خطرناک خارجی تحریک کا سرگرم ممبر تھا جو کسی مضبوط ہاتھ کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ نیز عین اس وقت، جب کہ حضرت علیؑ علیہ السلام حاکم شام پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ ہونے والے تھے، ابن ملجم کا آپ پر قاتلانہ وار اس بات کا حتمی ثبوت ہے کہ اس کی تہ میں کوئی گہری سازش کارفرما تھی۔"

حکیم ثنائی مرحوم نے مناقب مرتضوی میں "حدیقۃ الحقائق" کے حوالے سے واضح طور پر یہ تحریر کیا ہے کہ حضرت علیؑ کے قتل کا انتظام ابن ملجم کے ذریعہ معاویہ نے کیا تھا جس کا اعتراف قاتل نے خود ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ میں نے معاویہ کے کہنے سے علیؑ کو قتل کیا لیکن افسوس کوئی نتیجہ نہ نکلا[3]"

الفاظ کے در و بست میں معمولی فرق کے ساتھ مولوی عبید اللہ امرتسری اور محب الدین طبری کا مشترکہ بیان ہے کہ ابن ملجم جب امیر المومنین پر قاتلانہ حملہ کرنے کی غرض سے وارد کوفہ ہوا تو اس نے وہاں ایک ہزار درہم کی ایک تلوار خریدی اور کئی روز تک اسے زہر میں بجھاتا رہا۔ جب اسے پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ یہ تلوار ایک ہی وار میں حضرت علیؑ کا کام تمام

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ [2] مقدمہ نہج البلاغہ علامہ عبدالرزاق ج ۲ ص ۴۰۷۔ [3] مناقب مرتضوی ص ۲۷۷۔

کرسکتی ہے تو وہ بد بخت آپ کی تلاش میں کوفہ کی گلیوں اور کوچوں کا چکر لگانے لگا۔ اسی اثناء میں اس کی نگاہ ایک خوبصورت اور حسین و جمیل نوجوان عورت پر پڑی جس کا نام قطامہ بنت نخبہ تھا اور جو معاویہ کی رشتہ دار بھی تھی۔

ابن ملجم دیکھتے ہی قطامہ پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا اور اس نے اس سے سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔ قطامہ بھی ایک رنگین مزاج عورت تھی اور اس کے اندر بھی شہوانی خواہشات کا جوالہ مکھی کروٹیں لے رہا تھا لہٰذا دو ہی چار ملاقاتوں میں وہ بھی ابن ملجم کی طرف ملتفت ہو گئی، یہاں تک کہ دونوں کے درمیان عقد کا عہد و پیمان بھی ہو گیا اور مہر کے بارے میں قطامہ نے ابن ملجم کے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ میرا مہر تین ہزار اشرفیوں اور علیؑ ابن ابیطالب کے سر پر مبنی ہوگا کیونکہ انھوں نے اسلامی جنگوں میں میرے باپ دادا اور خاندان والوں کو قتل کیا ہے۔ ابن ملجم نے کہا: مجھے منظور ہے، خدا کی قسم تو نے زر مہر کے ساتھ ایک ایسی چیز طلب کی ہے جس کے لئے میں یہاں بھیجا گیا ہوں۔ مگر تو بھی یہ وعدہ کر کہ اپنے اس عہد و پیمان پر قائم رہے گی اور میرے علاوہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کی خواہش نہیں کرے گی۔ قطامہ نے کہا، اگر تو علیؑ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً میں اپنے کو تیرے ہی تصرف میں دوں گی[1]"

اس معاہدے کے بعد ابن ملجم نے اپنے قاتلانہ منصوبے کو منزل تکمیل تک پہنچانے کی جد و جہد کو اس قدر تیز کر دیا کہ خود اس کے وجود پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور اسی پاگل پن کی حالت میں اس نے امیرالمومنینؑ پر اس وقت تلوار کا وار کیا جب آپ کا سر اقدس سجدۂ معبود میں خم تھا۔ تلوار کے لگتے ہی

---

[1] از جج المطالب ص ۵۳، و تاریخ طبری ج ۴ ص ۵۹۹۔

آسمان سے آواز آئی "الا قتل امیرالمومنینؑ"۔ امیرالمومنین قتل کر دئے گئے۔ اس کے بعد آپ زمین پر لوٹنے لگے، سر کے زخم میں مسجد کی خاک بھرتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے "فزت ورب الکعبۃ"۔ کعبہ کے رب کی قسم میں کامیاب ہوا۔

آپ کو خون میں نہایا ہوا دیکھ کر نمازیوں نے گریہ شروع کیا لیکن آپ نے انھیں تسلی دی اور فرمایا کہ مجھے گھر لے چلو۔ چنانچہ حضرت امام حسنؑ، امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ نے آپ کو ایک گلیم میں ڈال کر گھر پہنچایا۔ ایک روایت میں ہے کہ جب آپ صحن خانہ میں پہنچے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور صبح کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے صبح صادق! تو گواہ رہنا کہ میں نے کبھی نماز قضا نہیں کی اور نہ ہی شریعت کے خلاف کوئی فعل مجھ سے سرزد ہوا ہے"۔

تاریخ احمدی میں ہے کہ کوئی علاج کارگر نہ ہوا اور آپ کی وفات کا وقت آ پہنچا[1] قاضی محمد سلیمان پٹیالوی کا بیان ہے کہ کیشر ابن عمر و سکونی نے، جو شاہان ایران کا طبیب خاص رہ چکا تھا، زخم کو دیکھ کر بتایا کہ قاتل کی تلوار نے کاسہ سر کو توڑ کر دماغ کی رگوں کو کاٹ دیا ہے لہٰذا اب جانبری کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے[2]۔

ابن اثیر نے لکھا ہے کہ انتقال کے وقت آپ نے جو وصیتیں فرمائیں وہ تقویٰ، پرہیزگاری، صلۂ رحمی اور عبادت الٰہی سے متعلق تھیں۔ دیگر مورخین نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے اپنے سب بیٹوں کو بلا کر حسنینؑ کی اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا اور امر خلافت امام حسنؑ علیہ السّلام کے سپرد فرمایا۔

"جامع عباسی" میں مرقوم ہے کہ آپ ماہ رمضان کی اکیسویں شب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اسی شب کو حضرت عیسیٰؑ آسمان پر اٹھائے گئے، حضرت موسیٰ نے رحلت کی اور یوشع بن نون نے وفات پائی[3]"

---

[1] تاریخ احمدی ص ۲۱۲۔ [2] کتاب رحمت اللعالمین ص ۱۸۔ [3] جامع عباسی ص ۵۹

ابن قتیبہ اور شیخ مفید علیہ الرحمہ نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ اور عبداللہ بن جعفر نے آپ کے جسد اقدس کو غسل دیا اور محمد بن حنفیہ نے پانی ڈالنے میں ان کی مدد کی۔ یہ روایت بھی ہے کہ جس جگہ آپ کو غسل دیا گیا وہاں حضرت نوح کی بیٹی کا گھر تھا۔

غسل و کفن کے بعد امام حسنؑ علیہ السّلام نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی اور آپ تاروں کی چھاؤں میں نجف اشرف کی سرزمین پر دفن کر دئے گئے۔ مولوی عبدالوحید خاں رقم طراز ہیں کہ آپ کا جنازہ جس وقت تدفین کے لئے لے جایا جا رہا تھا اس وقت جنازے کے تابوت کو سرہانے کی طرف سے فرشتے اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ نیز آپ کی قبر حضرت نوحؑ کی بنائی ہوئی تھی جو جنازہ پہنچتے ہی خود بخود ظاہر ہو گئی تھی لیکن بنی امیہ کے مظالم کی وجہ سے پھر پوشیدہ کر دیا تھا، یہاں تک کہ چوتھی صدی ہجری میں اس قبر مطہر کا ایک قبہ اپنے آپ نمودار ہوا جس کی پیشانی پر "امیرالمومنینؑ" لکھا ہوا تھا۔

مولوی عبداللہ امرتسری کا بیان ہے کہ ماہ رمضان کی جس شب میں آپ کی شہادت واقع ہوئی اس کی صبح کو بیت المقدس کا جو پتھر ہٹتا تھا اس کے نیچے سے خون تازہ برآمد ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ امیرالمومنین کے سر اقدس پر ضربت لگنے کا المناک واقعہ ماہ رمضان سنہ ۴۰ ہجری کی اٹھارویں شب گزر کر نماز صبح کے وقت مسجد کوفہ میں پیش آیا۔ اور اس وقت آپ کی عمر ۶۳ سال کی تھی۔"

جرم کی پردہ پوشی

امیرالمومنینؑ علیہ السّلام کی شہادت کے بعد جب لوگوں پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ آپ کے قتل کا منصوبہ ابن ملجم سے ساز باز کر کے معاویہ نے تیار کیا

تھا اور وہی آپ کا اصل قاتل ہے تو اسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ بدنامی اور رسوائی کے اس داغ کو کسی طرح اپنے دامن سے مٹا دینا چاہئے۔ چنانچہ امام حسنؑ کی حکومت سے دستبرداری کے بعد جب شام کی سرزمین پر حدیث سازی و روایت طرازی کا سیلاب آیا تو معاویہ کی مکارانہ فطرت نے اپنے زرخرید راویوں کے ذریعہ منجملہ دیگر ہزاروں من گھڑت روایات کے اس روایت کو بھی جنم دیا کہ حضرت علیؑ کے قتل کا منصوبہ دراصل خارجیوں نے تیار کیا تھا اور اس منصوبے میں یہ بھی تھا کہ حضرت علیؑ کے ساتھ ہی معاویہ اور عمرو عاص کو بھی ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن ابن ملجم حضرت علیؑ کے قتل پر، برک ابن عبداللہ معاویہ کے قتل پر اور عمرو بن بکر تمیمی عمرو عاص کے قتل پر مامور ہوئے اور یہ تینوں اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

عمرو عاص قاتل مصر پہنچا اور اس نے وہاں اپنا کام انجام دیا۔ لیکن بعد میں یہ معلوم ہوا کہ جس آدمی کو اس نے قتل کیا ہے وہ عمرو عاص نہیں تھا بلکہ اسی کا ہم شکل ایک دوسرا شخص تھا جو اس دن عمرو عاص کی جگہ نماز پڑھانے آیا تھا۔ معاویہ کے قاتل نے دمشق پہنچ کر ماہ رمضان کی سترہ تاریخ کو اس پر حملہ کیا لیکن وار اتنا اوچھا تھا کہ مقام غلاظت کے پیچھے ابھری ہوئی سطح پر ایک ہلکی سی خراش آ کر رہ گئی۔ مگر علیؑ کے قاتل نے اپنے کام کو اس طرح انجام دیا کہ آپ شہید ہو گئے۔

اگر اس موضوعہ روایت پر غور و فکر کی ہلکی سی نظر ڈالی جائے تو اس کا اندازہ خود ہی بتاتا ہے کہ یہ من گھڑت ہے اور معاویہ کے جرم کو چھپانے کی غرض سے وضع کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ درایت کی میزان میں بھی اس مضحکہ خیز روایت کا نہ تو کوئی وزن ہے نہ ہی کوئی اہمیت ہے لیکن اس کے باوجود معاویہ نواز مورخین نے اسے تبرک سمجھ کر اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے۔

حضرت امام حسنؑ علیہ السّلام کی بیعت

امیر المومنینؑ علیہ السّلام کی تکفین و تدفین کے بعد عبد اللہ ابن عباس کی تحریک پر قیس ابن سعد ابن عبادہ انصاری نے حضرت امام حسنؑ علیہ السّلام کے ہاتھ پر سب سے پہلے بیعت کی۔ ان کے بعد تمام حاضرین نے بیعت کی جن کی تعداد بقول ابن اثیر چالیس ہزار تھی۔

جب بیعت کا سلسلہ ختم ہوا تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور ایک نصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے بعد آپ نے بارہ اماموں کی خلافت کا ذکر کیا اور یہ وضاحت فرمائی کہ ہم میں سے ہر ایک تلوار یا زہر سے شہید ہوگا۔

اس کے بعد اسی دن آپ نے اپنے معتمدین کے ساتھ بیٹھ کر عراق، ایران، خراسان، حجاز، یمن اور بصرہ کے عمال کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور بصرہ پر عبد اللہ ابن عباس کو حاکم قرار دیا۔

معاویہ کو جب معلوم ہوا کہ ابن عباس بصرہ کے حاکم بنا دئے گئے ہیں تو اس نے اپنے دو جاسوسوں کو اس ہدایت کے ساتھ بصرہ کی طرف روانہ کیا کہ وہ وہاں جاکر امام حسنؑ کے خلاف لوگوں کو بھڑکائیں اور میری اطاعت پر آمادہ کریں۔ لیکن دونوں جاسوس گرفتار کر لئے گئے اور یہ پتہ چلنے پر کہ وہ معاویہ کی طرف سے امام حسنؑ کے خلاف جاسوسی، نیز لوگوں کو بھڑکانے پر مامور کئے گئے ہیں، انھیں قتل کر دیا گیا۔

پیچیدہ حالات

حضرت امام حسنؑ علیہ السّلام پر جس وقت خلافت کی ذمہ داری عائد ہوئی اس وقت حالات انتہائی سنگین اور پر آشوب تھے۔ حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت کی دھاک پورے عرب میں بیٹھی ہوئی تھی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی اچانک شہادت سے سوئے ہوئے فتنے پھر سے بیدار ہو گئے تھے۔ اور تمام مملکت اسلامیہ میں سازشوں کی کھچڑی پک رہی تھی۔ خود کوفہ میں اشعث ابن قیس، عمرو بن حریث اور شبیث ابن ربعی وغیرہ معاویہ کے ہاتھوں بکے ہوئے تھے۔

معاویہ نے شہر شہر، قریہ قریہ اپنے جاسوسوں کو چھوڑ رکھا تھا جو مسلمانوں میں اختلاف پیدا کر کے انھیں امام کے خلاف بغاوت و نافرمانی پر آمادہ کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے کوفہ کے بڑے بڑے سرداروں سے سازشی ملاقاتیں کر کے اور انھیں بڑی بڑی رقمیں دے کر توڑ لیا تھا جو بظاہر امام حسنؑ علیہ السّلام سے ملے رہتے تھے اور در پردہ معاویہ کے لئے کام کرتے تھے۔

معاویہ نے عمرو بن حریث، حجر ابن الجر، اشعث بن قیس اور شبث ابن ربعی کو ایک خط کے ذریعہ یہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ اگر تم لوگ کسی طرح امام حسنؑ کو قتل کرا دو تو تمہارا یہ احسان میری گردن پر ہوگا اور جو شخص اس کام کو انجام دے گا اسے میں دو لاکھ درہم نقد دوں گا، فوج کی سرداری عطا کر دوں گا اور اپنی کسی لڑکی سے اس کی شادی کر دوں گا۔

یہ تھے وہ پیچیدہ حالات جن کے مابین امام حسن علیہ السّلام نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔

امام حسن علیہ السّلام کی حکومت و مقاصد کا تاریخی و سیاسی تجزیہ

امام حسنؑ ابن علیؑ علیہ السّلام نے اپنی حکومت کی ابتدا ایسے لوگوں کے ساتھ کی جو جہاد کے مقاصد پر مکمل ایمان نہ رکھتے تھے اور دینی و اسلامی نقطۂ نظر سے جنگ کے شرعی تقاضوں سے ہم آہنگی کی صلاحیتیں ان میں نہیں تھیں۔ نیز، اس وقت اسلامی معاشرہ چار حصوں میں بٹا ہوا تھا۔

اموی گروہ:۔ یہ گروہ ایسے سرکش و با اثر افراد پر مشتمل تھا جن کا اثر و نفوذ انتہائی قوی تھا اور تعداد کے لحاظ سے بھی یہ لوگ بہت زیادہ تھے۔ یہ امام حسنؑ کے حامیوں میں گھس کر معاویہ کے لئے کام کرتے تھے۔ یا یوں سمجھئے کہ امام کی حرکات و سکنات سے معاویہ کو مطلع کرنے کے لئے جاسوسی کا کام انجام دیتے تھے۔"

خوارج:۔ یہ جنگ کے حامی تھے۔ یہاں تک کہ بیعت کرتے وقت انھوں نے امام کے سامنے گمراہوں اور باغیوں سے جنگ کی شرط بھی رکھی تھی اور جب امام نے ان کی اس شرط کو منظور نہیں کیا تو کبیدہ خاطر ہو کر ان لوگوں نے امام حسینؑ علیہ السّلام کی بیعت کرنا چاہی، مگر حسینؑ نے یہ کہہ کر انھیں سختی سے جھڑک دیا کہ "خدا نہ کرے کہ میں اپنے بڑے بھائی حسنؑ کی زندگی میں تم لوگوں سے بیعت لوں"۔ یہ جواب سن کر یہ لوگ امام حسنؑ علیہ السّلام کی طرف پھر پلٹے۔ اور بربنائے مصلحت و مجبوری ان کی بیعت اس طرح کی، جس طرح معاویہ اور اس کے باپ ابوسفیان نے فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ کی بیعت کی تھی۔

اس کے اس گروہ کے لوگ آزاد ہو گئے تھے اور مستقبل میں امام حسنؑ علیہ السّلام کی پالیسیوں کے خلاف خطرناک سازشوں کا جال بچھانے میں معاویہ کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔[1]

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۲۶۲۔

متذبذبین:۔ ان کا شمار خوارج میں نہیں تھا بلکہ یہ لوگ خارجیوں سے متاثر تھے۔ یعنی یہ ایسے متذبذب لوگ تھے جو نہ اِدھر کے تھے اور نہ اُدھر کے تھے۔ نیز ان کی فطرت پر راہ فرار اختیار کرنے کا غلبہ بھی تھا۔

الحمراء:۔ یہ لوگ زیاد کے سپاہی تھے اور ان کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ ہوا کے رُخ پر چلتے تھے اور فاتح و غالب گروہ کے ساتھ مل کر جنگ کے میدان میں جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ اس دور میں ان کی اہمیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ یہ کوفہ کو اپنی طرف نسبت دے کر اسے کوفۃ الحمراء کہتے تھے۔

ان سارے گروہوں کے مقابلے میں امام حسنؑ کے پیروکار صرف وہ لوگ تھے جنھوں نے حضرت علیؑ کی شہادت کے فوراً بعد آپ کے ہاتھوں پر بیعت کی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کوفہ میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی لیکن ان کے مخالفین ان کے تمام منصوبوں کو ناکام بنانے کے لئے سازشوں اور فتنہ پردازیوں میں لگے رہتے تھے۔

دوسرے یہ کہ امام حسنؑ علیہ السّلام اور آپ کے پدر بزرگوار حضرت علیؑ علیہ السّلام کی حیثیتوں میں تاریخی تفاوت بھی تھا۔ یہاں تاریخی تفاوت سے مراد لوگوں کے ذہنوں میں ان دونوں ہستیوں کی حیثیتوں میں پایا جانے والا فرق ہے۔ ورنہ خدا کے نزدیک دونوں پاکیزہ ہستیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں، کیونکہ دونوں ہی معصوم ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس دور میں سوائے مٹھی بھر لوگوں کے باقی مسلمان امامت کے منصوص من اللہ ہونے پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے ان کا رویّہ امام حسنؑ علیہ السلام کے ساتھ ایک ایسے امام کے مانند تھا جس کی اطاعت اللہ کی جانب سے فرض اور امامت خدا کی جانب سے تصریح شدہ ہو۔ بلکہ ان کے

نزدیک آپ کی حیثیت عام خلیفہ کی سی تھی جو سقیفائی خلافت کی ایک کڑی ہو۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں کی نظر میں امیر المومنین علیہ السّلام کو جو تاریخی حیثیت حاصل تھی وہ امام حسنؑ علیہ السّلام کو حاصل نہیں تھی۔"

تیسرے یہ کہ آپ نے اپنے پدر بزرگوار کی شہادت کے بعد خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی اس وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جنگ کی مقصدیت کے بارے میں شکوک و شبہات کو تقویت ملی اور یہ لوگ سوچنے لگے کہ یہ جنگ دو خاندانوں کی باہمی جنگ ہے نہ کہ ایک اصولی، بامقصد اور نظریاتی جنگ ہے۔

ان اسباب و حالات نے حکومت کے بارے میں امام حسنؑ علیہ السّلام کی پالیسیوں کو مشکلات اور پیچیدگی سے دوچار کر دیا۔ اور انھیں اسباب کی بنا پر آپ کے سامنے چار ممکنہ راستے تھے جن میں سے ایک پر آپ کو گامزن ہونا تھا۔ پانچواں راستہ کوئی نہ تھا۔

(الف) پہلا راستہ یہ تھا کہ آپ بااثر افراد کو مال و دولت اور اقتدار و منصب کے وعدوں سے اپنی طرف مائل کرتے۔ جیسا کہ کچھ لوگوں نے آپ کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ لوگوں کے ضمیروں کو خرید لیجئے۔ لیکن یہ کہہ کر آپ نے انکار کر دیا تھا کہ میں ظلم کے سہارے کامیابی نہیں چاہتا۔ خدا کی قسم ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

(ب) دوسرا راستہ یہ تھا کہ آپ ابتدا ہی سے صلح کے حامی ہوتے، خصوصاً ان حالات میں جب کہ امت عیش و آرام کی زندگی گزارنے کی طالب تھی اور قوم روساء معاویہ کے ساتھ ساز باز میں لگے ہوئے تھے۔

آخر کار امام حسنؑ علیہ السّلام نے ان دونوں راستوں کو قابل عمل نہیں سمجھا کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں کسی مثبت نتیجے کی امید آپ کو نہیں تھی۔

(ج) آپ کے سامنے تیسرا راستہ یہ تھا کہ آپ ایسی بے نتیجہ جنگ لڑتے

جس میں آپ اور آپ کے تمام اصحاب شہید ہو جاتے۔"

(د) چوتھا راستہ یہ تھا کہ آپ حقیقی اور اسلامی پالیسیوں پر تاریخ کی مہر ثبت کر دیتے نیز حق سے منحرف ہونے والوں کو دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کے لئے ممکنہ وقت تک جنگ کو طول دینے کے بعد صلح کر لیتے۔

اس منزل میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ایسی جنگ سے کوئی نتیجہ برآمد ہوتا؟ اس سے دور کے اسلامی معاشرے میں کوئی مثبت تبدیلی آتی؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اس بے نتیجہ اور مایوس کن جنگ سے فائدہ نہ ہوتا۔ اس لئے کہ لوگ جنگ کے معاملے میں شکوک و شبہات کا شکار تھے۔

اسی بنا پر بہت سے مورخین نے امام حسن علیہ السّلام پر یہ بے بنیاد الزام عائد کیا ہے کہ آپ نے اپنے آرام و سکون کی خاطر معاویہ سے صلح کر کے پست ہمتی کا ثبوت دیا ہے اور اپنے حق سے چشم پوشی کی ہے۔ اس جاہلانہ بہتان کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ ایک بے نتیجہ جنگ کے موقف پر امام حسنؑ علیہ السّلام کا قائم رہنا لوگوں کی نظروں میں عبدالملک کے ساتھ عبداللہ ابن زبیر والی جنگ کے مترادف ہوتا جس میں وہ اور اس کے تمام قریبی ساتھی کام آگئے۔

اس مقام پر ہم یہ سوال کریں گے کہ کیا کسی مسلمان نے ابن زبیر کے بارے میں سوچا؟ اور کیا اس جنگ کا اسلام کے حق میں کوئی مثبت نتیجہ نکلا؟ یا یہ جنگ ایک اور مصیبت کا پیش خیمہ بنی؟ جواب یہ ہے کہ کسی نے بھی اس کے بارے میں غور نہیں کیا، کیونکہ اس کے متعلق لوگ ایک واضح نظریہ رکھتے تھے۔ ان کی نظر میں عبداللہ ابن زبیر نے ذاتی اقتدار کے حصول کے لئے عبدالملک بن مروان سے جنگ کی تھی جس کا مقصد اسلام کا تحفظ نہیں تھا اور نہ ہی بنی امیہ کی منحرف حکومت کی اصلاح پیش نظر تھی۔"

امام حسنؑ علیہ السّلام کے زمانے میں اسی قسم کا شک لوگوں کو آپ کے بارے میں تھا۔ متعدد تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حسنؑ علیہ السّلام اپنی اس صورتحال کے بارے میں بخوبی واقف تھے اور آپ کو یقین تھا کہ معاویہ کے ساتھ جنگ جاری رکھنے میں کامیابی کا امکان نہیں ہے کیونکہ موجودہ معاشرہ ذہنی شکوک اور غیر یقینی کیفیت کا شکار ہے۔ امام حسنؑ علیہ السّلام کے تاریخی بیانات نے آپ کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اس امر کو بھی ظاہر کیا کہ آپ نے کس طرح اپنے اصحاب کے ساتھ موجودہ پیچیدہ مسائل کا آگاہی کے ساتھ معالجہ کیا اور دشمن کے مقابلے میں کیسی پالیسی اپنائی۔ امام علیہ السّلام کے موثر سیاسی بیان میں ہم حالات کی تلخی اور لوگوں کی بے وفائی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور آپ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ہر لفظ سے اس برحق موقف کا پتہ چلتا ہے جس پر آپ یقین رکھتے تھے۔ جیسا کہ آپ کا ارشاد ہے کہ:۔

میں نے اہل کوفہ اور ان کی متلون مزاجی کو خوب سمجھا ہے۔ یہ لوگ میرے کسی کام نہیں آ سکتے، ان میں وفا کی جھلک تک نہیں ہے اور نہ ہی ان کے قول و فعل کا کوئی اعتبار ہے۔ یہ لوگ افتراق و انتشار کا شکار ہیں۔ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تلواریں ہمارے خلاف بے نیام ہیں[1]"

ایک دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا:۔

تم لوگوں نے مجھے دھوکا دیا ہے جس طرح مجھ سے پہلے والوں کو دیا تھا۔ میرے بعد تم کس امام کی قیادت میں جنگ کرو گے؟ کیا اس کافر و ظالم (معاویہ) کی قیادت

---

[1] خطبات امام حسنؑ ص ۴۲-۴۳۔

میں جسے خدا اور اس کے رسولؐ پر کوئی ایمان نہیں ہے[1]"

تیسرے مقام پر آپ نے فرمایا:۔

خدا کی قسم ہم نے ذلت یا قلت کی بنا پر شامیوں کے ساتھ جنگ سے ہاتھ نہیں کھینچا۔ ہم تو صبر و صلح کے ہتھیار سے ان کا مقابلہ کریں گے۔ شروع میں جب تم لوگوں نے ہماری طرف رخ کیا تو اس وقت تمہارا دین تمہاری دنیا پر مقدم تھا لیکن اب تمہاری حالت یہ ہو گئی ہے کہ تمہاری دنیا آگے ہے اور دین پیچھے ہے، پہلے تم ہمارے ساتھ تھے لیکن اب مخالف ہو گئے ہو[2]"

معاویہ کی طرف سے ملنے والے مال و منصب اور عیش و آرام کی لالچ میں امام حسنؑ علیہ السّلام کے طرفدار دنیا پرستی، خیانت پسندی اور دشمن کے ساتھ ساز باز پر اُتر آئے یہاں تک کہ کوفہ کے امراء و روساء معاویہ سے خط و کتابت کرنے لگے اور اس سے ان لوگوں نے وعدہ کیا کہ جب بھی وہ چاہے امام علیہ السّلام کو ہم لوگ اس کے حوالے کر سکتے ہیں۔ اور یہی لوگ وہ تھے جو امام حسنؑ کے پاس آ کر ان کے سامنے اظہار عقیدت و اطاعت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ اپنے والد کے جانشین ہیں اور ہم آپ کے فرمانبردار و اطاعت گزار۔"

چنانچہ امام حسنؑ علیہ السّلام نے ان لوگوں سے فرمایا:۔

خدا کی قسم تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔ جب تم نے اس شخص کے ساتھ وفاداری نہیں کی جو مجھ سے بہتر تھا تو میں کیونکر تم سے وفا کی امید رکھوں اور کیونکر تم پر اعتبار کروں؟ مجھے تم لوگوں پر کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اور اگر تم سچے ہو تو ہماری تمہاری وعدہ گاہ "مدائن" کی فوجی چھاونی ہے۔ وہاں جمع ہو کر دکھاؤ۔"

[1-2] خطبات امام حسنؑ ص ۴۲-۴۳۔

اسکے بعد آپ نے مدائن کی طرف کوچ فرمایا لیکن لشکر نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ امام حسنؑ علیہ السّلام کی تاریخ اور آپ کی مثبت پالیسیاں ان لوگوں کے منھ پر طمانچہ ہیں جو آپ کو اپنے حق سے دست برداری اور ضعف دستی کا طعنہ دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ آپ نے معاویہ کا کام تمام کرنے یا اس سے جنگ کرنے کے لئے کچھ کئے بغیر ہی حکومت اس کے حوالے کر دی۔

ہم امام کے موقف کو ہر حال میں تائید کرتے ہیں کیونکہ آپ کا موقف انحراف کے لئے ایک چیلنج تھا اور آپ معاویہ کے ساتھ جنگ کے لئے آمادہ تھے جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا:۔

معلوم ہوتا ہے کہ معاویہ کو ہمارے ارادوں کی خبر مل گئی ہے اس لئے وہ نکل پڑا ہے۔ تم لوگوں پر خدا اپنی رحمت نازل کرے۔ نخیلہ میں اپنے فوجی پڑاؤ کی طرف کوچ کرو تاکہ وہاں پہنچ کر اس کے خلاف کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جا سکے۔"

اور جب آپ نے دیکھا کہ لوگوں کے دلوں میں موجود شکوک و شبہات اور مخلص افراد کی قلت کی بدولت جنگ میں کامیابی ممکن نہیں ہے تو فرمایا:۔

خدا کی قسم، میں نے حکومت صرف اس لئے معاویہ کے حوالے کر دی ہے کہ حامی اور مددگار مجھے میسر نہیں تھے۔ اگر مددگار اور وفادار لوگ ملتے تو میں رات دن مسلسل اس سے جنگ کرتا یہاں تک کہ خدا میرے اور اس کے درمیان آخری فیصلہ کر دیتا۔[1]

ان حالات کی روشنی میں امام کے سامنے یہی ایک راستہ تھا کہ آپ ایک بے نتیجہ جنگ لڑتے جس میں آپ شہید ہو جاتے اور بہت سی جانیں تلف ہو جاتیں۔"

چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

---

[1] خطبات امام حسن ص ۴۶۔

"مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں مسلمان صفحۂ ہستی سے ہی ختم نہ ہو جائیں۔ اس لئے میں نے بہتر سمجھا کہ دین کے نام لیوا باقی رہیں"۔ ایک موقع پر اور آپ نے فرمایا:۔

بے شک معاویہ نے ایک ایسے حق کے لئے میرے ساتھ نزاع کیا جو میرا ہے اس کا نہیں ہے۔ لیکن میں نے امت کی صلاح دید اور فتنہ و فساد کی بیخ کنی کے بارے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ معاویہ کے ساتھ مصالحت کر کے جنگ کا خاتمہ کروں۔ میں نے محسوس کیا کہ جانوں کی حفاظت خوں ریزی سے بہتر ہے۔ میں نے صرف اور صرف تمہارے فائدے اور تمہاری بقا کو مدنظر رکھا ہے۔ اگرچہ میرے خیال میں یہ اقدام تمہارے لئے سبب آزمائش ہے اور اس کا فائدہ بہت ہی مختصر ہے۔"

یہ سارے اجتماعی حالات اس بات کی دلیل ہیں کہ امام اگر جنگ کرتے تو اس کا کوئی بھی مثبت نتیجہ نہ نکلتا، اور آپ کے عظیم مقصد کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا یعنی وہ تبدیلی جو ایک تمدن اور حیات بخش عمل کی حیثیت سے تمام نسلوں کے لئے آپ کے خدائی مشن کا حصہ تھی اس جنگ سے حاصل نہ ہوتی۔

امام حسنؑ علیہ السّلام کی حکیمانہ صلح

امام حسن علیہ السّلام، معاویہ سے اگر جنگ کرتے بھی تو وہ بے نتیجہ ہوتی اور اس کی حیثیت عبداللہ ابن زبیر کی جنگ کی طرح بے فائدہ ہوتی اور جس سے اسلام اور اس کے ابدی پیغام کو کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اسی بنا پر آپ نے اپنے صائب فیصلے پر عملدرآمد کرتے ہوئے وقتی طور پر صلح قبول کر لی اور معاویہ کو حکومت کا موقع دے دیا۔ تاکہ اس کی حقیقت واضح اور اس کے غیر اسلامی منصوبے آشکار ہو جائیں۔ نیز ان سادہ لوح مسلمانوں پر بھی ساری حقیقت آشکار ہو جائے جن کی معلومات

ان کی ظاہر بیں آنکھوں یا حواس خمسہ تک محدود تھی۔ اور جنھیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ معاویہ کون ہے اور اس کی حکومت کی حیثیت کیا ہے؟ یا علیؑ ابن ابیطالب کون تھے اور ان کے اسلامی منصوبے کیا تھے؟ بنابریں امام حسنؑ نے صلح کی دعوت ایسے حالات میں قبول کی جب کہ صلح کا قبول کرنا معاویہ کی ظاہری فتح لیکن لوگوں کے سامنے اس کی فریب کارانہ سیاست کے بے نقاب ہونے اور اس کی خصلتوں کے آشکار ہونے کا باعث بنا۔

معاویہ مسلمانوں کے خون کی حفاظت کا مدعی اس لئے بنا بیٹھا رہا کہ وہ جنگ کے نتائج کو اپنے حق میں مفید سمجھتا تھا اور امام حسنؑ کو جنگ پر آمادہ بھی دیکھ رہا تھا۔ نیز اس کی سفاک آنکھوں میں یہ خواب بھی کروٹیں لے رہا تھا کہ وہ صلح اور مسلمانوں کے خون کا پاسبان بن کر دنیا کے سامنے ابھرے۔ لیکن اچانک اسے صلح کے لئے امام حسنؑ علیہ السّلام کی آمادگی کا سامنا کرنا پڑا اور اسے اپنی مکارانہ سیاست ناکام ہوتی ہوئی نظر آئی۔ حتیٰ کہ صلح کے نکات اور دفعات نے بعض امور میں اس کی سیاست کو مفلوج کر دیا۔ جو درج ذیل ہیں۔

(۱) حکومت معاویہ کے حوالے اس وقت کی جائے گی جب وہ کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کرے گا۔

(۲) معاویہ کی حکومت کے بعد حکومت امام حسنؑ کی ہوگی۔ اور اگر آپ کو کوئی حادثہ پیش آیا تو آپ کے بعد آپ کے بھائی امام حسینؑ حکومت کے حقدار ہوں گے۔ اور معاویہ کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ اپنے بعد کے لئے وہ کسی کو اپنا ولی عہد قرار دے۔"

(۳) حضرت علیؑ پر سب و شتم کا جو سلسلہ معاویہ نے جاری کر رکھا ہے وہ بند کیا جائے گا اور آئندہ ان کا نام عزت و احترام سے لیا جائے گا۔"

(۴) کوفہ کے بیت المال میں مسلمانوں کا جو سرمایہ موجود ہے اس سے معاویہ کوئی سروکار نہیں رکھے گا۔[1]"

(۵) معاویہ امام حسینؑ کو تیس لاکھ درہم سالانہ ادا کرتا رہے گا۔ بنی ہاشم کو بنی امیہ پر ترجیح دے گا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں حضرت علیؑ کی طرف سے شہید ہونے والوں کی اولادوں کو دس لاکھ درہم سالانہ دیا جائے گا اور یہ ساری رقمیں فارس کے صوبہ ابجرد کے خراج سے ادا کی جائیں گی۔

(۶) معاویہ تمام مسلمانوں کو امن و تحفظ فراہم کرے گا۔ خواہ وہ شام میں ہوں، عراق میں ہوں، حجاز میں ہوں، یمن میں ہوں۔

(۷) معاویہ کینہ و عداوت کی بنا پر اہل عراق سے کسی قسم کا کوئی انتقام نہیں لے گا بلکہ ان کی جان و مال اور اہل و عیال کی حفاظت کا ذمہ دار ہوگا۔

(۸) علیؑ کے اصحاب اور شیعہ مکمل طور پر آزاد ہوں گے اور ان پر کسی طرح کا کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

(۹) امام حسنؑ، ان کے بھائی امام حسینؑ و نیز دیگر اہل بیت رسولؐ کے ساتھ کسی قسم کی خفیہ یا اعلانیہ بدسلوکی نہیں کی جائے گی اور نہ انھیں حکومت کی اطاعت سے مرغوب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۱۰) رنگ و نسل کی کوئی تفریق نہیں ہوگی اور حقدار تک اس کا حق پہنچایا جائے گا۔[2]

---

[1] اس وقت بیت المال کی مالی حیثیت پچاس درہم کی تھی۔ [2] یہ تمام شرطیں شیخ راضی آل یاسین کی کتاب "صلح الحسن" سے ماخوذ ہیں۔"

صلح کی شرطوں سے معاویہ کا انحراف

امام حسنؑ علیہ السّلام کا یہ حکیمانہ اقدام کامیابی سے ہمکنار ہوا اور معاویہ نے خود بخود اپنی حقیقت اور پوشیدہ انحرافات کو نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ اس نے اتنا انتظار بھی نہ کیا کہ حالات کی کروٹیں اس کی مکروہ شخصیت کو دنیا کے سامنے بے نقاب کریں۔ چنانچہ دوسرے ہی دن اس نے اپنے مکارانہ منصوبوں کا اعلان کرتے ہوئے شامیوں اور عراقیوں کے ایک مشترکہ مجمع میں کہا:۔

خدا کی قسم میری جنگ تم سے اس لئے نہ تھی کہ تم نماز پڑھو، روزہ رکھو، حج کرو، یا زکواۃ دو۔ بلکہ میری جنگ صرف اس لئے تھی کہ میں تم پر حکومت کروں۔ خدا نے میرا مقصد پورا کیا اگرچہ تمہاری مرضی یہ نہیں تھی۔ آگاہ رہو کہ میں نے حسنؑ کو بڑے بڑے سبز باغ دکھائے ہیں اور ان کے ساتھ بہت سے وعدے اور عہد وپیمان کئے ہیں لیکن آج میں ان وعدوں اور عہد وپیمان کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوں اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں کسی شرط کو پورا نہیں کروں گا۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی مسلمانوں نے واضح طور پر یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ معاویہ کا ہر منصوبہ دورِ جاہلیت کے آثار کی کڑی ہے جس کا مقصد اسلام کی عمارت کو زمیں بوس کرنا ہے۔ نیز یہ کہ حضرت علیؑ علیہ السّلام اسلامی اہداف و نظریات کے حقیقی علمبردار تھے۔ یہاں تک کہ آپ کا مختصر سا دورِ حکومت امت مسلمہ کی نظر میں ایک آئیڈیل اور ایک شیریں یاد کی حیثیت سے زندہ رہا۔ حالانکہ وہ دور سختی اور تنگی کے عروج کا تھا۔"

معاہدہ شکنی کا مطالبہ

جب معاویہ نے صلح کی متفقہ شرطوں کو پامال کیا تو مسلمانوں نے شور

مچاتے ہوئے امام حسنؑ علیہ السّلام کے سامنے اپنا یہ مطالبہ رکھا کہ وہ معاہدہ کو توڑ دیں اور دوبارہ معاویہ سے جنگ کی تیاری کریں۔ لیکن آپ نے انھیں جواب دیا کہ آن لکل شئ اجل و لکل شئ حساب" یعنی۔ ہر چیز کا ایک مخصوص وقت ہوتا ہے اور ہر امر کا ایک معینہ حساب"۔

نیز یہ بھی فرمایا:۔ یہ صلح تمہارے لئے ایک فتنہ ہے اور اس کا فائدہ مختصر"۔
امام حسنؑ علیہ السّلام معاہدہ شکنی کے نظریئے کے خلاف نہ تھے بلکہ آپ کسی مخصوص وقت کا انتظار فرما رہے تھے اور اس کے آنے تک معاویہ سے جنگ کا پروگرام ملتوی رکھنا چاہتے تھے" تاکہ اس کی گھناونی اور مکروہ شخصیت پوری طرح ابھر کر مسلمانوں کے سامنے آجائے اور اس کے ایام جاہلیت والے مقاصد ومنصوبے ہر ایک پر آشکار ہو جائیں۔

ادھر معاویہ نے امام علیہ السّلام کے ارادوں کو بھانپ لیا تھا اور یہ محسوس کر لیا تھا کہ امام کامیابی سے اپنا رول ادا کرتے ہوئے اسے دنیا کے سامنے اس طرح بے نقاب کر دیں گے جو اس کی ابدی رسوائی کا سبب بن جائے گا" لہٰذا اس نے امام کے اقدامات کو ناکام بنانے کے لئے فوری قدم اٹھایا" تاکہ اسے بھی حضرت عثمان والی صورتحال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

اس رسوائی سے بچنے کے لئے اس نے ایک ایسا لائحہ عمل مرتب کیا جس کے زریعہ وہ مسلمانوں کے ضمیر اور ظلم کے خلاف مقابلہ کی صلاحیتوں اور قوتوں کو ختم کر سکے۔ اسی لئے مسلسل بیس سال تک معاویہ کی سیاست اس لائحہ عمل کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں گزری تاکہ لوگوں کے ضمیر کو مردہ بنا کے ان کی سوچ کو روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے پیچیدہ مسائل میں الجھائے رکھا جائے۔ یہاں تک کہ ان بلند مقاصد سے وہ بے خبر ہو جائیں جن کا انھوں نے عظیم پیغمبرؐ کی

بیعت کے دوران بیڑا اٹھایا تھا۔

معاویہ کے چند منصوبے وقتی طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے افکار، جو قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج کو سرنگوں کرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ حقیر عطیات اور پست زندگی کے تصور میں پھنس کر رہ گئے۔ کوفہ کے بعض سرداروں کی حالت تو یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ علوی شیعہ ہونے کے باوجود معاویہ کے لئے جاسوسی کرنے لگے۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ لوگ قبائلی سرداروں کی مخالفانہ سرگرمیوں کی اطلاع معاویہ کو دے دیتے تھے جس کے نتیجے میں سرکاری فورس آجاتی تھی اور انھیں گرفتار کر کے ان کی سرگرمیوں کا گھلا گھونٹ دیتی تھی۔

مختصر یہ کہ معاویہ کی حکومت کے یہ بیس سال امت مسلمہ کے لئے ذلت وحقارت کے بدترین تاریخی ایام تھے اور اس دور کا ہر مسلمان یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ وہ مظلوم اور بے بس ہے۔ اس دور میں اسلام تباہی وبربادی کے دہانے پر کھڑا تھا، شریعت کھیل بن کر رہ گئی تھی، بیت المال اور مال غنیمت ارباب حکومت کی عیش پرستیوں کا ذریعہ قرار پا چکا تھا اور خلافت بنی امیہ کے ہاتھوں میں ایک گیند کی طرح گردش کر رہی تھی۔

افسوس صد افسوس

افسوس صد افسوس، کہ بعض نافہم تاریخ نگاروں کی بعض مقتدر و منزلت یافتہ مورخین نے بھی حضرت امام حسنؑ علیہ السلام کے بارے میں اپنے اس باطل نظریے کا اظہار کیا ہے کہ (نعوذ باللہ) آپ کی قائدانہ صلاحیتیں کمزور تھیں آپ نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دئے آپ نے جنگ کی صعوبتوں سے بچنے کے لئے اپنا حق چھوڑ دیا، آپ نے اسلامی انقلاب کے ساتھ خیانت سے

کام لیا، نیز آپ نے جنگ کئے بغیر حکومت اسلامیہ کو معاویہ جیسے دشمن اسلام کے حوالے کر دیا۔

اس مشہور ومعروف اور باطل نظریے کی بنیاد ان مورخین کا یہ غلط عقیدہ ہے کہ حکومت سے محرومی کی وجہ سے ائمہ اہل بیتؑ نے عمومی طور پر سیاست سے گریز اور پہلو تہی کی روش اختیار کی۔

درحقیقت یہ نظریہ باطل ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ ائمہ سے ان مورخین کی بے خبری، لاعلمی، اور جہالت کی دلیل بھی ہے، کیونکہ ائمہ طاہرینؑ دنیاوی اقتدار وحکومت سے محرومی کے باوجود پیغمبرؐ کے مشن کی حفاظت، اس کے بلند اسلامی اقدار اور اصولوں سے دور ہونے سے بچانے، اور اس کے عظیم مقاصد کو انحراف سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں ہمیشہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے"۔

اسی لئے امام حسنؑ علیہ السّلام نے جب معاویہ کے ساتھ مصالحت کی اور حکومت سے دستبردار ہوئے تو آپ چین سے نہیں بیٹھے بلکہ آپ امت کی اصلاح، حفاظت اور پاسبانی کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اسلامی تشخیص سے آگاہ کرنے کی طرف ہمیشہ متوجہ رہے حالانکہ آپ کا یہ مثبت اور موثر کردار آپ کے لئے بہت سی زحمتوں، پریشانیوں اور پابندیوں کا سبب بنا لیکن آپ کے پائے استقلال میں کہیں سے کوئی لغزش نہیں آئی۔

آپ کو بار بار شہید کرنے کی کوششوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کو آپ کے وجود سے خطرہ لاحق تھا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ آپ امت مسلمہ کی بیداری کے لئے سرگرم عمل تھے"۔

صلح اور جنگ

صلح اور جنگ دو متضاد لفظیں ہیں۔ عربی زبان صلح کا لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب فساد باقی نہ رہے' اور مصالحت اس قرارداد کو کہتے ہیں جس سے نزاع دور ہو جائے۔ اور ارباب سیاست کے نزدیک صلح کا مطلب یہ ہے کہ جس کی کچھ سرطوں کے تحت کسی باہمی جھگڑے کو روک دیا جائے۔ اور جنگ اسے کہتے ہیں کہ جس کے دامن میں صلح کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ یعنی صلح کا امکان جنگ کے مفقود ہونے پر اور جنگ کا امکان صلح کے فقدان پر ہوتا ہے اور اس امکان' عدم امکان' اور موقع کی نزاکت کو سمجھنے کا حق صاحب معاملہ کو ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبرؐ اسلام نے صلح کے موقع پر حدیبیہ میں صلح کی اور جنگ کے موقعوں پر مسلسل و متواتر جہاد کئے اور امیر المومنین حضرت علیؑ علیہ السّلام نے صلح کی منزل میں خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کی اور جب موقع آیا تو جمل و صفین کے کارنامے انجام دئے۔

حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے امام حسنؑ علیہ السّلام کے لئے جنگ مناسب نہیں تھی اس لئے آپ نے صلح کی' اور امام حسینؑ کے لئے صلح مناسب نہیں تھی اس لئے آپ نے وہ تاریخ ساز جنگی کارنامہ انجام دیا کہ جس پر تمام اسلامی جنگیں نازاں ہیں۔ نیز حدیث پیغمبرؐ کے مطابق یہ دونوں عمل اپنے اپنے مقام پر درست' ممدوح اور مستحسن ہیں۔ جیسا کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔

"حسنؑ اور حسینؑ دونوں ہر حال میں واجب الاطاعت ہیں خواہ وہ صلح کریں یا جنگ......"

حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کا بنیادی مقصد ایک تھا لیکن ان دونوں کے حالات کی نوعیت میں یہ فرق تھا کہ امام حسنؑ علیہ السّلام کے پاس اس وقت جاں نثاروں اور مددگاروں کا فقدان تھا۔ چنانچہ معاویہ نے جب آپ کے سامنے یہ مسئلہ کھڑا کر دیا کہ آپ جنگ کریں اور اپنے ماننے والوں کی تباہی و بربادی برداشت کریں یا پھر خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ تو امام نے جنگ پر صلح کو مقدم سمجھا اور مصالحت کر کے خلافت سے کنارہ کش ہو گئے' تاکہ مسلمانوں کی خوں ریزی نہ ہو۔

حضرت امام حسینؑ علیہ السّلام کے پاس بہترین جاں نثار و جانباز موجود تھے اور معاویہ کے فاسق و فاجر بیٹے یزید کا مطالبہ یہ تھا کہ "بیعت کرو یا سر دو۔" امام علیہ السّلام نے حالات کی روشنی میں بیعت سے انکار کیا اور جنگ کے میدان میں سر دے کے یزید کی ظالم و جابر حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔

اس امر میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر معاویہ امام حسنؑ سے بیعت کا مطالبہ کرتا تو اپنے جاں نثاروں اور مددگاروں کے فقدان کے باجود وہ بھی وہی کرتے جو امام حسینؑ نے کیا' کیوں کہ آل محمد کسی غیر کی بیعت کو حرام مطلق تصور کرتے تھے۔

حضرت امام حسنؑ کی دردناک شہادت

معاویہ کے حق میں حکومت سے دستبرداری کے بعد امام حسنؑ علیہ السّلام نے کوفہ کو چھوڑ دیا تھا اور مدینہ میں فروکش ہو گئے تھے اس کے باوجود معاویہ آپ کی طرف سے خائف تھا اور ذہنی طور پر صلحنامہ کی یہ شرط اس کے لئے انتہائی پریشان کن اور کرب و اضطراب کا سبب تھی کہ وہ کسی کو اپنا ولی عہد نامزد نہیں کر سکتا بلکہ اس کی موت کے بعد اس کا اقتدار امام حسنؑ علیہ السّلام کی طرف

منتقل ہو جائے گا۔

اس کے برخلاف معاویہ کا باطنی مقصد و ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے فاسق و فاجر اور بدکردار بیٹے یزید کے لئے اقتدار کا راستہ ہموار کرنے کے بعد اسے اپنا ولی عہد قرار دے دے اور اس کے حق میں مسلمانوں سے بیعت حاصل کر کے حکومت کو اپنے ہی گھر اور خاندان میں منحصر کر دے۔ لیکن اس کا یہ خواب اس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا جب تک امام حسنؑ علیہ السّلام بقید حیات رہتے۔ چنانچہ اس نے امام کے قتل کا خفیہ منصوبہ تیار کیا اور اس منصوبے کے تحت اس نے امام حسنؑ کو پانچ مرتبہ زہر دلوایا تاکہ راستہ صاف ہو جائے اور وہ اپنے سفاکانہ منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اس اجمال کی تفصیل مفسر قرآن علامہ حسینؑ کاشفی کی زبان قلم سے سنئے۔

معاویہ سے مصالحت کے بعد امام حسنؑ علیہ السّلام اپنے بھائی امام حسینؑ اور جملہ اہل و عیال کو لے کر کوفہ سے مدینہ آ گئے تھے۔ وہاں ایک دن آپ کو یہ معلوم ہوا کہ بصرہ کے چند اوباشوں نے وہاں کے شیعوں پر شبخون مار کر اڑتیس ۳۸ آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔ چنانچہ اس افسوسناک خبر سے متاثر ہو کر آپ نے حالات کا جائزہ لینے کا قصد کیا' اور بصرہ کے لئے روانہ ہو گئے' آپ کے ہمراہ عبداللہ ابن عباس بھی تھے۔ جب آپ موصل پہنچے تو جناب مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی کے چچا سعد موصلی کے مہمان ہوئے۔ لیکن جب بصرہ سے واپس پلٹے تو آپ موصل ہی میں ایک ایسے شخص کے اصرار پر اس کے یہاں قیام فرما ہوئے' جو معاویہ سے ساز باز کئے ہوئے تھا اور اس نے زہر کے ذریعہ آپ کا کام تمام کرنے کا معاویہ سے وعدہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ قیام کے دوران اس نے تین مرتبہ کھانے میں ملا کر آپ کو زہر دیا۔ مگر بحکم الٰہی اس کا کوئی اثر آپ پر نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہوا اور اس نے معاویہ کو خط

لکھا کہ تیرا بھیجا ہوا زہر میں تین مرتبہ کھانے میں ملا کر امام حسنؑ کو دے چکا ہوں لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ خط پڑھ کر معاویہ نے ایک انتہائی خطرناک قسم کا زہر اپنے تیز رفتار قاصد کے ہاتھ روانہ کیا اور اسے لکھا کہ اگر تو اس زہر کا ایک قطرہ بھی حسنؑ کو دینے میں کامیاب ہو گیا تو ان کی موت یقینی ہو گی۔ قاصد وہ زہر اور معاویہ کا خط لے کر تیز رفتار ناقہ پر آ رہا تھا کہ ایک مقام پر اس نے کھانا کھایا اور ایک درخت کے سائے میں لیٹ کر آرام کرنے لگا' یہاں تک کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ ناگاہ ایک ہیبت ناک درندہ برآمد ہوا اور قاصد کو لے کر رفوچکر ہو گیا۔

اتفاق سے امامؑ کا ایک شیدائی بھی اسی مقام پر آ کر رُکا جو بصرہ سے مدینہ کے لئے عازم سفر تھا۔ اس نے قاصد کا ناقہ' معاویہ کا خط اور زہر کی بوتل کو لیا اور موصل پہنچ کر ان تینوں چیزوں کو امام کی خدمت میں پیش کر دیا۔ امام نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ناقہ اسی کے حوالے کر دیا اور خط نیز زہر کی بوتل کو خاموشی سے اپنے پاس رکھ لیا۔ امام حسنؑ علیہ السّلام اس واقعہ کو موصل میں کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے مگر خدا جانے کس طرح سعد موصلی کو اس کی بھنک مل گئی اور انھوں نے امام کی جانماز کے نیچے سے وہ خط حاصل کر لیا۔ اس کے بعد خط پڑھتے ہی سعد آگ بگولا ہو گئے اور امام کے میزبان سے پوچھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ سعد کے اس استفسار پر وہ گھبرایا اور اس نے اپنی لاعلمی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ مگر سعد نے اس کے کسی عذر کو تسلیم نہیں کیا اور اسے اتنا مارا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔"

زہر خورانی کا چوتھا واقعہ مروان بن حکم کی طرف منسوب ہے کہ اس نے ایک عثمانی جس کا نام حیاج ابن مسیح تھا' کے ذریعہ امام حسنؑ علیہ السّلام کو زہر دلوایا لیکن بہ اعجاز الٰہی اس بار بھی آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔[1]"

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۲۸۶۔

پانچویں بار امام علیہ السّلام کو زہر دینے کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ معاویہ نے مدینہ کے گورنر مروان بن حکم کو لکھا کہ جس صورت سے بھی ممکن ہو سکے امام حسنؑ کو ختم کر دو۔"

اس تحریری فرمان کی موصولی کے بعد مروان نے ایک رومی دلّالہ (جس کا نام ایسوینہ تھا) کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ تو امام کی زوجہ جعدہ بنت اشعث کے پاس جاکر میرا یہ پیغام دے کہ اگر تو امام حسنؑ کو کسی صورت سے شہید کر دے گی تو تجھے معاویہ ایک ہزار دینار سُرخ اور پچاس ہزار درہم دے گا نیز امام کے بعد تیرا عقد اپنے بیٹے یزید کے ساتھ کر دے گا اور تو ملکہ بن جائے گی۔

ایسوینہ نے جعدہ کو سو دینار نقد پیش کئے جو مروان نے بھجوائے تھے اور جعدہ بنت اشعث کو اس قاتلانہ اقدام پر ہموار کر لیا۔ اس کے بعد اس نے مروان کو جب یہ بتایا کہ جعدہ، امام حسنؑ کو زہر دینے پر راضی ہو گئی ہے تو اس نے معاویہ کو خط لکھ کر زہر کا انتظار کیا اور ایسوینہ دلّالہ کے ذریعہ جعدہ بنت اشعث تک پہنچا دیا۔ جعدہ نے اس زہر کو خرمے میں ملایا اور موقع پاکر وہ خرمہ امام حسنؑ علیہ السّلام کو کھلانے میں کامیاب ہو گئی۔"

لیکن مصدقہ روایت یہ ہے کہ جعدہ نے رات کے وقت اس پانی میں زہر ملایا تھا جو آپ کے سرہانے پینے کے لئے رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ جب وہ اپنا کام کر کے چلی گئی تو تھوڑی ہی دیر کے بعد امام حسنؑ علیہ السّلام کی آنکھ کھلی، آپ نے جناب زینبؑ کو آواز دی اور فرمایا، اے بہن! میں نے ابھی ابھی اپنے نانا محمدؐ مصطفےٰ اور پدر بزرگوار علیؑ مرتضیٰ کو خواب میں دیکھا ہے جو مجھ سے یہ فرما رہے تھے اے حسنؑ، کل تم ہمارے پاس ہو گے۔"

اس کے بعد جناب زینبؑ سے آپ نے وضو کے لئے پانی طلب فرمایا۔ اور

وہ زہر آلود پانی جو آپ کے پینے کے لئے سرہانے رکھا تھا، ہاتھ بڑھا کر اٹھایا اور پی گئے۔ اس پانی کے پیتے ہی زہر نے اپنا کام شروع کر دیا، چنانچہ چند ہی لمحوں کے بعد آپ کے دہن اقدس سے خون جاری ہوا اور اس کے ساتھ ہی آپ کا کلیجہ بہتر ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر طشت میں آگیا۔ موت و زیست کی اسی کشمکش کے عالم میں آپ نے اپنے بھائی امام حسینؑ کو بلا کر کچھ وصیتیں کیں اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔

تاریخیں بتاتی ہیں کہ آپ کی شہادت کے فوراً بعد مروان ابن حکم نے جعدہ بنت اشعث کو اپنی حفاظت میں لے کر دو عورتوں سمیت ایک رہبر کے ساتھ معاویہ کے پاس بھیج دیا تھا۔ معاویہ نے اس کے ہاتھ پاؤں بندھوائے اور یہ کہہ کر دریائے نیل میں ڈلوایا کہ جب تو نے امام حسنؑ کے ساتھ وفا نہیں کی تو یزید کے ساتھ کیا کرے گی[1]"

مورخ مسعودی کا بیان ہے کہ معاویہ نے ایک لاکھ درہم اور یزید سے شادی کا لالچ دے کر ایسوینہ دلالہ کے ذریعہ بذات خود جعدہ سے رابطہ قائم کیا تھا اور اسے امام حسنؑ کے قتل پر ہموار کیا تھا[2] جب کہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ خود یزید نے جعدہ بنت اشعث کو یہ پیغام بھجوایا تھا کہ اگر تو امام حسنؑ کا کام تمام کر دے تو میں تجھے اپنی بیوی بنا لوں گا لیکن بعد میں وہ مکر گیا اور اس نے جعدہ سے یہ کہا کہ جب میں نے تجھے امام حسنؑ کے لئے پسند نہیں کیا تو اپنے لئے کیا پسند کروں گا[3]"

---

[1] روضۃ الشہداء ص۲۲۰ تا ۲۳۵ طبع بمبئی سنہ ۱۲۸۵ھ [2] مروج الذہب حصہ دوم باب ۷۴ خلافت امام حسنؑ۔ [3] تاریخ ابن کثیر ج ۸ واقعات سنہ ۴۹ھ۔

جنازے پر تیروں کی بارش

امام حسنؑ علیہ السّلام نے اپنی وفات سے قبل یہ وصیت کی تھی کہ مجھے میرے نانا حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ چنانچہ غسل و کفن سے فراغت کے بعد امام حسینؑ علیہ السّلام نے آپ کی نماز جنازہ پڑھی اور آپ کے جسد اطہر کو پہلوئے رسولؐ میں دفن کرنے کی غرض سے اپنے کاندھوں پر لے چلے۔

ابھی آپ مرقد رسولؐ تک پہنچے بھی نہ تھے کہ مروان بن حکم کی قیادت میں بنی امیہ کے افراد سدراہ ہوئے اور ام المومنین حضرت عائشہ بھی ایک خچر پر سوار ہو کر آدھمکیں، اور فرمانے لگیں کہ میں اپنے گھر کے اندر حسنؑ کو ہرگز ہرگز دفن نہ ہونے دوں گی[1] بعض لوگوں نے کہا کہ اے عائشہ! تمہارا عجب حال ہے کہ تم کبھی اونٹ پر سوار ہو کر داماد رسولؐ سے جنگ کرتی ہو اور کبھی خچر پر سوار ہو کر فرزند رسولؐ کے دفن میں مزاحمت کرتی ہو، جب کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر وہ ایک نہ مانیں اور ضد پر اڑی رہیں، یہاں تک کہ بات بڑھ گئی اور ان معظمہ کے ہواخواہوں نے امام حسنؑ علیہ السّلام کے جنازے پر یہ کہہ کر تیروں کی بارش شروع کر دی کہ عثمان تو یہودیوں کے قبرستان میں دفن ہوں اور حسنؑ کو پہلوئے رسولؐ میں دفن کیا جائے[2]۔

صاحب روضۃ الصفاء نے لکھا ہے کہ بہت سے تیر امام حسن کے جنازے میں پیوست ہو گئے۔ آخر کار بحالت مجبوری جنازے کو جنت البقیع میں لاکر دفن کیا گیا[3] وقت شہادت آپ کی عمر ۴۷ سال کی تھی۔

---

[1] تاریخ ابو الفداء ج ۱ ص ۱۸۳، روضۃ المناظر ۱۱ ص ۱۳۳۔ [2] روضۃ الصفاء ج ۳ ص ۷۔
[3] تاریخ اسلام ذاکر حسین ج ۲ ص ۲۸۔ [4] تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۸۲۔

معاویہ کا سجدۂ شکر

معتبر و مستند مورخین کا بیان ہے کہ جب مروان حاکم مدینہ نے جعدہ بنت اشعث کو معاویہ کے پاس بھیجا اور اس کے ذریعہ اسے اپنی کامیابی کا حال معلوم ہوا تو اس نے اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لئے سر دربار بلند آواز سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اوندھے منہ سجدے میں گر پڑا۔ اس کے اس حیوانی عمل کو دیکھ کر سارے درباری بھی نعرۂ تکبیر بلند کرنے اور خوشیاں منانے لگے۔ یہ آوازیں جب محل سرا کے اندر پہنچیں تو معاویہ کی بیوی فاختہ بنت قرظہ بن عمرو بن نوفل محل سے باہر آئی اور اس نے معاویہ سے پوچھا کہ یہ تکبیر کی آوازیں کس خوشی میں بلند ہو رہی ہیں؟ معاویہ نے کہا، فرزند رسولؐ امام حسنؑ کا خاتمہ کر دیا گیا۔"

یہ سن کر اس نے کہا، اے معاویہ! تجھے شرم نہیں آتی کہ رسول اللہ کے نواسے کو قتل کرانے کے بعد تو نعرۂ تکبیر بلند کر رہا ہے، شکر کے سجدے ادا کر رہا ہے اور اپنے درباریوں کے ساتھ مل کر خوشیاں منا رہا ہے۔ حشر کے دن رسولؐ کے سامنے تو کون سا منہ لے کر جائے گا۔ اس پر معاویہ نے کہا کہ حسنؑ کیا تیرے رشتے دار تھے جو تو اس قدر پریشان ہو رہی ہے[1]

امام حسنؑ علیہ السّلام کا سوگ

ابن کثیر نے روایت کی ہے کہ:-

---

[1] تاریخ ابو الفداء ج ۱ ص ۱۸۲، عقد الفرید ج ۲ ص ۱۱، روضۃ المناظر ج ۱۱ ص ۱۳۳، تاریخ خمیس ج ۲ ص ۲۳۸، حیواۃ الحیوان ج ۱ ص ۱۵، ارجح المطالب ص ۳۵۷، اخبار الطوال ص ۴۰۔

محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ بنی سعد بن بکر کے غلام مساور نے مجھ سے بیان کیا کہ جس روز حضرت امام حسنؑ شہید ہوئے اس دن میں نے ابوہریرہ کو مسجد نبوی پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے یہ اعلان کرتے ہوئے سنا اور دیکھا کہ وہ کہہ رہے تھے اے لوگو! آج رسول اللہ کا نواسہ شہید ہو گیا۔ تم لوگ گریہ کرو۔ پس آپ کے جنازے پر لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے یہاں تک کہ بقیع میں لوگ سما نہیں رہے تھے۔ مدینہ کی عورتوں اور مردوں نے سات دن تک آپ کا سوگ منایا اور گریہ کیا۔ جب کہ بنی ہاشم کی عورتیں مسلسل ایک ماہ تک آپ پر گریہ و ماتم کرتی رہیں اور انھوں نے ایک سال تک آپ کا سوگ منایا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آل رسولؐ کی مظلومانہ شہادتوں پر گریہ و زاری شروع ہی سے چلی آ رہی ہے۔ یہ کوئی نئی رسم (بدعت) نہیں ہے اور یہ روایت جو اوپر مرقوم ہوئی ہے کسی شیعہ کی نہیں بلکہ ابن کثیر کی ہے جو بنی امیہ کے پرستاروں میں تھا۔"

حضرت امام حسنؑ کا عہد خلافت

"ابن اثیر" کا بیان ہے کہ:-

امام حسنؑ کی خلافت کا زمانہ، ان لوگوں کے قول کے مطابق، جن کا بیان ہے کہ آپ نے ربیع الاول سنہ ۴۱ھ میں تخت خلافت سے اپنے کو دست بردار کر لیا تھا، ساڑھے پانچ ماہ کا ہوتا ہے اور ان لوگوں کے مطابق جو یہ کہتے ہیں کہ امام حسنؑ نے امر خلافت ربیع الآخر سنہ ۴۱ھ میں معاویہ کو سونپا تھا، چھ ماہ کچھ دن پر منحصر ہے۔ اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ جمادی الاول سنہ ۴۱ھ کا واقعہ ہے، ان کے مطابق سات ماہ کچھ دن کا ہے[1]۔"

[1]۔ تاریخ کامل واقعات سنہ ۴۱ھ۔

"ابن کثیر" کے بیان سے مزید وضاحت ہوتی ہے:-

ابوالحسن علی بن المدینی نے بیان کیا ہے کہ امام حسنؑ نے ۵، ربیع الاول سنہ ۴۱ھ کو خلافت معاویہ کے سپرد کی اور دوسروں نے ربیع الآخر بیان کیا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے جمادی الاول کے آغاز میں خلافت کی باگ ڈور معاویہ کے ہاتھوں میں دے دی تھی کیونکہ اس وقت حالات آپ کے لئے ناسازگار تھے[1]۔ (واللہ اعلم)۔

عالم اسلام پر معاویہ کا تسلط

سنہ ۴۱ھ میں خلافت سے حضرت امام حسنؑ علیہ السّلام کی دستبرداری کے بعد جب معاویہ کو پورے عالم اسلام پر تسلط حاصل ہو گیا اور اسے مجبوراً خلیفہ تسلیم کر لیا گیا تو اس نے اس سن کا نام "السنہ والجماعت" رکھا، جسے امتداد زمانہ کی نیرنگیوں نے "السنت والجماعت" بنا دیا۔"

ابن اثیر کا بیان ہے کہ جب معاویہ کے لئے امر خلافت مستحکم ہو گیا اور سعد بن ابی وقاص ان کے پاس آئے تو انھوں نے "بادشاہ" کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے اسے سلام کیا۔ اس پر معاویہ نے مسکراتے ہوئے کہا، اے ابواسحٰق! اگر تم "امیرالمومنین" کہہ کر مجھے مخاطب کرتے اور کہتے کہ "السلام علیکم یا امیرالمومنین" تو تمہارا کیا حرج تھا۔ سعد بن ابی وقاص نے کہا، کیا یہ بات آپ خوش ہو کر کہہ رہے ہیں؟ خدا کی قسم جس دھاندلی سے آپ نے خلافت حاصل کی ہے، میں اسے اپنے لئے کبھی پسند نہ کرتا اور حقدار کو اس کے حق پر برقرار رکھتا[2]۔"

[1] تاریخ ابن کثیر واقعات سنہ ۴۱ھ۔ [2]۔ تاریخ کامل واقعات سنہ ۴۱ھ طبع مصر۔

گورنروں کی تقرری

معاویہ نے امارت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد، کوفہ، بصرہ، مصر، مکہ اور مدینہ وغیرہ میں اپنے گورنر مقرر کئے۔ چنانچہ بصرہ پر اس نے بسر بن ارطاة کو مامور کیا جو انتہائی سفاک اور ظالم و جابر انسان تھا۔ اس کے بارے میں ابن اثیر کا بیان ہے کہ:-

جب بسر بن ارطاة بصرہ پہنچا تو اس نے منبر پر جو پہلا خطبہ پڑھا اس میں حضرت علی اور خانوادۂ رسالت کے دیگر برگزیدہ افراد پر سب و شتم کیا۔ اس کے بعد کہا کہ میں تم لوگوں کو خدا کی قسم دیتا ہوں، جو شخص مجھے صادق سمجھتا ہے وہ سچا کہہ دے اور جو مجھے جھوٹا جانتا ہے وہ مجھے جھوٹا قرار دے دے۔ اس پر ابوبکر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے بھرے مجمع میں گرجتے ہوئے کہا۔ ہم تو یہی جانتے ہیں کہ تو بھی جھوٹا ہے اور تیرا باپ بھی جھوٹا تھا۔ یہ سن کر بسر نے حکم دیا کہ کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ چنانچہ ایک شخص اٹھا اور گلا گھونٹنے کے لئے ابوبکر پر جھپٹ پڑا۔ مگر ابولؤلؤ ابضی نے اپنے آپ کو دونوں کے درمیان حائل کر کے ابوبکر کو بچا لیا[1]۔

معاویہ نے سنہ ۴۱ھ کے آخر میں عبداللہ بن عامر کو بصرہ پر مامور کیا اور اس کے ساتھ خراسان اور سجستان کو بھی اس کی ماتحتی میں دے دیا۔ عبداللہ بن عامر کی پالیسی وہی رہی جو عثمان کے دور میں تھی جب کہ ان کی طرف سے وہ وہاں کا گورنر تھا۔ یہ صرف اپنے مفاد کو مقدم رکھتا تھا۔ چنانچہ جتنی بھی دولت یہ سمیٹ سکتا تھا سمیٹتا رہا۔ اس نے لوگوں کو بالکل ہی آزاد چھوڑ دیا تھا جس کے نتیجے میں بدامنی پھیل گئی۔

[1]۔ تاریخ طبری حصہ سوم واقعات سنہ ۲۹ھ

اور صورت حال اس قدر خراب ہو گئی کہ بصرہ کے لوگوں نے معاویہ پر یلغار کر دی اور مجبوراً اسے عبداللہ کو معزول کر کے وہاں دوسرا حاکم مقرر کرنا پڑا اور چند ماہ بعد اس نے زیاد بن ابیہ کا تقرر کیا۔

معاویہ نے کوفہ پر مغیرہ بن شعبہ کو حاکم بنایا۔ اس کی حاکمیت کا قصہ یہ ہے کہ معاویہ نے عمرو بن عاص کو مصر کی حکومت پر برقرار رکھتے ہوئے اس کے بیٹے عبداللہ کو بھی کوفہ کا تسلط سونپ دیا تھا۔ اس پر مغیرہ بن شعبہ معاویہ سے ملے اور اس سے کہا کہ تو نے کوفہ پر عبداللہ کو اور مصر پر اس کے باپ عمرو عاص کو مامور کر رکھا ہے تو کیا تو شیر کے دونوں جبڑوں کے بیچ میں رہے گا؟ اس پر معاویہ نے عبداللہ کو واپس بلا لیا اور مغیرہ کو اس کی جگہ پر برقرار رکھا۔ جب عمرو عاص کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بھی معاویہ کی طرف لپکا اور اس سے کہا، آپ نے مغیرہ کو محکمہ خراج بھی دے رکھا وہ سارا مال اڑا دے گا اور آپ میں اتنی استطاعت نہ ہو گی کہ پھر وہ مال اس سے وصول کر سکیں۔ بہتر یہ ہے کہ خراج پر آپ ایسے شخص کو مامور کریں تو آپ سے ڈرتا بھی رہے اور بچتا بھی رہے۔ چنانچہ اس پر معاویہ نے مغیرہ کو خراج سے معزول کر دیا اور اسے صرف نماز کی امامت اور جنگی امور پر برقرار رکھا۔"

مغیرہ کو معاویہ کی نصیحت:- ہشام محمد نے ابومخنف سے اور ابومخنف نے مقصب بن زہیر، فضیل بن خدیج اور حسین بن عقبہ مرادی سے روایت کی ہے کہ معاویہ نے ماہ جمادی الاول سنہ ۴۱ھ میں جب کوفہ پر مغیرہ بن شعبہ کو گورنر مقرر کیا تو انھیں بلا کر اس نے کہا کہ میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں بہت سی نصیحتیں کروں لیکن چونکہ مجھے اعتماد ہے کہ تم میری مرضی کے مطابق امور حکومت کی انجام دہی کی پوری صلاحیت رکھتے ہو اس لئے تمام باتوں کو چھوڑتا ہوں مگر ایک نصیحت میں تمہیں ضرور کر دوں گا اور وہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ پر تبرا کرنے، ان کی مذمت کرنے اور

انھیں گالیاں دینے میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہ کرنا۔ نیز شیعان علیؑ پر بھی طرح طرح کی تہمتیں عائد کرتے رہنا، انھیں اپنے سے دور رکھنا اور ان کی نہ کوئی بات سننا نہ ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی رعایت کرنا۔ اس کے برعکس عثمان پر رحمت کے لئے استغفار کرتے رہنا۔ ان کے حامیوں کو اپنے قریب رکھنا اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہنا[1]"

مغیرہ کی عمومی اور سیاسی پالیسی کوفہ کے شیعوں کے ساتھ ظالمانہ نہیں تھی لیکن یہ ظلم بھی کچھ کم نہ تھا کہ شیعوں کی موجودگی میں حضرت علیؑ پر تبرا کیا جاتا تھا اور آپ کو گالیاں دی جاتی تھیں اور مغیرہ باقاعدہ اس پروگرام میں شریک ہوتا تھا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین رقم طراز ہیں کہ :۔

مغیرہ کوفہ میں دس سال تک معاویہ کے گورنر رہے اس عرصہ میں ان کی کوئی بات غیر معمولی طور شیعوں کے لئے ناگواری کا سبب نہیں بنی بجز اس امر کے کہ وہ بھی حضرت علیؑ کو برا بھلا کہتے تھے جس کے لئے وہ جدید حکومت کے ماتحت مجبور تھے"۔

معروف سنی عالم شاہ معین الدین ندوی اپنی کتاب "تاریخ اسلام حصہ دوم میں لکھتے ہیں کہ :۔ بے شک امیر معاویہ نے اپنے دور میں برسر منبر حضرت علیؑ پر سب وشتم کی مذموم رسم جاری کی تھی اور ان کے تمام اعمال اس رسم کو ادا کرتے تھے۔ مغیرہ بن شعبہ بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے لیکن امیر معاویہ کی تقلید میں وہ بھی اس مذموم بدعت سے بچ نہ سکے۔ حجر بن عدی اور ان کی

[1] طبری ج ۴ واقعات سنہ ۵۱ھ

جماعت کو قدرتاً اس سے تکلیف پہنچتی تھی۔

بے شک مغیرہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور ان کی خوبیوں میں سب سے بڑی خوبی ان کی مکاری تھی۔ عبداللہ ابن عباس انھیں اپنے وقت کا مکار ترین انسان تصور کرتے تھے اور ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ :۔

مغیرہ بن شعبہ کو اگر کسی ایسے شہر میں رکھا جاتا جس کے تمام دروازوں سے مکر و دغا کے بغیر نکلنا محال ہوتا تو وہ اس میں سے بھی نکل آتے"۔[1]

مدینہ ۔ معاویہ نے مروان بن حکم کو جب مدینے کا حاکم بنایا تو اس دشمن رسولؐ کو یہ اختیارات بھی دئے کہ وہ منبر رسولؐ کو خود رسول اللہ کے گھرانے کی توہین وتذلیل اور خصوصاً حضرت علیؑ پر سب وشتم کے لئے استعمال کرے۔

چنانچہ اس نے اپنی آٹھ برس دو مہینے کی حاکمیت کے دوران آل محمدؐ کے ساتھ سب وشتم کے جس بدترین سلوک کو روا رکھا اس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔

سولانا مودودی خانوادۂ رسالت کی شان میں معاویہ کی طرف سے جاری کی گئی اس بدعت کی مجموعی کیفیت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ :۔

ایک نہایت مکروہ بدعت جو حضرت معاویہ کے عہد میں شروع ہوئی، وہ یہ تھی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علیؑ پر سب وشتم کی بوچھار کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی میں برسر منبر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور

[1] "تاریخ طبری ج ۴ معاویہ کے متفرق حالات۔

نوٹ :۔ مغیرہ بن شعبہ کی بدکرداری اور اخلاقی جرائم کے بارے میں مولف کی کتاب تفسیر کربلا کا مطالعہ فرمائیں۔

حضرت علیؑ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتے دار ان گالیوں کو سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی درکنار تھا۔ اور خاص طور سے جمعہ کے خطبہ کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین اور اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناونا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اپنے خاندان کو دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا[1]۔

مروان بن حکم صرف رسولؐ اور علیؑ کا ہی دشمن نہیں تھا بلکہ وہ امام حسنؑ امام حسینؑ اور تمام ائمہ اہل بیت کے ساتھ عداوت رکھتا تھا۔ جیسا کہ شاہ عبدالعزیز محدث اپنی کتاب فتاوائے عزیزی میں ایک سائل کے جواب کے تحت رقم طراز ہیں۔

اہل بیتؑ کی محبت فرائض ایمان میں سے ہے نہ کہ لوازم سنت۔ اور محبت اہل بیتؑ کا تقاضہ یہ ہے کہ مروان علیہ اللعنہ کو برا کہنا چاہئے اور اس سے دلی بیزاری کا اظہار کرنا چاہئے۔ علی الخصوص اس نے نہایت بدسلوکی کی حضرت امام حسینؑ اور اہل بیتؑ کے ساتھ وہ کامل عداوت رکھتا تھا اس لئے اس شیطان سے بیزار رہنا چاہئے۔

زیاد ابن سمیہ

زیاد ابن سمیہ، حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السّلام کے زمانۂ خلافت سے امام حسن علیہ السّلام کی دستبرداری تک یمن کا گورنر رہا، اور جب معاویہ نے پوری مملکت اسلامیہ پر اپنا تسلط جمایا تو اس وقت بھی وہ اپنے بدستور اپنے عہدے پر مامور تھا، نیز تمام گورنروں میں وہ تنہا ایسا شخص تھا جس نے معاویہ کی

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۰۰۔

اطاعت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس لئے اس کی طرف سے معاویہ کو یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مرکز سے دوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بغاوت کا اعلان کر دے اور اسے ایک مرتبہ پھر خانہ جنگی سے دوچار ہونا پڑے۔

معاویہ کے اس تشویش وتردد کو مغیرہ بن شعبہ کی تیز نگاہوں نے کس طرح بھانپ لیا۔ چنانچہ اس نے معاویہ سے کہا، اگر آپ اجازت دیں تو میں سمیہ کے بیٹے سے مل کر بات کروں۔ معاویہ چونکہ مغیرہ کی مکاریوں سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے اس نے مغیرہ کو اجازت دے دی۔ یہ زیاد کے پاس پہنچے اور اسے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گئے، یہاں تک کہ معاویہ سے اس کی مصالحت کرادی اور زیاد معاویہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس سے مغیرہ کو معاویہ کی مزید خوشنودی حاصل ہو گئی اور انھوں نے زیاد کے اس احسان کا بدلا بھی چکا دیا جو اس نے ان کی جان بچا کر کیا تھا۔

زیاد ایک رومی غلام کے یہاں پیدا ہوا تھا اور اسی کی ولدیت سے پہچانا جاتا تھا۔ لیکن معاویہ نے اسے سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اپنے باپ ابوسفیان کا نطفہ قرار دے کر اپنا بھائی بنالیا تھا۔ معاویہ کے اس فعل کو علماء فقہاء اور مورخین نے مکروہ اور خلاف شرع قرار دیا ہے۔ لیکن معاویہ کے عقیدتمند اپنے مزاج کے مطابق اس کی پیشانی سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ پیش کریں گے لیکن یہ ضروری ہے کہ پہلے زیاد کے اس کے خاندان اور استلحاق کے بارے میں اجمالی کیفیت بیان کر دی جائے۔

مورخ ابن اثیر لکھتا ہے کہ :۔

حارث بن کلدہ طبیب کی سمیہ نامی ایک لونڈی تھی۔ اس نے اس کا نکاح اپنے ایک رومی النسل غلام عبیدہ سے کر دیا تھا اور اسی کے یہاں سمیہ کے

بطن سے زیاد پیدا ہوا۔

ابوسفیان بن حرب زمانۂ جاہلیت میں طائف گیا اور ابو مریم سلولی نامی ایک شراب فروش کے یہاں مہمان ہوا۔ وہاں ابوسفیان کی شہوانی آگ بجھانے کے لئے سمیہ اس کی خدمت میں پیش کی گئی اور اس سے زیاد کا حمل ٹھہر گیا۔ چنانچہ ہجرت کے پہلے سال سمیہ نے اسے جنم دیا۔ جب وہ تربیت اور نشو و نما پاکر بڑا ہوا تو ابو موسیٰ اشعری والی بصرہ نے اسے اپنا کاتب بنالیا۔ پھر عمر بن خطاب نے بھی اس کو اس کا اہل سمجھا اور وہ اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔

جب حضرت عمر کی طلبی پر زیاد مدینہ آیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت اس کے پاس انصار و مہاجرین کا ایک جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ زیاد کو موقع ملا اور اس نے ان لوگوں کے سامنے ایک ایسی تقریر کی کہ ویسی تقریر ان لوگوں نے کبھی سُنی نہ تھی عمرو عاص نے کہا' کیسا ذہین لڑکا ہے اگر اس کا باپ قریش ہوتا تو سارے عرب کو اپنے ڈنڈے سے ہانک سکتا تھا۔

ابوسفیان جو اس وقت موجود تھا کہنے لگا' بخدا میں اس کے باپ کو جانتا ہوں۔ اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا' اے ابوسفیان' اپنی زبان بند رکھ' ورنہ عمر نے سن لیا تو وہ تجھ پر کوڑے برسانے لگیں گے۔

غرض کہ وقت ناسازگار حالات کے پیچیدہ راستوں سے گزرتا رہا اور تیسرے دور خلافت کے بعد حضرت علیؑ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے زیاد کو فارس کا عامل مقرر کیا اور زیاد نے وہاں اپنی انتظامی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے امور حکومت کو خوش اسلوبی سے انجام دیا' نیز وہاں کے قلعوں کو محفوظ کرلیا۔ جب معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اسے ناگوار گزرا۔ چنانچہ اس نے زیاد کو ایک تہدیدی خط لکھا اور ابوسفیان کا بیٹا ہونے پر اس کی توجہ مبذول کرائی۔

جب زیاد کو معاویہ کا یہ خط موصول ہوا اور اس نے پڑھا تو بھرے مجمع میں کھڑے ہوکر اس نے تقریر کی جس میں کہا' تعجب اور حیرت ہے اس جگر خوارہ کے بیٹے پر اور اس شرک و نفاق کے بانی پر جو مجھے اس بات کی دھمکی دیتا ہے کہ وہ مجھ پر حملہ کردے گا۔ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان رسول اللہ کے چچازاد بھائی مہاجرین و انصار کی جماعت کے ساتھ موجود ہیں۔ خدا کی قسم اگر معاویہ مجھے جنگ آزمائی کا موقع دے گا تو یقیناً وہ دیکھ لے گا کہ میں کس قدر سخت تلوار کا دھنی ہوں۔

حضرت علیؑ علیہ السّلام کو جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو آپ نے زیاد کو لکھا کہ حاکمیت کا جو منصب میں تمہیں دینا چاہتا تھا وہ دے چکا تھا اور اب میں سمجھتا ہوں کہ تم بھی اس کے اہل تھے۔ ابوسفیان سے بے سوچے سمجھے جو ایک باطل اور جھوٹی خواہش ظاہر ہوگئی تھی وہ اس کے لئے میراث پانے کا سبب نہیں بن سکتی۔ اور نہ ہی اس کا نسب صحیح ہوسکتا ہے۔ معاویہ ہر جانب سے حملہ کرسکتا ہے' اس سے بچے رہنا۔"

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ اور زیاد میں مصالحت کی صورت پیدا ہوئی اور دونوں استلحاق پر اتفاق ہوگیا۔ چنانچہ لوگوں کو جمع کیا گیا' زیاد کے متعلق شہادت دینے والے بھی حاضر ہوئے اور ابو مریم سلولی نے گواہی دی کہ اس کے مکان پر ابوسفیان اور سمیہ کی ملاقات ہوئی تھی۔ اور تمام واقعہ من و عن بیان کردیا۔ اس پر زیاد نے کہا' اے ابو مریم! بس اب ٹھہر جاؤ' تم کو گواہی دینے کے لئے بلایا گیا تھا' یا گالیاں دینے کے لئے؟

قصہ مختصر یہ کہ تھوڑی دیر کی کشمکش اور تبادلۂ گفتگو کے بعد معاویہ نے آخر کار زیاد کو اپنے نسب میں ملالیا۔ معاویہ کا استلحاق پہلا معاملہ تھا جس کے ذریعہ احکام شریعت کی اعلانیہ مخالفت کی گئی [1] اُردو ترجمہ تاریخ کامل نفیس اکادمی کراچی پاکستان۔

زیاد کو ابوسفیان کا نطفہ ثابت کرنے کی کوشش میں ابو مریم کچھ زیادہ حقیقت بیانی پر اتر آیا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ معاویہ کے ہاتھ بک چکا تھا۔ چنانچہ زیاد مشتعل ہوکر چیخ پڑا۔ ابن اثیر کے اردو ترجمہ میں صرف اتنا ہی ہے کہ اس نے تمام قصہ من و عن بیان کردیا۔ وہ قصہ کیا تھا؟ مورخ ابوالفداء کی زبانی سنئے۔"

زمانۂ جاہلیت میں ابوسفیان طائف گیا تو وہ ابو مریم شراب فروش کے یہاں مقیم ہوا۔ جب شام ہوئی تو وہ ابو مریم سے کہنے لگا کہ میں اس وقت عورت کی خواہش میں بہت زیادہ بے چین ہوں۔ اگر کچھ انتظام ہوسکتا ہو تو کرو۔ ابو مریم نے کہا' اگر تم سمیہ کو پسند کرو تو میں اسے بلادوں' لیکن یہ سوچ لو کہ وہ دراز پستان اور قبیح البطن ہے۔ ابوسفیان نے کہا' بھائی' میرے تن بدن میں جو آگ لگی ہوئی ہے اسے کسی طرح بجھنا چاہیئے' تم اسی کو بلادو۔ ابو مریم نے سمیہ کو بلاکر ابوسفیان کے حوالے کردیا۔ ابوسفیان شراب کے نشے میں تمام رات اس کے ساتھ ہم بستری کرتا رہا' جس کے نتیجے میں سمیہ حاملہ ہوگئی اور حمل کی مدت پوری ہونے کے بعد اس نے زیاد کو جنم دیا۔"

بس جب معاویہ نے اس زنا زادے (زیاد) کو اپنے نسب میں شامل کرنا چاہا تو اس امر میں اس نے لوگوں کو گواہی کے لئے طلب کیا چنانچہ منجملہ دیگر گواہان کے ابو مریم شراب فروش بھی گواہی دینے آیا جس نے طائف میں سمیہ کو بلاکر ابوسفیان کے سپرد کیا تھا۔ اس نے گواہی دی کہ ابوسفیان شراب پی کر ساری رات سمیہ کے ساتھ مجامعت کرتا رہا اور میں ایک سوراخ سے یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ سمیہ بے حال تھی اور میں نے بچشم خود اس کی اندام نہانی سے ابوسفیان کا مادۂ حیوانی ٹپکتے ہوئے رات بھر میں متعدد بار دیکھا ہے [1]

[1] تاریخ ابوالفداج ۲ ص ۲۷۸، ۹۷۹۔

پاکستانی مفسر مولانا مودودی کا بیان ہے کہ:۔

"زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انھوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔ لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت معاویہ کے والد جناب ابوسفیان نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا اور اسی سے وہ حاملہ ہوئی۔ حضرت ابوسفیان نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد انھیں کے نطفہ سے ہے۔ جوان ہوکر یہ شخص اعلیٰ درجے کا مدبّر، منتظم، فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا۔ حضرت علیؑ کے زمانۂ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دیں تھیں۔ ان کے بعد حضرت معاویہ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انھیں کا ولدالحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے، مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا۔ کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ "بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو۔ اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں۔" ام المومنین حضرت ام حبیبہ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اس سے پردہ فرمایا [1]۔

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۲۔ ۱۶۳۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا بیان ہے کہ:۔

اس نئے رشتے کی راہ میں امیر معاویہ اور زیاد دونوں کو بڑی بڑی دشواریاں پیش آئیں۔ امیر معاویہ کو اس کے تسلیم کرانے میں اپنی قوم بنی امیہ اور خصوصاً تمام قریش کے ساتھ بڑی سختی کا برتاؤ کرنا پڑا۔ میرا تو خیال ہے کہ لوگوں نے امیر معاویہ کی گرفت سے ڈر کر یا پھر ان سے مالی منفعت کے لالچ میں اس کو منظور کر لیا۔ بہت سوں نے تو بظاہر قبول کیا لیکن دل سے وہ انکاری رہے اور بہتوں نے غیر جانب داری برتی، اس طرح کہ زیاد کو ابوسفیان کی طرف منسوب نہیں کیا صرف اس کا نام لکھ دیا، یا پھر اسے سمیہ کی طرف منسوب کر دیا۔[1]"

غرض کہ تمام سنی علماء اور مورخین نے معاویہ کے اس فعل کو خلاف شرع اور مذموم قرار دیا ہے اور بعض نے تو سخت مذمت آمیز لہجہ اختیار کرتے ہوئے معاویہ کے اس فعل کو محض اس کی سیاسی اغراض کی تکمیل کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن ان بےچاروں کے مسلک کی ایک مجبوری یہ بھی ہے کہ بڑے سے بڑا جرم ثابت ہو جانے کے باوجود وہ نام نہاد صحابہ کا احترام کرتے ہیں اور ان کے نام سے پہلے "حضرت" اور بعد میں "رضی اللہ تعالیٰ عنہ" ضرور لگاتے ہیں۔

بعض ناصبی اور وہابی علماء حسب عادت معاویہ کی صفائی میں اس سفید جھوٹ کا سہارا بھی لیتے ہیں کہ ابوسفیان نے زمانۂ جاہلیت کے دستور کے مطابق سمیہ سے نکاح کیا تھا اور اس کے بعد اس کے ساتھ مباشرت کی تھی جس کے نتیجے میں زیاد پیدا ہوا تھا۔ اور پھر سمیہ نے اسے ابوسفیان سے منسوب کر دیا۔ لہٰذا ناصبیوں اور وہابیوں کی اس جاہلانہ تاویل کو ہم نظر میں رکھتے ہوئے

[1] علیؑ تاریخ و سیاست کی روشنی میں ص ۲۵۳۔

اب اس بات کا جائزہ لیں گے کہ زمانۂ جاہلیت میں رائج شدہ نکاحوں میں سے کس قسم کے نکاح کا اطلاق ابوسفیان کی اس زنا کاری پر ہوتا ہے۔"

زمانۂ جاہلیت کے نکاح

صحیح بخاری کی صراحت کے مطابق زمانہ جاہلیت میں چار طرح کے نکاح رائج تھے۔ پہلا نکاح شرفاء میں سنت ابراہیمی کے مطابق ہوتا تھا جو آجکل بھی مسلمانوں میں رائج ہے۔ دوسرے قسم کے نکاح کی نوعیت یہ تھی کہ بعض شوہر اپنی بیوی کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ ایام سے پاک ہونے کے بعد فلاں شخص کے پاس چلی جانا اور اس کے نطفے سے استفادہ کر لینا، چنانچہ وہ اس شخص کے پاس چلی جاتی تھی اور اس کا شوہر اس وقت تک اس سے دور رہتا تھا جب تک اس کا حمل ظاہر نہ ہو جائے۔ اور جب اسے استقرار حمل کا یقین ہو جاتا تھا تو وہ پھر اسے اپنے تصرف میں لے لیتا تھا۔ یہ صرف اس لئے کیا جاتا تھا کہ اچھی نسل کا بچہ پیدا ہو۔ اس نکاح کو "نکاح استبضاع" کہتے تھے۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ دس سے کم افراد مل کر کسی عورت کی اجتماعی آبروریزی کرتے تھے۔ چنانچہ حاملہ ہونے کے بعد جب وہ کسی بچے کو جنم دیتی تھی تو چند دنوں کے بعد ان سب افراد کو طلب کرتی تھی جو اس کی آبروریزی کے مرتکب ہوتے تھے۔ ان میں سے کسی کی یہ مجال نہیں ہوتی تھی کہ وہ آنے سے انکار کر دے۔ جب سب اکٹھا ہو جاتے تو وہ عورت ان سے کہتی کہ تم لوگوں کو اپنا حال معلوم ہے اور میرے ساتھ تم نے جو کچھ کیا ہے اس سے بھی واقف ہو۔ پھر وہ جس شخص کو مناسب سمجھتی اسے مخاطب کر کے کہتی کہ اے فلاں، یہ بچہ تیرا ہے اور تو اس کا نام تجویز کر۔ وہ نام تجویز کرتا اور بچہ اس کا ہو جاتا۔

چوتھا طریقہ یہ تھا کہ بعض عورتیں مختلف مردوں کی ہوس کا نشانہ بنتی رہتی تھیں۔ یہ عورتیں دراصل لونڈیاں ہوتی تھیں اور شناخت کے لئے یہ اپنے گھروں پر جھنڈے لگاتی تھیں جو اس بات کی علامت تھے کہ کوئی بھی شخص ان کے ساتھ مجامعت کر سکتا ہے۔ لیکن ان عورتوں میں سے اگر کسی کو حمل قرار پا جاتا تھا اور وہ بچے کو جنم دیتی تھی تو باقاعدہ ایک اجتماع ہوتا تھا اور اس میں کسی ماہر قیافہ شناس کو بلایا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ بچے میں جس شخص کی مشابہت کو دیکھتا تھا اس کی طرف اسے منسوب کر دیتا تھا اور وہ اس کا بیٹا تسلیم کر لیا جاتا تھا۔[1]"

زمانۂ جاہلیت کی ان زناکاریوں میں (جنہیں نکاح کا نام دے دیا جاتا تھا) صرف ایک بات مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے نسب کا تحفظ۔ اور یہی بات اس دور کے معاشرے میں ان نام نہاد نکاحوں کو زنا سے جدا کرتی تھی۔ نسب کی یہ نسبت اعلانیہ ہوتی تھی اور جس کی طرف بچہ منسوب کر دیا جاتا تھا وہ اسے قبول کرتا تھا اور اسے اپنے خاندان میں شامل کر لیتا تھا۔

اب زیاد بن سمیہ کی داستان پر نظر ڈالئے جو بالکل مختلف ہے۔ جب سمیہ کے یہاں زیاد پیدا ہوا تو ابوسفیان نے اسے اپنے نسب میں شامل کرنے کا کوئی اعلان نہیں کیا۔ اور پھر فتح مکہ کے بعد جب ابوسفیان اسلام میں داخل ہوا تو اس وقت بھی اس نے اس معاملے کو پیغمبرؐ اکرم کی خدمت میں پیش نہیں کیا، حالانکہ زیاد واقعی اگر اس کا بیٹا تھا تو یہ اس کا اخلاقی اور انسانی فرض تھا کہ وہ اس کی حیثیت کو قانونی شکل دینے کی کوشش کرتا۔ لیکن ابوسفیان نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ یہ روایت ضرور ملتی ہے کہ اس نے ایک مرتبہ حضرت عمر کے دور میں اور

[1] دیکھئے صحیح بخاری کتاب النکاح۔

حضرت علیؑ کی موجودگی میں دبی زبان سے یہ کہا تھا کہ زیاد اس کا نطفہ ہے، جس پر حضرت علیؑ نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

اس کے بعد حضرت عثمان کا دور آیا لیکن ابوسفیان خاموش رہا اور اپنے دل میں یہ راز لئے اسی دور میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ابوسفیان زیاد کی پیدائش کے بعد ۳۴ برس زندہ رہا اور اس عرصہ میں زیاد ایک غلام زادے کی حیثیت اختیار کئے رہا اور عبید کی ولدیت سے پہچانا جاتا رہا لیکن ابوسفیان کو اس کی فکر نہ ہوئی۔ بلکہ ابوسفیان کی موت کے نو برس بعد معاویہ کو اپنے حرامی بھائی کی فکر ہوئی۔

دراصل سیدھی اور سچی بات یہی ہے جسے بالعموم علماء اور مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا قرار دے کر اپنے نسب میں داخل کرنا معاویہ کی سیاسی ضرورت تھی، لہٰذا اس نے اس دور کے معاشرتی معیار کے مطابق بے حیائی کے تمام ریکارڈ توڑ دئے اور بھرے مجمع میں اپنے باپ کی زناکاری پر شہادتیں دلوائیں اور زیاد نے اپنی ماں کے لئے وہ کچھ سنا جسے کوئی بیٹا سن نہیں سکتا۔

زیاد بحیثیت حاکم بصرہ

معاویہ نے زیاد کو اپنا بھائی بنانے کے بعد جمادی الاول ۴۵ھ میں بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ اور حرث ابن عبداللہ ازدی کو بصرہ سے ہٹا کر خراسان اور سجستان کا حاکم بنایا۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد بحرین اور عمان کے علاقے بھی اس کے سپرد کر دئے۔"

زیاد جب بصرہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں فسق و فجور، غنڈہ گردی، لوٹ مار اور لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ اس نے وہاں کے لوگوں کو ایک مقام پر جمع کر کے ان کے سامنے ایک تہدیدی تقریر کی۔ جس کا آغاز عام رواج کے

مطابق اللہ کی حمد و ثناء سے نہیں تھا اس لئے اس تقریر کو "خطبۂ تبرا" بھی کہا جاتا ہے۔

تقریر کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:۔

"اہل بصرہ! غور سے میری باتوں کو سنو اور گوش گزار کر لو۔ سخت جہالت، گمراہی اور فسق و فجور کی آگ اہل فسق کو ہمیشہ جھلساتی رہتی ہے اور یہ وہی امور ہیں جو تم میں سے نالائق لوگ کرگزرتے ہیں اور لائق لوگوں کو بھی اپنی پیٹ میں لے لیتے ہیں۔ چھوٹے انھیں اختیار کرتے ہیں اور بڑے ان سے پرہیز نہیں کرتے...... کیا دن کی لوٹ مار اور رات کی شب گردی کو روکنے والے تم میں نہیں تھے؟ تم نے قرابتوں کا لحاظ رکھا اور دین سے دور رہے۔ تمہارے پاس کوئی عذر نہیں ہے پھر بھی معذور بنتے ہو۔ تم لوگ غنڈوں کو پناہ دیتے ہو اور چوروں واچکوں کی پردہ پوشی کرتے ہو: تم میں سے ہر شخص ایک نالائق کی حمایت کرتا ہے، جیسے کسی کو نہ عذاب کا ڈر ہو اور نہ قیامت کا اندیشہ..... تم نے نادانوں اور بیوقوفوں کی پیروی شروع کر دی ہے۔ تم انھیں اپنی پناہ میں اس طرح لئے رہے کہ انھوں نے اسلام کی توہین کی اور پھر تمہارے پس پردہ گوشۂ رسوائی میں چھپ کر بیٹھ گئے......... یاد رکھو۔ جب تک میں ان کے ٹھکانوں کو نہ ڈھا دوں گا اور انھیں جلا کر خاک نہ کر دوں گا، میرے لئے کھانا اور پانی حرام ہے۔ اس امر کا انجام اسی طرح ہوگا جس طرح آغاز ہوگا۔ نرمی کی جائے گی مگر ایسی کہ جس میں کمزوری نہ ثابت ہو، اور سختی بھی کی جائے گی مگر ایسی کہ جس میں جبر و تشدد نہ ہو..... واللہ، میں غلام کا مواخذہ آقا سے، مسافر کا میزبان سے، مستمند کا اقبال مند سے اور بیمار کا تندرست سے کروں گا۔

"دیکھو" منبر پر جھوٹ بولنا دائمی رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔ تم پر میرا کوئی جھوٹ ثابت ہو جائے تو تم میری نافرمانی کرنا۔ تم میں سے اگر کسی کا مال لوٹا جائے گا تو اس کے نقصان کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ مگر یاد رکھو کہ غنڈہ گردی اور شب

گردی کی کوئی بھی شکایت میرے پاس نہ آنے پائے... اگر کوئی شخص گرفتار ہو کر میرے پاس آیا تو میں اسے قتل کئے بغیر نہیں چھوڑوں گا...... میں تم لوگوں کو صرف اتنی مہلت دیتا ہوں کہ یہ خبر کوفہ تک پہنچ کر تم تک پھر واپس آجائے۔

"میں کسی کی زبان سے جاہلانہ باتیں سننے کا عادی نہیں ہوں اور جو ایسا کرتا ہے میں اس کی زبان کاٹ دیا کرتا ہوں۔ اگر تم لوگ خلاف قانون باتوں پر عمل کروگے تو یہ بھی اچھی طرح سوچ لو کہ ہم نے بھی ہر جرم کی ایک سزا مقرر کی ہے۔ جو شخص کسی کو غرق کرے گا، ہم بھی اسے غرق کر دیں گے، جو کسی کو جلائے گا، تو ہم بھی اسے جلا کر خاک کر دیں گے، جو کسی کے گھر میں نقب لگائے گا تو ہم بھی اس کے دل میں سوراخ کر دیں گے؛ اگر کوئی شخص کسی کے لئے قبر کھودے گا تو ہم اسے اسی قبر میں زندہ دفن کر دیں گے۔ اور یاد رکھو، اپنی زبانوں اور اپنے ہاتھوں کو کبھی مجھ پر دراز نہ کرنا، میں بھی اپنا ہاتھ اور اپنی زبان کو روکے رکھوں گا۔"

اب تم اپنے کاموں میں از سر نو مصروف ہو جاؤ اور اپنے خیالات درست کر لو۔ ایہاالناس! ہم تمہارے رئیس ہیں تمہاری حمایت کرنے والے ہیں اور خدا نے جو حکومت ہمیں عطا کی ہے اس کی رو سے ہم تم پر اپنا حکم چلائیں گے اور خدا نے جو مال غنیمت ہمیں بخشا ہے اس سے ہم تمہاری مدد کریں گے...... ہمارا حق تم پر یہ ہے کہ تم لوگ ہماری مرضی کے موافق ہماری اطاعت کرو۔ اور تمہارا حق ہم پر یہ ہے کہ ہم تمہارے ساتھ انصاف سے کام لیں۔ خبردار۔ مجھ سے بچے رہنا، اگر عام دستور کے خلاف کوئی غلطی تم سے سرزد ہوئی تو میں تمہاری گردن مار دوں گا۔"......

زیاد کی یہ تقریر اپنی نوعیت کی ایک ایسی منفرد تقریر کی تھی کہ جس کا انداز بیان اس دور کے مسلمانوں کے لئے غیر مانوس تھا۔ اس میں ان کے لئے دلجوئی کا سامان بھی تھا اور قہر و غضب کا غلبہ بھی۔ دین کی پاسداری کی گفتگو بھی تھی اور خلاف شرع

سزاؤں کی دھمکیاں بھی، جب کہ اسلام میں یہ ہے کہ ہر شخص خود اپنے افعال و اعمال کا ذمہ دار ہے لیکن زیاد مجمع عام میں اس امر کا اعلان کر رہا ہے کہ میں غلام کا مواخذہ آقا سے، مسافر کا میزبان سے اور بیمار کا تندرست سے کروں گا۔ چور کی سزا اسلام میں یہ ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے لیکن زیاد اس کے دل میں سوراخ کرنے کی سزا کا اعلان کرتا ہے، اسلام میں اس سزا کا کوئی تصور نہیں ہے کہ کسی کو زندہ دفن کر دیا جائے جبکہ زیاد کا اعلان یہ ہے کہ جو شخص کسی کے لئے قبر کھودے گا، اسے میں اسی قبر میں زندہ دفن کر دوں گا۔

زیاد حضرت علیؑ کے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ اس کی اس تبدیلی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے حق کے ساتھ تھا، بعد میں باطل کے ساتھ اس طرح ہو گیا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس تبدیلی کی ایک خاص وجہ معاویہ کے ساتھ اس کا استلحاق تھا۔ عرب نسل کے معاملے کو بہت اہمیت دیتے تھے اور جو صحیح النسب نہیں ہوتا تھا اس کا تمسخر اڑاتے تھے۔ زیاد اچھا خاصا عبید کی ولدیت سے پہچانا جاتا تھا لیکن اپنی ماں کی زناکاری پر برسر عام گواہوں کی شہادت کے سبب وہ ابوسفیان کا بیٹا اور معاویہ کا بھائی بن گیا جو اس دور کے عرب معاشرے میں ذلت و رسوائی والی بات تھی۔ لہٰذا زیاد نے لوگوں کے دلوں میں خوف و دہشت پیدا کرنے کے لئے یہ تقریری حربہ استعمال کیا اور لوگوں کی زبان کو بند کرنا چاہا۔

زیاد کی تقریر میں تضاد کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو حضرت علیؑ کے دور میں اسلامی تعلیمات سے روشناس و فیضیاب ہوتا رہا اور دوسری طرف اس نے معاویہ کے شیطانی پھندے میں پڑ کر باطل سے الحاق کر لیا تھا۔ اور اب بصرہ میں وہ صرف باطل پرست معاویہ کا نمائندہ نہ تھا بلکہ ایک ایسا ولدالزنا گورنر تھا جس کے حرامی ہونے کا فیصلہ برسر عام ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس کے لئے

دوسری کوئی صورت نہ تھی کہ وہ حکومت کے معاملے میں سفاک معاویہ کے نقش قدم پر چلے اور اپنے آقا کے مفاد کی خاطر خون کی ندیاں بہا دے۔

مولوی عبدالوحید خاں اپنی کتاب میں اس کی بربریت کا ایک واقعہ یوں لکھتے ہیں کہ:۔

"زیاد اپنے کوتوال عبداللہ بن حصین کو شہر میں شب گشت کا حکم دیتا تھا۔ چنانچہ وہ گشت پر نکلتا اور جو شخص اسے گھر کے باہر دکھائی دیتا اسے قتل کر دیتا۔ ایک رات ایک اعرابی اسی طرح پکڑا گیا اور کوتوال نے اسے زیاد کے سامنے پیش کر دیا۔ زیاد نے پوچھا کہ کیا تمہیں یہاں کا قانون نہیں معلوم ہے؟ اس نے کہا، خدا کی قسم میں اجنبی ہوں اور آپ کے قانون سے ناواقف ہوں۔ میں تو یہاں اپنی اونٹنی لے کر آیا تھا، اتنے میں رات ہو گئی اور میں یہاں ایک مقام پر ٹھہر گیا۔ اس پر زیاد نے کہا میں تمہیں سچا سمجھتا ہوں لیکن تمہارے قتل میں امت کی بہتری ہے۔ یہ کہہ کر اس نے قتل کا حکم دیا اور اس کی گردن مار دی گئی۔[1]"

زیاد بن سمیّہ کے نام معاویہ کا خفیہ خط

سُلیم بن قیس (المتوفی ۷۰ھ) سے مروی ہے کہ:۔ میرا ایک شیعہ دوست جو معاویہ کے گورنر زیاد بن سمیہ کا کاتب تھا، اس نے مجھے ایک خط دکھایا جو معاویہ نے زیاد کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ اور وہ خط یہ تھا کہ:۔

"امابعد! اے زیاد بن سمیّہ، ہم نے خط لکھ کر دریافت کیا ہے کہ عرب میں کون عزت والا ہے اور کون ذلیل ہے، کون قرب کے لائق ہے اور کون دوری کے لائق، کون قابل اطمینان ہے اور کون قابل احتیاط، دوسری روایت میں ہے کہ کون ان میں

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۴۱۳۔

سے قابل اطمینان اور کون قابل خوف۔"

"اے میرے بھائی! میں عام لوگوں سے زیادہ عرب والوں کو جانتا ہوں۔ اس قبیلہ (بنو ہاشم) پر احسان مندی کا خیال رکھو، ظاہر میں ان کی عزت کرو، باطن میں ان کی توہین کرو۔ میں ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا ہوں۔ میں عام مجالس میں ان کی عزت کرتا ہوں، علٰحدگی میں ان کی توہین کرتا ہوں، یہ لوگ میرے نزدیک سب سے زیادہ بُرے ہیں۔ پوشیدہ طور پر تمہاری مہربانی اور بخشش ان کے سوا دوسروں پر ہو۔ قبیلۂ مضر بن ربیعہ کا خیال رکھو، ان کے امیروں کی عزت کرو اور غریبوں کی توہین کرو، ان کے عوام اپنے امراء کے تابع ہیں۔ ان کو آپس میں لڑاتے رہو، ان میں بدگوئی، تکبر اور نخوت پرلے درجے پر موجود ہے۔ جب تم ایسا کروگے اور ایک کو دوسرے سے لڑاؤ گے تو ان میں کچھ تمہاری امداد کریں گے۔ ان کے قول پر عمل کے مقابل اور ان کے گمان پر یقین کے مقابل کبھی بھروسہ نہ کرنا۔ مسلمان عجمیوں کا خیال رکھنا، ان پر حضرت عمر کے طریقے پر عمل کرنا اس میں ان کی ذلت اور رسوائی ہے۔ عربوں کا ان کی عورتوں سے نکاح کر دینا لیکن ان کا نکاح عربوں کی عورتوں سے نہ کرنا۔ تاکہ عرب ان کے وارث ہو جائیں اور وہ عربوں کے وارث نہ ہوں، ان پر بخشش اور روزی کے معاملے میں کمی نہ کرنا۔ تاکہ وہ جنگوں میں آگے بڑھیں اور راستہ صاف کر دیں اور درخت کاٹیں۔ ان کو نماز میں کسی عرب کا امام نہ بنانا، جب عرب موجود ہوں تو ان میں سے کوئی صف اوّل میں نہ کھڑا ہو۔ ان میں سے کسی کو مسلمانوں کی سرحد کا حاکم نہ بنانا نہ ہی مسلمانوں کے شہروں میں کسی شہر کا حاکم بنانا، وہ مسلمانوں کے فیصلہ جات اور احکامات کے متولی نہ ہوں۔"

یہ حضرت عمر کا طریقہ ہے:

"اللہ تعالیٰ کی قسم اگر وہ اور اس کا ساتھی (شیخین) اللہ کے دین میں سختی اور

قوت سے کام نہ لیتے تو تمام لوگ بنی ہاشم کے غلام ہوتے وہ یکے بعد دیگرے خلافت کے وارث اس طرح ہوتے، جس طرح قیصر و کسریٰ تخت کے وارث ہوتے آئے ہیں۔ لیکن اللہ نے خلافت کو بنی ہاشم سے نکال کر بنی تیم میں داخل کر دیا، پھر یہ خلافت عدی بن کعب کے یہاں چلی گئی، قریش میں ان دونوں قبیلوں سے زیادہ ذلیل کوئی قبیلہ نہیں ہے۔ ہم ذلیل نہیں ہیں، ہم خلافت کے امیدوار ان دونوں قبائل اور ان کی اولاد سے زیادہ تھے اور حقدار ہیں۔ کیونکہ ہم میں دولت اور جنگی صلاحیت موجود ہے۔ ہم ان دونوں سے رشتے کے لحاظ سے رسول اللہ سے زیادہ قریب ہیں۔ پھر خلافت کو حضرت عثمان نے شوریٰ کے ذریعہ جو چھ آدمیوں کے لئے تھا تین دن بعد عوام کی رضامندی سے حاصل کیا۔ حضرت عثمان سے پہلے جس نے بھی خلافت کو حاصل کیا وہ بغیر شوریٰ کے تھا۔"

"تمہارے صاحب حضرت عثمان مظلوم قتل کئے گئے ہیں۔ ہم نے خلافت کو حضرت عثمان کے ذریعہ حاصل کیا کیونکہ جو شخص مظلوم مارا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ولی کو اس کا وارث قرار دیتا ہے۔"

"میری جان کی قسم اے میرے بھائی! اگر حضرت عمر غلام کے قتل کا تاوان آقا کے تاوان کا نصف کر دیتے تو حضرت عمر تقویٰ کے زیادہ قریب ہوتے۔ اگر میں کوئی راستہ پاتا اور مجھے امید بھی ہوتی کہ لوگ میری بات کو قبول کر لیں گے تو میں ضرور ایسا کر دیتا۔ لیکن کیا کروں جنگ کا زمانہ قریب ہے، مجھے لوگوں کے منتشر اور اختلاف کا خوف ہے۔ تمہارے لئے حضرت عمر کا طریقہ کافی ہے۔"

"جب میرا یہ خط موصول ہو جائے تو تم عجمیوں کو ذلیل اور رسوا کرنا اور ان سے قصاص لینا، ان میں سے کسی کو امداد نہ کرنا اور نہ ان کی حاجت روائی کرنا[1]۔"

[1]۔ عجمیوں کا قصور یہ تھا کہ وہ اہل بیت کو دوست رکھتے تھے۔ (مولف)

حضرت عمر نے بہت سی باتوں کی بنیاد اس امت میں رسول اللہ کے حکم کے خلاف ڈالی ہیں۔ رسول اللہ نے مقام ابراہیم کو جس جگہ رکھا تھا حضرت عمر نے اسے تبدیل کر دیا۔ آپ نے پانی نہ ملنے کی صورت میں مجنب کو تیمّم سے منع کر دیا، بہت سی متفرق چیزیں اگر شمار کی جائیں تو ہزار باب زیادہ ہوں لیکن، ان تمام چیزوں سے بہت بڑی، ہمیں سب سے زیادہ محبوب اور ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی بات یہ ہے کہ انھوں نے بنی ہاشم کو خلافت سے نکال دیا حالانکہ بنو ہاشم خلافت کے اہل تھے اور خلافت بنو ہاشم پر ہی زیب دیتی ہے۔ جب تم اس خط کو پڑھو تو اس کے مقصد کو چھپائے رکھو اور خط کو پھاڑ دو۔"

"زیاد بن سمیہ کے کاتب کا بیان ہے کہ جب زیاد نے خط پڑھا تو اس کو زمین پر پھینک کر میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ میرے لئے ہلاکت ہو، کس چیز سے نکلا اور کہاں داخل ہو گیا۔ میں آل محمدؐ کا شیعہ تھا، اب شیطان کا پیرو ہو گیا ہوں اور اس کے گروہ میں شامل ہوں جس نے یہ خط تحریر کیا ہے۔ خدا کی قسم میری مثال ابلیس کی سی ہے جس نے تکبر اور حسد کی وجہ سے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

سُلیمؓ کا بیان ہے کہ۔ میں نے شام ہونے سے پہلے خط کو نقل کر لیا تھا اور جب رات ہوئی تو زیاد بن سمیہ کے قاتل نے وہ خط مجھ سے لے کر پھاڑ دیا اور مجھ سے کہا کہ اس خط کی اطلاع کسی کو نہ ہونے پائے[1]۔"

[1]۔ ماخوذ از سلیم بن قیس ھلالی مرتبہ ملک محمد شریف ص ۱۵۲ تا ۱۵۹۔

سمرہ ابن جندب کے مظالم

۵۰ھ میں جب کوفہ کا حاکم مغیرہ بن شعبہ طاعون کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہوا تو معاویہ نے کوفہ کی حاکمیت بھی اپنے حرامی بھائی زیاد کے حوالہ کر دی جو اس وقت بصرہ کا گورنر تھا۔ شاہی پروانہ ملتے ہی زیاد نے بصرہ میں سمرہ ابن جندب کو عارضی طور پر اپنا قائم مقام بنایا اور خود نظم و نسق کا جائزہ لینے کی غرض سے کوفہ روانہ ہو گیا۔

سمرہ ابن جندب ایک خبیث الفطرت، خونخوار اور ظالم و جابر انسان تھا، اس لئے موقع ملتے ہی انسانی بربریت کی پیاس بجھانے کے لئے اس نے اہل بصرہ کا قتل عام شروع کر دیا۔ ابن سرین کا بیان ہے کہ زیاد کی عدم موجودگی میں اس نے آٹھ ہزار بے گناہ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ چنانچہ زیاد جب کوفہ سے پلٹ کر واپس آیا اور اس نے بصرہ کے مسلمانوں کی یہ حالت دیکھی تو سمرہ سے پوچھا کہ اتنی بڑی تعداد میں مسلمانوں کا خون بہاتے ہوئے کیا تمہیں خدا کا خوف بھی محسوس نہیں ہوا؟ تو سمرہ نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا کہ یہ بنی امیہ کا دور ہے اگر میں اتنے ہی آدمیوں کو اور قتل کر دیتا تو بخدا مجھے کسی خوف کا احساس نہ ہوتا۔

"سرگزشت معاویہ" کے مولف کا کہنا ہے کہ سمرہ ابن جندب نے جن آٹھ ہزار مسلمانوں کو بے جرم و خطا تہ تیغ کیا ان میں سینکڑوں کی تعداد میں عورتیں اور شیر خوار بچے بھی شامل ہیں۔"

ابوالسوار عدوی کا بیان ہے کہ سمرہ بن جندب نے ایک دن صبح کے وقت صرف میری قوم کے سینتالیس ایسے آدمیوں کو قتل کیا جو جامع القرآن تھے۔

ابن اثیر نے لکھا کہ سمرہ ابن جندب جب شہر میں قتل عام کے لئے نکلتا تھا تو مسلح سپاہیوں کا ایک حفاظتی دستہ اسے چاروں طرف سے گھیرے رہتا تھا۔ اس کے آگے تھوڑے فاصلے پر سینکڑوں کی تعداد میں ماہر شمشیر زنوں کا ایک دوسرا دستہ ہوتا تھا جن کے ہاتھوں میں برہنہ تلواریں ہوتی تھیں' یہ لوگ جس شخص کو دیکھتے تھے ایک ہی وار میں اس کی گردن اڑا دیتے تھے۔ چنانچہ ایک دن اس دستہ کے ایک سپاہی نے ایک انتہائی ضعیف' عمر رسیدہ اور بزرگ شخص کی گردن ماردی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ جب سمرہ اپنے گھوڑے پر سوار شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے اس کے قریب پہنچا اور اسے خون میں لت پت دیکھا تو انجان بن کر اس نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ تیرے ظالم سپاہیوں میں سے ایک نے اس بے چارے کا کام تمام کر دیا۔ یہ سن کر سمرہ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ تم لوگ جب یہ سنا کرو کہ ہماری سواری آرہی ہے تو ہماری تلواروں سے بچا کرو کیونکہ کسی وقت تمہارا انجام بھی یہی ہو سکتا ہے[1]۔"

ان ظالمانہ وجابرانہ واقعات کی روشنی میں ہر انسان معاویہ اور اس کے عالموں کی روش کا اندازہ بڑی آسانی سے کرسکتا ہے۔ نیز یہ نتیجہ اخذ کرنے میں بھی اس کے لئے کوئی دشواری نہیں ہے کہ اس دور میں اسلامی عدل کا تصور کیا تھا؟

یہ بات بھی واضح رہے کہ سمرہ صرف معاویہ کا حمائتی تھا' وہ اس کی طرف سے بصرہ کا باضابطہ حاکم نہیں تھا' لیکن اتفاق سے اسے زیاد کی نیابت کا ایک عارضی موقع مل گیا تھا' چنانچہ اس کے تیور بھی بادشاہوں جیسے ہو گئے تھے اور بادشاہ بھی ایسا کہ جس کے نزدیک انسانوں کی حیثیت کیڑے مکوڑوں سے زیادہ قطعی نہیں تھی۔"

---

[1]۔ تاریخ کامل خلافت بنوامیہ واقعات سنہ ۵۰ھ

زیاد اور حجر بن عدی

بصرہ کو سمرہ ابن جندب کے حوالے کر کے زیاد مغیرہ بن شعبہ کی جگہ حاکم کی حیثیت سے جب وارد کوفہ ہوا تو دوسرے دن صبح کی نماز میں اپنے خطبے کے دوران اس نے عثمان کی مدح وستائش کی' ان کے قاتلوں پر تبرا بھیجا اور کوفہ کے شیعوں کو ڈرایا دھمکایا۔ حجر بن عدی جو اس موقع پر موجود تھے زیاد کے اس طرز عمل کو برداشت نہ کر سکے اور بھرے مجمع میں انھوں نے زیاد کا بھی وہی حال کیا جو اکثر و بیشتر مغیرہ بن شعبہ کا کیا کرتے تھے۔ زیاد نے کسی مصلحت پروری کی بنا پر اس وقت حجر کی باتوں کو درگزر کر دیا اور چند دنوں تک کوفہ میں قیام کے بعد وہاں عمرو بن حریث کو اپنا نائب مقرر کر کے بصرہ واپس چلا گیا۔"

عمرو حریث بھی حضرت علیؑ اور ان کے شیعوں کا دشمن اور معاویہ کا ہمنوا و ہمدرد تھا لہٰذا اس نے بھی اپنے خطبوں کے دوران علیؑ اور ان کے شیعوں پر لعنت و ملامت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ اس کی اس بیہودہ حرکت پر حجر بن عدی اور ان کے ساتھی سخت احتجاج کرتے یہاں تک کہ جب یہ خطبہ دینے کے لئے منبر پر کھڑا ہوتا تو یہ لوگ اس کی طرف پتھر اچھالتے اور مٹھیوں میں بھر کر سنگریزے پھینکتے تھے۔

جب عمرو بن حریث کو حجر کی حق پرستی نے عاجز کر دیا تو ان کے خلاف زیاد کے پاس ایک شکائتی خط روانہ کیا اور اس میں لکھا کہ حضرت علیؑ کے تمام شیعہ حجر بن عدی کے پاس جمع ہوتے ہیں اور معاویہ پر اعلانیہ لعنت کرتے ہیں۔

زیاد کو عمرو بن حریث کا یہ خط جب موصول ہوا تو وہ پھر کوفے میں آدھمکا۔ اور نماز ظہر کے بعد اپنے خطبہ میں اس نے حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو مخاطب

کر کے کہا' بلاشبہ بغاوت کا انجام قتل پر مبنی ہوتا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم لوگ خاموش نہ ہوئے تو میں زبردستی تمہیں خاموش کر دوں گا اور کوفہ کو تم لوگوں کو اس طرح پاک کر دوں گا کہ آنے والی نسلیں تمہارے واقعات سن کر عبرت حاصل کریں[1]۔

اس واقعہ کو طبری اور ابن اثیر نے چند لفظوں کی الٹ پھیر کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ نیز ان مورخین نے اپنی کتابوں میں ایک واقعہ اور بھی لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

جمعہ کے دن زیاد نے اپنے خطبے کو اتنا طول دیا کہ نماز میں تاخیر ہونے لگی۔ حجر ابن عدی بھی وہاں موجود تھے انھوں نے دیکھا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے بلند آواز سے "الصلوٰۃ" کہا۔ لیکن زیاد نے بدستور اپنا خطبہ جاری رکھا۔ حجر نے دوسری بار پکار کر کہا "الصلوٰۃ" مگر زیاد نے اس بار بھی کوئی توجہ نہیں دی' آخر کار حجر نے زمین پر ہاتھ مارا مٹھیوں میں کنکریاں بھریں اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ زیاد نے یہ کیفیت دیکھی تو مجبوراً اس نے خطبے کو ترک کیا اور نماز پڑھانے لگا۔

نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد زیاد نے اپنی پہلی فرصت میں حجر بن عدی کے خلاف معاویہ کو ایک شکائتی خط روانہ کیا اور اس میں اس نے کچھ ایسی اشتعال انگیز باتیں تحریر کیں کہ معاویہ نے جواب میں زیاد کو لکھا کہ حجر بن عدی کو زنجیروں میں جکڑ کر ہمارے پاس روانہ کر دو۔ چنانچہ معاویہ کے اس حکم پر حجر اپنے بارہ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کئے گئے اور کچھ دنوں تک کوفہ کے قید خانے میں انھیں مقید رکھنے کے بعد معاویہ کے پاس بھیج دیا گیا[2]۔"

---

[1]۔ تاریخ ابن کثیر ج ۸ واقعات سنہ ۵۱ھ [2]۔ تاریخ طبری وکامل واقعات سنہ ۵۱ھ

بعض مورخین کا بیان ہے کہ حجر ابن عدی آسانی سے زیاد کے قابو میں نہیں آئے بلکہ اسے ان کی گرفتاری کے لئے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں مختلف تاریخی اقتباسات کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

نماز جمعہ کے دوران مسجد میں ہنگامہ آرائی کے بعد زیاد نے کوفہ کے کچھ لوگوں کو ایک وفد کی شکل میں حجر ابن عدی کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ لوگ ان پر دباؤ ڈالیں اور مجبور کریں کہ وہ حضرت علیؑ کی محبت سے دستبردار ہو جائیں اور معاویہ نیز اس کے عمالوں کے خلاف اپنی روش تبدیل کر دیں۔ چنانچہ یہ وفد جب حجر ابن عدی سے ملا اور اس نے زیاد کا مدعا بیان کیا تو حجر نے وفد کے لوگوں کو سختی سے جھڑکتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے علیؑ کی محبت کو تمام مسلمانوں پر واجب قرار دیا ہے؟ جب وفد کے مقتدرین نے کہا یہ سچ ہے تو حجر نے قدر نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ اب تمہیں لوگ انصاف سے بتاؤ کہ ہم اپنی روش میں تبدیلی پیدا کر کے خدا اور رسولؐ کے مجرم کیوں بنیں؟ اس کا جواب وفد کے لوگوں کے پاس نہیں تھا اس لئے وہ خاموشی سے اٹھے اور شرمساری کے ساتھ واپس ہو گئے۔"

واپسی پر اپنی گفتگو کی تفصیل سے زیاد کو مطلع کرتے ہوئے اس وفد کے مقتدرین نے زیاد کو یہ مخلصانہ مشورہ بھی دیا کہ وہ حجر کے معاملے میں کسی قسم کی زیادتی یا تشدد کے بجائے ایک بار پھر غور کرے اور ان کے لئے ہمدردی کا راستہ اختیار کرے مگر زیاد نے ان لوگوں کے مشورے کو ٹھکراتے ہوئے ایک پولیس آفیسر کی قیادت میں چند سپاہیوں کو اس بات پر مامور کیا کہ وہ لوگ حجر کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کریں۔ "چنانچہ پولیس والوں کی یہ جماعت جب حجر کی گرفتاری کے لئے ان کے گھر پہنچی تو حجر اور ان کے ساتھیوں سے ان کا مقابلہ ہوا اور دونوں طرف سے جم کر لاٹھی ڈنڈے

اور پتھر چلے جس میں متعدد افراد بری طرح زخمی بھی ہوئے۔ اسی ہنگامہ آرائی کے دوران حجر کو بچ نکلنے کا موقع فراہم ہوگیا اور پولیس والے ہاتھ مل کر رہ گئے۔"

اس کے بعد حجر دشمنوں کی نظروں سے چھپتے چھپاتے قبیلۂ نخع میں مالک اشتر کے بھائی عبداللہ بن حارث کے گھر پہنچے۔ عبداللہ نے بڑی گرمجوشی سے حجر کا استقبال کیا اور حالات دریافت کئے۔ حجر نے واقعات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اپنے قیام کا ارادہ ظاہر کیا۔ عبداللہ نے کہا یہ آپ کا گھر ہے آپ شوق سے یہاں رہیں، اگر آپ کے تحفظ میں میری جان بھی چلی جائے گی تو مجھے کوئی ملال نہ ہوگا۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک شخص نے آکر حجر کو مطلع کیا سرکاری آدمی قبیلۂ بنی طے میں آپ کو تلاش کر رہے ہیں، ممکن ہے کہ وہ یہاں بھی آجائیں لہٰذا مناسب ہوگا کہ آپ اپنا ٹھکانا تبدیل کردیں۔ اس خبر کے بعد حجر نے عبداللہ بن حارث سے مشورہ کیا اور رات میں بھیس بدل کر انھیں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔ شب کی تاریکی میں یہ دونوں حضرات محلہ بنی ازد میں ربیعہ ازدی کے گھر پہنچے اور وہاں مقیم ہوئے۔"

اِدھر پولیس کی جماعت جب اپنی مہم میں ناکام ہوگئی تو زیاد نے محمد بن اشعث کو اس کام پر مامور کیا اور اسے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر تین دن کے اندر حجر بن عدی گرفتار نہ ہوئے تو میں تیرے جسم کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دوں گا۔"

حجر ابن عدی کو جب اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے قرعہ ابن سلم کے ذریعہ محمد بن اشعث کے پاس یہ پیغام کہلوایا کہ میں اور میرے ساتھی اس شرط پر خود کو زیاد کے حوالے کرسکتے ہیں کہ وہ امان کا وعدہ کرے اور بغیر کسی تعرض و باز پرس کے ہمیں معاویہ کے پاس بھیج دے۔ چنانچہ زیاد نے امان دینے اور معاویہ کے پاس بھیجنے کا وعدہ کیا اور محمد بن اشعث نے حجر اور ان کے بارہ ساتھیوں کو زیاد کے دربار میں حاضر کر دیا۔[1]

[1] دیکھئے تاریخ طبری و تاریخ کامل ابن اثیر وغیرہ۔

حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کی اس اجتماعی گرفتاری کے بعد ان کے خلاف فرد جرم تیار کرنے کے لئے زیاد کو گواہوں کی فکر ہوئی۔ لہٰذا اس نے اپنے وعدے کا کوئی پاس و لحاظ نہیں کیا اور معاویہ کے پاس بھیجنے کے بجائے انھیں قید کر دیا تاکہ نصاب شہادت کوفہ ہی میں مکمل ہوجائے۔ چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ:۔

زیاد نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قید کرنے کے بعد روسائے اربعہ[1] کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ تم لوگ حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے افعال پر گواہ بن جاؤ۔"

"پہلے تو ان لوگوں نے پس و پیش کیا لیکن جب زیاد نے ان پر دباؤ ڈالا تو ان لوگوں نے اپنے بیان میں یہ کہا کہ حجر ابن عدی نے لوگوں کو اپنے پاس جمع کیا انھیں خلیفۂ وقت کے خلاف ابھارا اور معاویہ کو برا بھلا کہا، اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ آل ابوطالبؑ کے علاوہ خلافت اور کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔ یہ لوگ ان پر درود بھیجتے ہیں اور ان کے دشمنوں سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔"

زیاد ان لوگوں کے اس بیان سے مطمئن نہ ہوا اور اس کی پیشانی پر غضب کی شکنیں ابھرنے لگیں۔ ابوبردہ ابن ابوموسیٰ اشعری زیاد کا مقصد سمجھ گئے چنانچہ انھوں نے فوراً اپنے بیان کو پلٹا اور کہا، میں ابوبردہ، ابن ابوموسیٰ اشعری خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس امر کی گواہی دیتا ہوں کہ حجر ابن عدی نے طاعت و جماعت کو ترک کیا، خلیفۂ وقت پر لعن طعن کی اور اپنے گرد و پیش لوگوں کو جمع کرکے انھیں اس

[1] اس وقت کوفہ کی آبادی چار قبیلوں میں تقسیم تھی اور ہر قبیلے پر ایک رئیس مقرر تھا۔ چنانچہ اہل مدینہ پر عمرو بن حریث، قبیلہ ربیع تمیم اور ہمدان پر خالد بن عرفطہ، قبیلہ کندہ پر قیس بن ولید ربیعہ اور قبیلہ مذحج و اسد پر ابن ابوموسیٰ اشعری رئیس مقرر تھے اور انھیں کو روسائے اربعہ کہا جاتا تھا۔" (مولف)

بات کی ترغیب دی کہ وہ معاویہ کی بیعت توڑ کر اس کے خلاف جنگ کریں اور اسے معزول کر دیں۔"

ابوبردہ کا بیان زیاد کو پسند آیا۔ چنانچہ اس نے لوگوں سے بھی اسی طرح کا بیان دینے کو کہا، یہاں تک کہ اس نے ستر آدمیوں کی جھوٹی گواہیاں قلمبند کیں جن میں کچھ صحابہ زادے بھی تھے، مثلاً اسحاق بن طلحہ، اسماعیل بن طلحہ، منذر بن زبیر، اور عمرو بن سعد بن ابی وقاص وغیرہ۔

اس کے بعد زیاد نے ان لوگوں کے نام فہرست گواہان سے خارج کر دئے جن کا اعتماد ان کی نظر میں مشکوک تھا، نیز اس نے شریح بن حارث قاضی اور شریح بن ہانی کے نام فہرست میں بڑھا دئے جو اپنی قد آور شخصیت کے لحاظ سے کوفے میں سر بلند و ممتاز تھے۔

اس سلسلے میں قاضی شریح کا کہنا ہے کہ زیاد نے حجر ابن عدی کے بارے میں مجھ سے جب پوچھا تھا تو اس سے میں نے یہ کہا تھا کہ حجر ایک متقی، پرہیز گار، عبادت گزار اور روزہ دار انسان ہیں، اس کے علاوہ میں نے اور کوئی بیان ہی نہیں دیا تھا۔ اور شریح بن ہانی کا کہنا ہے کہ میں نے حجر کے خلاف کسی قسم کی کوئی گواہی نہیں دی لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ زیاد نے میرا فرضی بیان قلمبند کرلیا ہے تو میں نے اس پر لعنت ملامت کی اور اسے کاذب قرار دیا۔[1]"

غرض کہ فرضی، جعلی اور جھوٹی گواہیوں کی بنیاد پر جب حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف فرد جرم مرتب ہوگئی تو زیاد نے ان لوگوں کو قید خانے سے نکال کر وائل بن حجر اور کثیر ابن شہاب وغیرہ کی سپردگی میں معاویہ کی طرف روانہ کیا۔

[1] تاریخ کامل واقعات سنہ ۵۱ھ۔

ابھی یہ لوگ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ شریح بن ہانی ایک خط لئے ہوئے پہنچے اور کثیر ابن شہاب سے انھوں نے کہا کہ میرا یہ خط خلیفۃ المسلمین معاویہ تک پہنچا دینا، لیکن کثیر نے ان کا خط لینے سے انکار کر دیا تو شریح نے وہ خط وائل کو دیا اور قافلہ روانہ ہوگیا۔

غیر مانوس اور ناہموار راستوں سے گزرتا ہوا قیدیوں کا یہ قافلہ "مرج عذرا[1]" کے مقام پر پہنچا تو معاویہ کے حکم سے حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں[2] کو یہیں قید کر دیا گیا۔[3]

اس کے بعد وائل اور کثیر نے معاویہ کے روبرو زیاد کا خط اور اس فرد جرم کو پیش کیا جو حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کے خلاف جھوٹی اور فرضی گواہیوں کی بنیاد پر مرتب کی گئی تھی اور جس میں حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کو باغی قرار دیا گیا تھا۔

دوسرے دن معاویہ نے دربار عام کا انعقاد کیا اور اہل شام کو زیاد کا خط پڑھ کر سنایا، نیز اس فرد جرم پر لوگوں کا مشورہ طلب کیا جو حجر وغیرہ کے خلاف زیاد کے نمائندے کوفے سے لے کر آئے تھے۔ اس سلسلے میں عام لوگوں کی رائے یہ تھی کہ حجر اور

[1] یہ مقام دمشق سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ [2] حجر ابن عدی کے ساتھ ارقم بن عبداللہ کندی، شریک بن شداد حضرمی، قبضیہ بن ضبیعہ عصبی، صیفی بن فیل، کریم بن عفیف خثعمی، عاصم بن عوف بجلی، ورقا بن سمی بجلی، کدام بن حیان عنزی، عبداللہ بن حسان عنزی، محرز بن شہاب تمیمی، عبداللہ بن جویہ سعدی اور محرمہ بن نافل ازدی گرفتار کئے گئے تھے۔ بعد میں زیاد نے عامر بن اسود کی سپردگی میں عتبہ بن اخنس اور سعد بن عزان ہمدانی کو اور بھیجا تھا۔ اس طرح حجر بن عدی سمیت کل پندرہ آدمی ہو گئے تھے۔ (مولف) [3] دیکھئے تاریخ ابن اثیر، ابن کثیر اور طبری وغیرہ

ان کے ساتھیوں کو شام کے قریوں اور دیہاتوں میں منتشر کر دیا جائے۔

اس کے بعد وائل نے شریح ابن ہانی کا وہ خط جو انھوں نے راستے میں دیا تھا، معاویہ کی خدمت میں پیش کیا، جس میں لکھا تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ زیاد نے آپ کے پاس حجر بن عدی کے خلاف میری گواہی لکھ کر بھیجی ہے۔ ان کے بارے میں میری شہادت یہ ہے کہ حجر ایک صالح، متقی اور پرہیزگار انسان ہیں نیز ان کا شمار عبادت گزاروں، روزہ داروں، حج کرنے والوں، زکواۃ دینے والوں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والوں میں ہے، ان کا خون بہانا یا ان کا مال لینا حرام ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے چاہے انھیں قتل کرو چاہے چھوڑ دو۔

اس خط کی بازیابی کے بعد معاویہ حجر اور ان کے ساتھیوں کے لئے قتل کا حکم صادر کرنے میں تذبذب کا شکار ہو گیا اور اپنی اس کیفیت کے بارے میں اس نے زیاد کو ایک خط لکھا۔

جواب میں زیاد نے معاویہ کو تحریر کیا کہ اگر آپ کوفہ پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کا خاتمہ ضروری ہے اور اگر کسی وجہ سے آپ انھیں چھوڑتے ہیں تو انھیں ہرگز ہرگز کوفہ واپس نہ بھیجئے گا۔

زیاد کا یہ جوابی خط یزید بن حجیشہ لے کر آیا اور یہ شخص جب مرج عذرا میں داخل ہوا تو قیدیوں سے مل کر اس نے کہا کہ یہ خط جو میں معاویہ کے لئے لایا ہوں اس کا انجام تم لوگوں کا قتل ہے۔ اب جو کچھ تم لوگ اپنے لئے بہتر سمجھتے ہو وہ مجھ سے کہو تاکہ جو مدد مجھ سے ممکن ہو سکے وہ میں کروں۔ لیکن حجر ابن عدی اور اس کے ساتھیوں نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔"

حجر ابن عدی کا قتل

یزید بن حجیشہ کے ذریعہ زیاد کا جوابی خط موصول ہونے کے بعد معاویہ نے حجر اور ان کے اصحاب میں سے چھ افراد کو اپنے مقربین اور روسائے شام کی سفارش پر معاف کر دیا اور باقی قیدیوں کے پاس یہ پیغام بھجوایا کہ اگر وہ لوگ حضرت علیؑ سے تبرا اور ان پر لعنت کریں تو انھیں بھی رہائی مل سکتی ہے۔ یہ پیغام سن کر حجر اور ان کے باقی ساتھیوں نے کہا کہ خواہ ہماری جانیں رہیں یا جائیں لیکن یہ فعل ہم سے کسی بھی قیمت پر سرزد نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان کے لئے قبریں تیار کرنے اور کفن مہیا کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ یہ لوگ ساری رات نمازوں اور دعاؤں میں مشغول رہے یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو معاویہ کے بعض اصحاب نے ان سے کہا، رات بھر ہم نے تمہاری طولانی نمازوں اور دعاؤں کی آوازیں سنیں۔ اب یہ بتاؤ کہ حضرت عثمان کے بارے میں تمہارا کیا خیال اور کیا عقیدہ ہے؟ حجر اور ان کے ساتھیوں نے اس سوال کا منہ توڑ جواب دیا اور کہا کہ عثمان ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دین میں فتنہ برپا کیا، بیت المال کو اپنا ذاتی سرمایہ سمجھا اور اسلام میں ملوکیت کی راہ ہموار کی جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے انھیں قتل کر دیا۔ اس بے ایمان خلیفہ کے بارے میں اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اس جواب پر معاویہ کے حواریین بھڑک اٹھے اور انھوں نے کہا، امیر المومنین معاویہ نے تم لوگوں کو خوب پہچانا تھا، اب تم لوگ انجام بھی دیکھو۔ یہ کہہ کر ان لوگوں نے جلادوں کو اشارہ کیا اور وہ برہنہ تلواریں لے کر کھڑے ہو گئے۔

حجر اور ان کے ساتھیوں کو تہ تیغ کرنے سے پہلے جلادوں نے بھی کہا کہ علیؑ پر تبرا کرو۔ انھوں نے جواب دیا کہ حضرت علیؑ اور ان کی اولادوں سے تولیٰ ہمارا ایمان ہے

اور ہم اس شخص پر تبرا کرتے ہیں جو علیؑ پر تبرا کرتا ہے۔ یہ سن کر جلادوں میں سے ایک نے قتل کرنے کی غرض سے حجر کے ایک ساتھی کو اپنی طرف کھینچا۔ جب تلوار اٹھی تو قیدیوں میں سے دو آدمیوں نے کہا کہ ہمیں معاویہ کے پاس بھیج دو، وہ علیؑ کے بارے میں جو کہلوانا چاہتا ہے ہم اس کے سامنے کہہ دیں گے۔ چنانچہ ان دونوں کو معاویہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد حجر کے باقی ساتھی ان کی آنکھوں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ جب حجر کی باری آئی تو انھوں نے جلادوں سے کہا، مجھے وضو کر لینے دو۔ کہا کر لو۔ جب حجر وضو کر چکے تو کہا، مجھے دو رکعت نماز بھی پڑھ لینے دو۔ جلادوں نے کہا، اگر نماز سے تمہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو وہ بھی پڑھ لو۔ غرض کہ ادھر حجر ابن عدی کی نماز تمام ہوئی ادھر سنسناتی ہوئی تلوار چلی اور ایک سچے صحابیٔ رسولؐ اور عاشق حیدر کرار کا سر تن سے جدا ہو گیا۔[1] خدا معاویہ اور زیاد ابن سمیہ پر لعنت کرے اور انھیں جہنم کی آگ سے ہمکنار کرے! آمین۔"

حجر کے دو ساتھیوں کا انجام

جلادوں سے حجر کے جن دو ساتھیوں نے معاویہ کے پاس بھیج دینے کی خواہش ظاہر کی تھی جب وہ اس کے سامنے حاضر کئے گئے تو ان میں سے ایک نے کہا، اے معاویہ! خدا سے ڈر تجھے بھی ایک دن اس دنیا سے جانا ہے، آخر تو ہمیں بے سبب کیوں قتل کرنا چاہتا ہے؟ معاویہ نے پوچھا، علیؑ کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا، جو تم کہتے ہو۔ پوچھا، علیؑ جس دین پر تھے اس دین سے کیا تو برأت کرے گا؟ اس نے کہا ہرگز نہیں۔ اتنے میں شمر جو اس موقع پر موجود تھا، اٹھ کھڑا ہوا اور اس

[1] خوداز: سرگزشت معاویہ ص ۲۲۲۔ ۲۲۳

نے کہا، اے امیر المومنین! یہ میرا ابن عم ہے اسے میرے حوالے کر دیجئے۔ معاویہ نے کہا میں نے اس شخص کو تیرے حوالے کیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب تک میری حکومت ہے یہ کوفہ میں نہیں رہے گا۔ چنانچہ وہ اپنی خواہش کے مطابق موصل کی طرف چلا گیا۔ اسی طرح معاویہ نے حجر کے دوسرے ساتھی سے بھی سوال کیا کہ علیؑ کے بارے میں تو کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا اے معاویہ! بہتر ہے کہ یہ بات تو مجھ سے نہ پوچھ، معاویہ نے کہا، جب تک تو یہ نہ بتائے گا میں تجھے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر تو مجھے مجبور کرتا ہے تو سن لے کہ حضرت علیؑ عبادت خدا کرنے والے، حق کا حکم دینے والے، عدل قائم کرنے والے، لوگوں کو درگزر کرنے والے اور اسلام کو تحفظ فراہم کرنے والے تھے۔ اس کے بعد معاویہ نے کہا عثمان کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے جواب دیا۔ عثمان ہی نے سب سے پہلے ظلم کا دروازہ کھولا اور اسلام کے دروازے کو ہلا کر رکھ دیا۔

یہ حق گوئی سننے کے بعد معاویہ نے کہا، اب اپنا قاتل تو خود بن گیا، میں تجھے قتل نہیں کروں گا۔ اس کے بعد معاویہ نے اسے زیاد کے پاس کوفہ روانہ کر دیا اور لکھا کہ اس شخص کو بری طرح قتل کرنا، چنانچہ زیاد نے انھیں زندہ دفن کر دیا۔[1]"

حجر بن عدی کی عظمت و بزرگی

حضرت حجر ابن عدی کا شمار دور رسالت کے ان مقتدر اور جلیل القدر صحابہ میں تھا جو رسولؐ اور آل رسولؐ کی محبت میں سرشار اور ان پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان کی شہادت سے متاثر ہو کر جن شعراء

[1] طبری واقعات ۵۱ھ۔ طبری ج ۶ ص ۳۱۱۔

نے مرثیے کہے تھے ان میں ایک انصاری شاعرہ ہند بنت زید کے دو شعروں کا ترجمہ قابل توجہ ہے۔

"اے فلک کے روشن و منور چاند! ذرا اور بلند ہو کر دیکھ تو تجھے سفر کرتا ہوا حجر نظر آئے گا۔ وہ ابن حرب (معاویہ) کی طرف جا رہا ہے تاکہ امیر کے ارادے کے مطابق قتل کیا جا سکے۔ حجر کے بعد ظالم و جابر لوگوں کو آرام مل ہی گیا، لیکن ان کا ٹھکانا صرف جہنم ہے۔ اے حجر! اے جنت کے مسافر تجھ پر لاکھوں سلام، خدا تجھے خوش و مسرور رکھے۔"[1]

مولوی عبدالوحید خاں اپنی کتاب "سرگزشت معاویہ" میں رقم طراز ہیں کہ:۔

حجر ابن عدی کو بچانے کے لئے ام المومنین حضرت عائشہؓ نے معاویہ کے پاس سفارشی پیغام بھیجا تھا لیکن پیغامبر اس وقت پہنچا جب حجر اور ان کے اصحاب قتل کئے جا چکے تھے۔ جب ام المومنین کو ان کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو وہ بیحد رنجیدہ ہوئی اور معاویہ پر لعنت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ بخدا میرے علم میں یہ ہے کہ حجر ایک دیندار، متقی پرہیزگار اور راست گو صحابی تھے۔[2]

علامہ عبدالبر کا بیان ہے کہ:۔

عبداللہ ابن عمر بازار میں ایک دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ انھیں حجر بن عدی کی شہادت کا حال معلوم ہوا۔ بس انھوں نے اپنی ردا سمیٹی اور بے اختیار روتے اپنے گھر کی طرف چل دئے اس کے بعد وہ چالیس روز تک وہ گھر سے باہر نہیں نکلے۔

حجر ابن عدی اور ان کے اصحاب کی شہادت کے بعد معاویہ جب حج کے لئے شام سے مکے آیا تو حضرت عائشہ سے بھی ملا۔ اس وقت عائشہ نے پوچھا کہ اے معاویہ!

---

[2] سرگزشت معاویہ ص ۴۲۷

کیا حجر اور ان کے اصحاب کو قتل کرتے وقت تجھے خدا کا خوف نہیں ہوا؟ معاویہ نے جواب دیا کہ میں نے انھیں قتل نہیں کیا، ان کے قاتل تو دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کے خلاف گواہیاں دی ہیں۔"

معاویہ کا یہ جواب بالکل اسی قسم کا تھا جیسا کہ اس نے جنگ صفین میں حضرت عمار یاسر کی شہادت کے موقع پر دیا تھا۔ جب اس کے لشکر میں رسول اکرم کی یہ حدیث گشت کرنے لگی کہ "عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا" تو اس کو سن کر معاویہ گھبرایا اور اس نے فوراً یہ بہانا تلاش کیا کہ عمار یاسر کا قاتل میں نہیں ہوں بلکہ علیؑ ہیں جو انھیں میدان میں لائے ہیں۔ یہ حیرت انگیز جواب سن کر حضرت علیؑ نے فرمایا تھا کہ اس طرح تو حضرت حمزہ کے قاتل رسول اللہ ہوئے جو انھیں میدان جنگ میں لائے تھے۔

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مکاری کی باتیں معاویہ کے مزاج کا حصہ تھیں۔ اور یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کسی کے قتل کی ذمہ داری گواہوں پر اس وقت عائد کی جا سکتی ہے جب حاکم شرع گواہوں کی صداقت کو قوانین شریعت کے مطابق جانچ اور پرکھ لے لیکن حجر کے کیس میں تو شرعی تقاضے پورے ہی نہیں کئے گئے۔ صوبے کے عامل زیاد نے انتظامیہ کی ایک فرد کی حیثیت سے حجر اور ان کے اصحاب کے خلاف گواہیاں جمع کرنے میں جو طریقہ کار اپنایا اس کا کوئی تعلق عدل و انصاف سے نہیں تھا۔ زیاد نے روسائے اربعہ کے پہلے بیان کو ناکافی سمجھ کر حضرت علیؑ کے مخالف شخص ابوموسیٰ اشعری کے بیٹے سے بیان لیا اور اسے اپنی مرضی کے مطابق پاکر دوسرے لوگوں کو بھی حکم دیا کہ وہ بھی ایسا ہی بیان دیں۔ اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قاضی شریح اور شریح بن ہانی کی جعلی شہادت بھی شامل کر دی۔ اور پھر جب یہ مقدمہ معاویہ کی عدالت میں پیش ہوا تو اس نے بھی اس سلسلے میں کسی شرعی تقاضے کو پورا نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اس بات سے

ضرور واقف رہا ہوگا کہ شہادتیں قبول کرنے کے سلسلے میں حضرت رسول خدا کا طرز عمل کیا تھا؟

ابوداؤد نے اپنی سنن میں روایت کی ہے کہ حضور نے فرمایا:۔ جب دونوں فریق تمہارے سامنے بیٹھ جائیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک دوسرے فریق کی بات نہ سن لو۔"

اس کے علاوہ انصاف و عقل سلیم کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ حاکم گواہوں کو ذاتی طور پر حاضر ہونے کا حکم دے اور ان کا بیان ملزم کے روبرو قلم بند کرے اور ملزم کو ان کے بیان پر جرح کا موقع فراہم کرے تاکہ ان کی گواہی کی اصل حقیقت سامنے آ سکے۔ لیکن معاویہ نے اس ذیل میں کوئی اخلاقی، شرعی یا قانونی تقاضہ پورا نہیں کیا بلکہ وہ طریقہ اختیار کیا جو ایک مطلق العنان بادشاہ کا ہوا کرتا ہے۔

اگر شرعی قانون کے تحت حجر اور ان کے چودہ ساتھی بغاوت کے مجرم ہونے کی بنا پر واجب القتل تھے اور معاویہ نے شرعی شہادت سے مجبور ہو کر (جیسا کہ اس نے حضرت عائشہ سے کہا تھا) ان کے قتل کا حکم دیا تھا تو پھر ان میں چھ یا سات افراد کو معاف کرتے وقت یہ شہادتوں کی مجبوری کہاں چلی گئی تھی۔ انھیں صرف اس لئے معاف کر دیا گیا کہ ان کی سفارش خود معاویہ کے مقربین نے کی تھی۔

سنی مورخین اور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ حجر بن عدی اپنے زہد و تقویٰ کے ساتھ بڑے عبادت گزار صحابی تھے۔ ان کے مظلومانہ قتل پر حضرت عائشہ کو بھی صدمہ پہنچا اور عبداللہ ابن عمر بھی روئے یہاں تک کہ خود معاویہ کے اپنے آدمی ربیع بن زیاد حارثی کو اتنا زیادہ دکھ ہوا کہ انھوں نے اپنی جان دے دی لیکن اس دور کے درباری اور ناصبی معاویہ کے دامن سے بے گناہوں کے خون کو صاف کرنے کی خاطر حجر اور ان کے اصحاب کو باغی ثابت کر کے انھیں واجب القتل قرار دینے کی کوشش کرتے

ہیں۔ اگر سنی مسلک کے مطابق معاویہ کی بے جا وکالت محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ صحابی تھے تو پھر حجر تو ایک متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار صحابی تھے ان کی مظلومانہ شہادت کو ایک باغی کا قتل کیوں قرار دیا جاتا ہے؟ بات صرف اتنی ہی ہے کہ حجر بن عدی حضرت علیؑ اور رسول کے نواسوں سے محبت کرتے تھے، ان کے حامی اور مددگار تھے لہٰذا اہل سنت کا وہ طبقہ جو بنی امیہ کی حمایت کو اپنا فرض سمجھتا ہے حجر کو باغی ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ اگر حجر کے حالات کا ایمانداری اور انصاف پسندی سے جائزہ لیا جائے تو یہ فیصلہ کرنا دشوار نہ ہوگا کہ ان کی سرگرمیاں بغاوت کے زمرے میں نہیں آتیں۔

عمرو بن حمق کا قتل

حجر ابن عدی اور ان کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد زیاد کے خوف سے عمرو بن حمق کوفہ چھوڑ کر رفاعہ بن شداد کے ساتھ مدائن کی طرف چلے گئے تھے، لیکن جب وہاں بھی انھیں خطرہ محسوس ہوا تو وہ موصل گئے اور وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں کے پہاڑ کی گھاٹیوں میں روپوش ہو گئے۔"

گاؤں کا مکھیا (عامل) عبداللہ ابن ابی بلتعہ تھا، جب اسے پتہ چلا کہ دو مشتبہ افراد پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپے ہوئے ہیں تو وہ چند سواروں کو اپنے ساتھ لے کر ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ رفاعہ بن شداد چونکہ ایک نوجوان، تندرست و توانا، قوی ہیکل اور طاقتور آدمی تھے اس لئے وہ لڑ بھڑ کر نکل جانے میں کامیاب ہو گئے۔ عمرو بن حمق ضعیف العمر اور بیمار تھے اس لئے وہ اپنے کو بچا نہ سکے اور گرفتار ہو گئے۔

گاؤں کے مکھیا عبداللہ ابن ابی بلتعہ نے عمرو بن حمق سے ان کے بارے میں بہت کچھ پوچھا مگر انھوں نے اسے کچھ نہ بتایا۔ آخر کار اس نے انھیں موصل کے حاکم

عبدالرحمٰن ثقفی کے پاس بھیج دیا اور اس نے دیکھتے ہی انھیں پہچان لیا اور اس کی اطلاع اس نے معاویہ کو دے دی۔

معاویہ کا جواب آیا کہ عمرو بن حمق نے عثمان پر نو۹ وار تیر کے کئے تھے لہٰذا تم بھی ان پر نو مرتبہ تیر چلاؤ اور ان کا کام تمام کر دو۔ چنانچہ معاویہ کے حکم کی تعمیل کی گئی اور عمرو بچارے دوسرے ہی وار میں ختم ہو گئے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن ثقفی نے عمرو کا سر کاٹ کر معاویہ کے پاس روانہ کر دیا۔

ابن کثیر کا بیان ہے کہ جب عمرو بن حمق کا سر معاویہ کے دربار میں پہنچا تو اس نے حکم دیا کہ اس سر کو شام کے بازاروں اور گلیوں میں پھرایا جائے تاکہ اسے دیکھ کر لوگ عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ وہ سر کوچہ و بازار میں پھرایا گیا اور یہ پہلا سر تھا جس کی اس طرح تشہیر و بے حرمتی کی گئی۔ اس کے بعد معاویہ نے عمرو کے سر کو ان کی بیوی آمنہ بنت شرید کے پاس بھیجا جو اس وقت قید خانے میں تھی۔[1]"

مولوی عبدالوحید خاں رقم طراز ہیں کہ:۔

"معاویہ نے جن ظالموں کے ہاتھ عمرو بن حمق کے سر کو ان کی بیوی کے پاس قید خانے میں بھیجا تھا، ان لوگوں نے جا کر اس کی گود میں ڈال دیا۔ اس نے سر کو بغور دیکھا، پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا، آخر کار معاویہ مردود نے تمہیں قتل کر کے میرے پاس بھیج ہی دیا۔[2]"

واضح رہے کہ تاریخ اسلام میں کسی مسلمان کا سر قلم کرنے کا پہلا واقعہ معاویہ کے حکم سے صفین میں رونما ہوا جب صحابیٔ رسولؐ حضرت عمار یاسر کا سر کاٹا گیا اور عمرو بن حمق سے متعلق یہ واقعہ بھی معاویہ ہی کی بدولت اور اسی کے حکم سے رونما ہوا۔"

۱؎ تاریخ ابن کثیر ۲؎ سرگزشت معاویہ ص ۴۳۱

عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کا قتل

خالد بن ولید، جنھیں سلمان "سیف اللہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، ان کے فرزند عبدالرحمٰن کو معاویہ نے زہر دلوا کر ہلاک کر دیا۔ حالانکہ عبدالرحمٰن معاویہ کے قریبی دوستوں میں تھے اور جنگ صفین میں اس کی طرف سے حضرت علیؑ کے خلاف لڑنے آئے تھے۔

یہ وہی عبدالرحمٰن ہیں، جو عثمان کے عہد خلافت میں معاویہ کی طرف سے حمص میں اس کے نائب کی حیثیت سے تعینات تھے تو اس وقت جناب مالک اشتر اور ان کے ساتھیوں کو جلا وطنی کا کچھ وقفہ ان کے زیر نگرانی رہ کر بھی گزارنا پڑا تھا اور اس دوران انھوں نے عثمان اور معاویہ کو خوش کرنے کے لئے ان محترم لوگوں کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز سلوک کئے تھے۔

غرض کہ عبدالرحمان زندگی بھر بنی امیہ کے حامی، مددگار اور نمک خوار رہے لیکن اس کے باوجود اموی غاصب خلیفہ کی سازش کا شکار ہو کر انھوں نے اپنی جان گنوا دی۔

طبری کا بیان ہے کہ:۔

"عبدالرحمٰن بن خالد جب روم سے حمص واپس آئے تو ابن اثال نصرانی نے شربت میں ملا کر ان کو زہر دے دیا اور انھوں نے وہ شربت پی لیا۔ اسی زہر سے ان کا کام تمام ہو گیا۔ سبب اس کا یہ ہوا کہ ملک شام میں عبدالرحمٰن بن خالد کی شان و شوکت بہت بڑھ گئی تھی اور یہاں کے لوگ ان کی طرف دل سے مائل تھے، کیونکہ ان کے والد خالد بن ولید کے آثار لوگوں کے دلوں میں موجود تھے۔ دوسرے روم میں بھی مسلمانوں کے درمیان ان کا بڑا رعب و دبدبہ اور بڑی عزت تھی، یہاں

تک کہ معاویہ کو بھی یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ ان کی وجہ سے اسے کسی قسم کا کوئی ضرر نہ پہنچ جائے چنانچہ اس نے انھیں ختم کرنے کا منصوبہ بنایا اور ابن اثال کو حکم دیا کہ انھیں وہ کسی طرح قتل کر دے۔ معاویہ نے ابن اثال سے یہ بھی کہا کہ اگر اس نے اس کام کو انجام دے دیا تو عمر بھر کے لئے اس کا خراج معاف ہو جائے گا۔ نیز حمص کے خراج کی وصولیابی بھی اس کے ذمہ کر دی جائے گی۔ غرض کہ ابن اثال نے زہر کے ذریعہ عبدالرحمٰن کا کام تمام کر دیا اور معاویہ نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس کا خراج معاف ہو گیا اور حمص کی وصولیابی اس کے ذمہ ہو گئی۔[1]

اس واقعہ کی روشنی میں معاویہ کے دوستوں کو درس حاصل کرنا چاہئے اور اس کی ظالمانہ روش کی حمایت میں سخن طرازی سے گریز کرنا چاہئے۔

معاویہ اور عائشہ

معاویہ اور حضرت عائشہ کے کردار و عمل میں حیرت انگیز حد تک مشابہت یکسانیت اور ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ جس طرح معاویہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السّلام کا ازلی و جانی دشمن تھا اسی طرح عائشہ بھی علیؑ کی ازلی مخالف اور جانی دشمن تھیں۔ جس طرح معاویہ حضرت علیؑ سے تمام عمر برسرپیکار رہا اسی طرح عائشہ بھی ہمیشہ علیؑ سے لڑتی رہیں، جس طرح معاویہ کے دل میں علیؑ کے خلاف آتش بغض و عناد بھڑکتی رہی، اسی طرح عائشہ کے دل میں بھی ہمیشہ علیؑ سے عداوت و نفرت کا جوالا مکھی بھڑکتا رہا، جس طرح حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد معاویہ نے ان پر منبروں سے تبرا اور سب و شتم کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اسی طرح

۱؎ تاریخ طبری جلد ۲ واقعات سنہ ۴۶ھ

عائشہ نے علیؑ کی خبر شہادت سن کر شکر کا سجدہ کیا اور طربیہ اشعار پڑھ کر اپنے دل کو ٹھنڈا کیا۔

یہ وہ مشترکہ خصوصیات تھیں جنھوں نے معاویہ اور عائشہ درمیانی قربتوں میں ایسی نزدیکی اور ہم آہنگی پیدا کر دی کہ معاویہ اور اس حکام و عمال کی نظر میں حضرت عائشہ کی قدر و منزلت اپنی معینہ حدوں کو عبور کر گئی۔ چنانچہ اس کے عہد میں جب تک عائشہ کا اقبال و احترام برقرار رہا حکومت کی طرف سے ان پر خصوصی عنایات، نوازشات اور مراعات کی بارش ہوتی رہی۔ چنانچہ عروہ بن زبیر سے مروی ہے کہ معاویہ حضرت عائشہ کا بڑا خیال رکھتے تھے اور انھوں نے ایک موقع پر ام المومنین کو ایک لاکھ درہم دئے تھے۔[1]

ابن کثیر نے عطا سے یہ روایت بھی کی ہے کہ جب عائشہ مکہ میں تھیں تو معاویہ نے ان کے پاس ایک ہنسلی بھیجی تھی جس کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی۔[2] "ابن سعد کا بیان ہے کہ ایک دن حضرت عائشہ نے منذر بن عبداللہ نامی ایک شخص نے فرمایا کہ اگر میرے پاس اس وقت کچھ رقم ہوتی تو میں تمہیں دس ہزار درہم دے دیتی۔ یہ بات معاویہ کو معلوم ہوئی تو انھوں نے اسی دن شام ہونے سے قبل عائشہ کے پاس ایک بڑی رقم بھجوا دی اور انھوں نے منذر کو دس ہزار درہم دے دیئے۔[3]"

ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اٹھارہ ہزار اشرفیوں کا قرض حضرت عائشہ کے سر تھا جسے معاویہ نے ادا کیا۔ اسی طرح بنو امیہ کے تمام دولت مند اور سرمایہ دار حضرت عائشہ کا خاص خیال رکھتے تھے اور درہم و دینار کے ساتھ مختلف قسم

۱؎ ابن کثیر ج ۷ ص ۳۶، متدرک ج ۴ ص ۱۳، حلیۃ الفیم ج ص ۷، ۴۔ ۲؎ ابن کثیر ج ۷، ص ۱۲۷۔ ۳؎ طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۸۔

کے تحائف ان کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔[۱]"

لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ معاویہ اور عائشہ کے درمیان اختلافات نے سر اٹھایا اور عنایات و مراعات کے وہ عارضی بادل جو کریمانہ انداز میں حضرت عائشہ کے سر پر برسا کرتے تھے، مخالفت کی ہوا میں چلتے پھرتے نظر آنے لگے۔

مخالفت کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ معاویہ نے جب خلافت کو خاندانی میراث بنانے کی جدوجہد شروع کی تو انھیں مسلمانوں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ ان کے خصوصی اصحاب اور ہر وقت کے پاس بیٹھنے والے بھی خلاف ہو گئے۔ ادھر عائشہ نے بھی مخالفین کی تائید و ہمنوائی کی جس کے نتیجے میں معاویہ اور عائشہ کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی اور تعلقات خراب ہو گئے۔

مگر طبری کا بیان ہے کہ معاویہ اور عائشہ کے درمیان پہلی تلخی صحابئ رسول حجر ابن عدی کے قتل سے پیدا ہوئی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔ حضرت عائشہ نے حجر اور ان کے اصحاب کی سفارش کے ساتھ عبدالرحمٰن بن حرث بن ہشام کو معاویہ کے پاس بھیجا۔ لیکن عبدالرحمٰن اس وقت پہنچے جب معاویہ، حجر اور ان کے ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ حضرت عائشہ اس حادثہ پر برہم، رنجیدہ اور ملول ہوئیں۔ چنانچہ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ جب ہم کسی چیز کو بدلنا چاہتے ہیں تو پہلے سے زیادہ مشکلوں میں پڑ جاتے ہیں۔ خدا کی قسم ہم حجر کے قتل کو ضرور متغیر کر دیتے جہاں تک میں سمجھتی ہوں حجر ایک پکے مسلمان اور حج و عمرہ بجا لانے والے تھے۔[۲]"

---

[۱]۔ ابن کثیر و مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۷۷، و ۵۹،[۲] طبری ج ۶ ص ۱۵۶۔

حضرت عائشہ کا یہ جملہ "جب ہم کسی چیز کو بدلنا چاہتے ہیں تو پہلے سے زیادہ مشکلوں میں پڑ جاتے ہیں۔" انتہائی معنی خیز اور غور طلب ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے عثمانی حکومت کا تختہ الٹنا چاہا تھا جس کے نتیجے میں عثمان قتل ہو گئے اور ان کے بعد بالاتفاق مسلمانوں نے حضرت علیؑ کو خلیفہ چن لیا جن کی خلافت حضرت عائشہ کے لئے سخت ترین مصیبت تھی۔ پھر آپ نے حضرت علیؑ کی خلافت کو الٹنا چاہا تو جنگ جمل میں طلحہ مارے گئے جنھیں وہ خلیفہ کی شکل میں دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ زبیر قتل ہوئے جو ان کے حقیقی بہنوئی تھے۔ اب دھڑکا اس بات کا تھا کہ معاویہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کروں تو اس کا نتیجہ گزشتہ نتیجوں سے کہیں اور زیادہ بھیانک نہ ہو۔ اسی لئے انھوں نے اپنے غصہ کو ضبط کیا اور خاموش رہیں۔"

جب معاویہ یزید کی بیعت کے سلسلے میں وارد مدینہ ہوا اور ام المومنین عائشہ سے اس نے ملاقات کی تو پہلی گفتگو جو معاویہ اور عائشہ کے درمیان ہوئی وہ حجر کے بارے میں تھی۔ اس گفتگو نے تلخی کے ساتھ یہاں تک طول کھینچا کہ معاویہ کو کہنا پڑا۔ "میرے اور حجر کے معاملے کو چھوڑ دیجئے یہاں تک کہ روز قیامت ہم دونوں اپنے رب سے ملیں۔[۱]"

یہ گفتگو تلخی اور تردد کی فضا میں تمام ہوئی اور یہیں سے اختلافات کی خلیج اور بھی وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ پھر حضرت عائشہ کے حقیقی بھائی عبدالرحمٰن بن ابوبکر کا واقعہ پیش آیا جنھوں نے بیعت یزید کی مخالفت کی اور اس کے فوراً بعد ناگہانی طور پر ختم کر دئے گئے۔ بخاری کا بیان ہے کہ جب عبدالرحمٰن نے یزید کی بیعت کی

---

[۱]۔ استیعاب ج ۱ ص ۱۳۴، اسد الغابہ ج ۱ ص ۳۸۶۔

مخالفت کی اور معاویہ و یزید کو برا بھلا کہا تو مروان نے انھیں گرفتار کرنا چاہا مگر وہ بھاگ کر عائشہ کے گھر میں گھس گئے۔[۱]

کچھ مورخین کا بیان ہے کہ جب لوگوں کو یزید کی بیعت پر آمادہ کرنے کے لئے مروان تقریر کر رہا تھا تو عبدالرحمٰن بن ابوبکر غیظ و غضب کی حالت میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے چیخ کر کہا، تو بھی جھوٹا ہے اور معاویہ بھی جھوٹا ہے، تم لوگ خلافت کو ہرقلی حکومت بنانا چاہتے ہو کہ ایک ہرقل کے مرنے پر دوسرا ہرقل اس کا جانشین ہو جائے۔[۲]"

یہ وہ اختلافی معرکہ تھا کہ جس کے نتیجے میں حضرت عائشہ کو اپنے حقیقی بھائی کی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا اور اختلاف کے شعلے کوہ آتش فشاں بن گئے۔ لیکن چونکہ ام المومنین میں اتنی سکت اور طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ معاویہ سے جنگ کے لئے جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتیں، لہٰذا انھوں نے زبانی جنگ کا سہارا لیا اور بددعاؤں کے راکٹوں سے اس پر حملہ آور ہو گئیں، آخر کار اس کا انجام یہ ہوا کہ معاویہ کی سفاکی نے انھیں موت کے منھ میں جھونک دیا۔

حضرت عائشہ کا عبرتناک انجام

معاویہ کی مخالفت حضرت عائشہ کو راس نہ آئی اور انھیں انتہائی الم ناک و عبرت ناک انجام سے دوچار ہونا پڑا۔ صاحب حبیب السیر، ربیع الابرار، کامل اور دیگر کتابوں کے حوالوں سے رقم طراز ہیں کہ جب معاویہ اپنے فاسق و فاجر

---

[۱] بخاری ج ۳ ص ۱۲۶۔[۲] تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۹۹، تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۲۳۶، ج ۸ ص ۸۹، استیعاب، اور اسد الغابہ حالات مروان بن حکم۔

بیٹے یزید کی بیعت حاصل کرنے کی غرض سے مدینہ میں مقیم ہوا اور اپنے اس قیام کے دوران حضرت عائشہ سے ملا تو انھوں نے اس کے اس اقدام پر لعنت ملامت کی اور خوب کھری کھری سنائی۔ جواب میں معاویہ نے معظمہ کے ادب و احترام کو بالائے طاق رکھ کر ان کی شان کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کیں اور اسی وقت اس نے ام المومنین کا چراغ زندگی گل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ عائشہ کے گھر سے واپس آ کر اس نے ایک پلان تیار کیا اور اس کے تحت اپنی قیام گاہ کے صحن میں ایک گہرا کنواں کھدوایا۔ پھر اس کے دہانے کو خس و خاشاک سے منڈھوا کر اس پر آبنوس کی ایک خوبصورت کرسی رکھوا دی۔ جب یہ سارا انتظام مکمل ہو چکا تو دوسرے دن اس نے ام المومنین کو اپنے یہاں بڑے ادب و احترام سے دعوت میں مدعو کیا۔

جب ام المومنین تشریف لائیں تو معاویہ نے ان سے اسی آبنوس کی کرسی پر بیٹھنے کی درخواست کی جو ان کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ آخر کار معظمہ معاویہ کے چکمے اور بھرے میں آ گئیں اور جیسے ہی انھوں نے کنویں کی طرف قدم بڑھایا ویسے ہی مع کرسی کے اس کے اندر چلی گئیں۔ ام المومنین کے گرتے ہی معاویہ نے اس کنویں میں چونا بھروا کر اوپر سے پانی ڈلوا دیا۔ جب ام المومنین خاک ہو گئیں تو اس نے پھر اس کنویں کو بھروا کر برابر کرا دیا اور مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ واقعہ ۵۶ھ کا ہے۔[۱]"

بعض مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ام المومنین عائشہ کا انتقال علالت کی وجہ سے ہوا اور وہ بقیع میں مدفون ہوئیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ سمجھ میں آتی

---

[۱]۔ حبیب السیر حالات ازواج رسولؐ ج ۱ جز ۳ ص ۱۳۷ مطبوعہ طہران ۱۲۷۱ھ۔

ہے کہ معاویہ کو اس سنگین جرم سے بری کرنے کے لئے یہ روایت بعد میں گڑھی گئی ہے۔

یزید کا مختصر تعارف

"میرے نواسے حسینؑ کا قاتل معاویہ ابن ابوسفیان کے صلب سے ہوگا"[1]

(نبیؐ کریم)

اس مذکورہ حدیث کے ذیل میں بعض مورخین کا بیان ہے کہ اسے سننے کے بعد معاویہ نے ایک مدت تک عورتوں سے ملاقات و مقاربت ترک کر دی تھی۔ قضائے کار کہ ایک سفر کے دوران معاویہ پر ایسا شہوانی بھوت سوار ہوا کہ جس کا دفیعہ حکماء اور اطباء کے نزدیک مقاربت نسوانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اس شیطانی مرض کی شدت سے معاویہ کی حالت جب زیادہ بگڑنے لگی اور دماغ کی رگوں کے پھٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہوا تو اس کے حوارئین نے کافی دوڑ دھوپ، جدوجہد اور تلاش کے بعد ایک صحرائی لڑکی میسون بنت کلبی کا انتخاب کیا اور اس کے باپ کو اس بات پر رضامند کیا کہ وہ اپنی بیٹی کا عقد امیر شام معاویہ سے کر دے[2]۔ چنانچہ فوری طور پر عقد ہوا اور عقد کے بعد افراتفری اور عارضی دھر پکڑ کے نتیجے میں یزید کا نطفہ مستقر ہو گیا۔"

اس کے بعد حافظ جلال الدین سیوطی کے بیان کے مطابق یزید ۲۵ سنہ ھ یا ۲۶ سنہ ھ[3] میں اور طبری کے بیان کے مطابق ۲۲ سنہ ھ[4] میں میسون کے بطن سے پیدا ہوا۔

---

[1] رمز شہادت مولفۂ عظیم الدین خاں بیولوی ص ۷ مطبوعہ نولکشور ۱۳۰۲ سنہ ھ۔
[2] طبری ج ۶ ص ۱۸۳، تاریخ الخلفاء ص ۲۰۶۔ [3] تاریخ الخلفاء ص ۲۰۶۔
[4] طبری ج ۶ ص ۲۵۹۔

یزید کی ماں میسون اپنے حسن و جمال کی وجہ سے معاویہ کے دل کی ملکہ ضرور تھی لیکن ایک صحرائی عورت ہونے کی وجہ سے وہ شہری زندگی اور مہذب سوسائٹی سے نفرت کرتی تھی۔ معاویہ نے اس کے لئے ایک قصر علٰحدہ تعمیر کرا کے اسے بیش قیمت ساز و سامان آرائش سے آراستہ کرا دیا تھا، مگر یہ سب میسون کی نظر میں خاک تھا کیونکہ اسے اپنا قبیلہ، اپنا جنگل اور اس میں چرتی ہوئی بھیڑ بکریاں یاد آتی رہتی تھیں اور وہ ہر وقت اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں کے خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔

معاویہ کو یقین تھا کہ میسون قیصر و کسریٰ کا ٹھاٹ باٹ اور شاہانہ ماحول رنگینیاں دیکھ کر لطف اندوز اور محظوظ ہوگی اور ہر وقت اس کی محبت کا دم بھرے گی مگر اس کا یقین اس وقت مایوسی میں بدل گیا جب میسون نے اس کے لئے بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا اور جس کے نتیجے میں معاویہ کو اس سے ازدواجی رشتہ منقطع کرنا پڑا۔"

علامہ دمیری رقم طراز ہیں:۔

جب میسون بنت کلبی مادر یزید سے معاویہ نے ملاقات کی تو اس کو نجد سے اپنے ہمراہ لایا، میسون بے حد خوبصورت اور صاحب جمال تھی، معاویہ اس پر دل و جان سے فریفتہ تھا مگر وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ اس نے معاویہ کی ہجو میں اشعار کہے، جس میں اس کو علج علوف ناک چھدے ہوئے بچھڑے سے تشبیہہ دی اور برا بھلا کہا۔ معاویہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ ناراض ہوا اور اس نے کہا کہ میں تجھے تین مرتبہ طلاق دیتا ہوں، یہاں سے چلی جا۔ چنانچہ وہ اپنے قبیلے میں واپس چلی گئی اور وہیں یزید پیدا ہوا جسے معاویہ دو سال بعد اپنے ساتھ پھر لے آیا[1]۔"

---

[1] حیواۃ الحیوان ج ۲ ص ۲۰۷۔

مورخ ابوالفدا کا بیان ہے:۔

"یزید کی ماں میسون بنت بحدل کلبیہ تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ جنگل میں رہتا تھا، معاویہ نے میسون کو اس لئے چھوڑا تھا کہ ایک روز وہ کچھ اشعار پڑھ رہی تھی، جس میں ایک شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے یہ تھا کہ "کاش میں اپنے غریب وفادار چچا زاد بھائی کے ساتھ بیاہی جاتی جسے میں اس مسٹنڈے اور بسیار خور کے مقابلے میں بہتر سمجھتی ہوں"۔ معاویہ نے یہ شعر سنا تو برہم ہوا اور اس نے میسون سے کہا اگر تجھے میرے ساتھ رہنا منظور نہیں ہے تو اپنے قبیلے میں واپس چلی جا۔ چنانچہ وہ چلی گئی اور یزید کو بھی اپنے ہمراہ لے گئی[1]۔"

عرب کے مشہور مورخ عبوسی منصوری نے بھی اپنی کتاب "زبدۃ الفکرۃ" میں بالکل یہی واقعہ لکھا ہے اور میسون کے جو اشعار لکھے ہیں اس کا اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے:

"میں اپنی عبا کے موٹے کپڑے کو لباسہائے فاخرہ سے زیادہ پسند کرتی ہوں اور اس کشادہ محل سے مجھے وہ گھر زیادہ عزیز ہے جس میں ہوا مشکل سے آتی ہے۔ مجھے کیڑے مکوڑوں کی آواز اس قصر میں گونجنے والی ساز و نغمہ کی آوازوں سے زیادہ محبوب ہے۔ میں اس کتے کو اس محل کی ہزاروں بلیوں سے بہتر سمجھتی ہوں جو لوگوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان کی پاسبانی کرتا ہے۔ میرے لئے سوسمار (گوہ) کا گوشت اور صحرائی جانوروں کے بھنے ہوئے کان اس محل کی روٹیوں سے زیادہ مرغوب ہیں اور میں اپنے عزیزوں میں ایک دلیر اور شریف نوجوان کو اس بدبودار کافر (معاویہ) کے مقابلے میں زیادہ محبوب رکھتی ہوں۔ میسون

---

[1] ترجمہ تاریخ ابوالفداء ص ۲۶۷۔

کے منہ سے یہ ہجو سن کر معاویہ نے اسے طلاق دے دی اور اسے اس کے گھر بھجوا دیا۔

مگر صاحب ناسخ التواریخ اس طلاق کا سبب کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

(فارسی عبارت کا اردو ترجمہ) "میسون کا باپ بحدل کا ایک غلام تھا جس کا نام سفاح تھا۔ میسون نے اپنا ہر راز اس پر ظاہر کر رکھا تھا۔ اسی غلام سے وہ حاملہ ہو کر معاویہ کے گھر میں آئی۔ چونکہ وہ ابھی بھرپور جوان نہ تھی اس لئے اس کا حمل بھی ظاہر نہ ہوا تھا۔ چنانچہ یہ راز پوشیدہ رہا اور جب اس نے ایک لڑکے کو جنم دیا تو معاویہ نے اس کو اپنا بیٹا سمجھ کر اس کا نام یزید رکھا۔ یہ سلسلہ کچھ دن تک چلتا رہا۔ جب معاویہ اور میسون میں کشیدگی پیدا ہوئی تو معاویہ نے اس کو طلاق دے دی اور پھر وہ اپنے قبیلے میں واپس چلی گئی اور اپنے عزیزوں کے درمیان زندگی بسر کرنے لگی[1]۔"

معاویہ اور میسون کے درمیان نفرت، کشیدگی، طلاق اور علٰحدگی کی اصل وجہ یہی معلوم ہوتی ہے۔ ورنہ زبانی مطاعن یا ہجویہ اشعار زن و شوہر کے درمیان مفارقت، طلاق اور علٰحدگی کا ذریعہ نہیں بن سکتے اور نہ ہی خانگی امور میں کوئی مرد اپنی بیوی کے بارے میں ناجائز تعلقات کا حتمی ثبوت فراہم کئے بغیر اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے۔

ہماری نظر میں علامہ دمیری کی وہ روایت بھی ہے کہ طلاق کے دو سال بعد معاویہ صاحب میسون پر ناجائز طریقے سے پھر متصرف ہو گئے تھے۔ نہ حلالہ ہوا اور نہ دوبارہ نکاح۔ چنانچہ ممکن ہے کہ اس شرعی خلاف ورزی اور دوبارہ تصرف

---

[1] ناسخ التواریخ ج ۶ ص ۱۵۵۔

کے نتیجے میں یزید کا حمل قرار پایا ہو۔ بہر حال جس اعتبار سے دیکھا جائے، یزید کی ولادت جائز طریقے سے ثابت نہیں ہوتی۔ اگر طلاق کے بعد یزید کا نطفہ قرار پایا ہے تو بھی حرام اور بحدل کے غلام سفاح کی شرکت پر یقین کر لیا جائے تو حرام در حرام۔"

تربیت :۔ یزید کے ننہالی لوگوں کی بود و باش چونکہ نجد کے جنگلوں میں تھی اور یزید بھی وہیں پیدا ہوا اس لئے اس کا اخلاقی اور تہذیبی رشتہ زیادہ تر عرب کی مہذب سوسائٹی سے منقطع رہا۔ اس کے ننہال میں نہ تو پڑھا لکھا تھا اور نہ شائستگی اور تہذیب سے بہرہ مند۔ نہ ہی ان کا ایسے لوگوں کے ساتھ اتحاد و ارتباط تھا جس کی وجہ سے یزید کے لئے تعلیم و تربیت کا راستہ ہموار ہوتا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ شفقت پدری کے تحت معاویہ کبھی کبھی یزید کو اپنے پاس بلا لیتا تھا مگر یہ عارضی صحبت اس کے صحرائی اخلاق و کردار کو کہاں تک درست کرتی۔ چنانچہ یزید کے ظالم اور خونخوار ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایک عرصہ تک اس کی پرورش صحرائی ماحول میں ہوئی تھی اور جنگل کی آب و ہوا نے اس کی طبیعت سے انسانی جوہر نکال کر حیوانیت کے تمام اجزاء کوٹ کوٹ کر بھر دئے تھے۔"

شاعری :۔ یزید کو شاعرانہ ذوق وراثتاً ملا تھا۔ معاویہ کے حق میں یزید کی ماں میسون کی ہجویہ شاعری اس حقیقت کی غماز ہے کہ وہ ایک صاحب طرز شاعرہ تھی اور ادھر معاویہ بھی شاعری میں ماہرانہ دسترس رکھتا تھا اس لئے اس کے جوہر کا یزید کی طرف منتقل ہونا تعجب خیز ہرگز نہیں ہے۔ مستزاد یہ کہ شراب و کباب اور عشق و محبت کی حسین و رنگین محفلوں نے اس کے مذاق کو دو آتشہ بنا کے اس کی فکر میں ایک خاص تنوع اور عاشقانہ رنگ بھر دیا تھا۔ یزید کے بیشتر اشعار کفر و الحاد کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) اگر دین محمدی میں شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے تو مسیحی دین میں داخل

ہو کر پیا کرو۔[1]"

(۲) خدا نے یہ نہیں کہا کہ جہنم ان کے لئے ہے جو شراب پیتے ہیں بلکہ خدا نے یہ کہا ہے کہ جہنم ان کے لئے ہے جو نمازیں پڑھتے ہیں۔[2]

(۳) شراب کے حریفوں سے کہو کہ وہ گانوں کی صدائیں سنیں شراب پیئیں، دوسری باتوں کا ذکر چھوڑ دیں۔ مجھے اذانوں کی آوازوں سے زیادہ ستاروں اور سارنگیوں کی آوازیں پسند ہیں اور حوروں کے عوض میں شیشے کی پری کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔[3]

(۴) میں ایسی شراب میں مست ہو کر محمدؐ کا سامنا کروں کا جس کا نشہ میری ہڈیوں تک پہنچ گیا ہو۔[4]

یزید کے دیوان میں نہ جانے کتنے ایسے اشعار موجود ہیں جن سے اس کی شراب خواری، کفر و الحاد اور اسلام و ایمان کا پتہ چلتا ہے۔"

بدفعلیاں :۔ عبداللہ بن حنظلہ سے مروی ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کے دور میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں تک کو نہیں چھوڑتا تھا۔ وہ نمازوں کو ترک کرتا تھا اور شراب آزادی سے پیتا تھا۔[5]

یزید نے اپنی ولی عہدی سے قبل حضرت عائشہ کے پاس بھی عقد کا پیغام بھجوایا تھا جبکہ اس وقت معظمہ کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی اس جسارت پر اُم المومنین سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور مسلمانوں کے درمیان عام شورش پیدا ہو گئی۔ لیکن کچھ بااثر لوگوں نے یزید پر لعنت ملامت کر کے اس فتنے کو بڑھنے اور پھیلنے سے روک

[1] تا [4]۔ صواعق محرقہ ص ۱۳۲۔ [5] صواعق محرقہ ص ۱۳۵۔

دیا۔ اس واقعہ کا ذکر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی کتاب مدارج النبوۃ میں اس مقام پر کیا ہے جہاں یزید کے جواں مرگ ہونے کی وجہیں لکھی ہیں اور اس کی موت کو عذاب الٰہی کا باعث بتایا ہے۔ ان وجوہات میں دو خاص باتیں محدث موصوف نے تحریر فرمائی ہیں۔ ایک ام المومنین حضرت عائشہ سے عقد کی خواستگاری اور دوسرے حضرت امام حسین علیہ السّلام کا خون ناحق۔"

یزید کے تین کام :۔ علامہ جلال الدین سیوطی کا بیان ہے کہ یزید نے تین کام ایسے انجام دیئے کہ اگر ان میں سے وہ صرف ایک ہی کام کرتا تو وہ اس کے دین و ایمان اور دنیا و آخرت کی بربادی و تباہی اور دوزخ کی آگ میں اسے جلانے کے لئے کافی ہوتا۔

(۱) ۱۰ محرم سنہ ۶۱ھ کو کربلا میں حضرت امام حسینؑ اور ان کے اصحاب و انصار کو بھوکا پیاسا شہید کرنا۔

(۲) سنہ ۶۳ھ میں اس نے مدینہ پر چڑھائی کا حکم دیا، جس کے نتیجے میں تین دن تک لوٹ مار اور قتل و غارتگری کا بازار گرم رہا۔ خون کی ندیاں بہتی رہیں، عام مسلمانوں کے علاوہ بہت سے اصحاب رسول قتل کر دیئے گئے، مسجد نبوی کو گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا، بے شمار عورتوں کی آبروریزی کی گئی جن میں ایک ہزار کے قریب کنواری لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

(۳) سنہ ۶۴ھ میں یزید نے عبداللہ بن زبیر کی گرفتاری کے لئے مکۂ معظمہ پر چڑھائی کا حکم دیا۔ اس حملے کے دوران یزید کی بدمست فوجوں نے منجنیق کے ذریعہ خانہ کعبہ پر آگ برسائی جس کے شعلوں سے غلاف کعبہ، بیت اللہ کی چھت اور فدیۂ اسماعیل کے دنبے کی دونوں سینگوں کو زبردست نقصان پہنچا۔[1]"

[1]۔ تاریخ الخلفاء ص ۴۶۔

یزید اور علمائے اہل سُنّت :۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ:۔

یزید دشمن خدا، شرابی، تارک الصلواۃ، زانی، فاسق، محرمات الٰہی کا حلال کرنے والا اور نواسۂ رسولؐ کا قاتل تھا، اس لئے قابل لعنت ہے۔[1]"

علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ حسینؑ کے قاتلوں پر لعنت کرے اور اسی کے ساتھ یزید اور ابن زیاد پر بھی۔[2] حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ چھ اشخاص ایسے ہیں جن پر میں نے بھی لعنت کی ہے اور اللہ نے بھی (۱) جو اللہ کی کتاب میں تحریف یا اضافہ کرے (۲) جو مرضیٔ الٰہی کا منکر ہو (۳) جو ظلم و جبر سے مخلوق خدا پر مسلط ہو جائے (۴) جو اللہ کے حرم پاک کو بے حرمت کرے (۵) جو میری عترت سے دشمنی رکھے اور اس کی حرمت کو پامال کرے (۶) جو میری سُنت اور صلواۃ کا تارک ہو۔[3]

مذکورہ حدیث کی روشنی میں اگر معاویہ اور یزید کی زندگی کو دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے اندر بہت سی لعنتی باتیں جمع ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ محمود بن سلیمان کفوی نے بھی اپنی کتاب اعلام الاخبار میں تحریر فرمایا ہے کہ یزید اور معاویہ پر لعنت اس لئے جائز ہے کہ ان کا کفر تواتر سے ثابت ہے۔ نیز دیگر علماء کی بھی ایک بہت بڑی تعداد انھیں کافر سمجھتی ہے اور قابل لعنت گردانتی ہے۔[4]

اب اگر کوئی معاویہ و یزید پرست شخص انھیں پاک و صاف اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لئے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔

[1]۔ تحریر الشہادتین ص ۹۶ مطبوعہ سنہ ۱۲۵۶ھ۔ [2] تاریخ الخلفاء ص ۸۰ مطبوعہ سنہ ۱۳۰۰ھ۔ [3] مشکوٰۃ شریف باب الایمان ص ۲۲۔ [4] اعلام الاخبار ص ۲۵۶۔

یزید کی ولیعہدی

حضرت امام حسنؑ علیہ السّلام کے حالات میں ہم تحریر کر چکے ہیں کہ معاویہ اور امام کے درمیان ہونے والی صلح کے ذیل میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ معاویہ اپنے بعد حکومت کے لئے کسی کو اپنا جانشین یا ولیعہد نامزد نہیں کرے گا۔ لیکن اس نے معاہدہ کی کسی بھی شرط کی پابندی نہیں کی اور خلافت سے امام علیہ السّلام کی دستبرداری کے بعد ہی سے وہ اپنے فاسق و فاجر اور بدکردار بیٹے یزید کی ولیعہدی کا خواب دیکھنے لگا تھا۔

لیکن یزید کی کمینگی اور ضلالت کی وجہ سے اسے یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ مسلمان اس کی ولیعہدی کو قبول کرنے کے لئے آسانی سے تیار نہ ہوں گے، اور انھیں اس کے لئے ہموار کرنا ایک مشکل ترین مرحلہ ہوگا۔

اس کے علاوہ معاویہ کو یہ دھڑکا بھی تھا کہ اس کے مرنے کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل شام عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کو اپنا خلیفہ تسلیم کرلیں، کیوں کہ ان کے والد کے جنگی کارنامے شام والوں کی زبانوں پر تھے اور وہ انھیں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا معاویہ نے اپنی زندگی ہی میں عبدالرحمٰن بن خالد کو یزید کے راستے سے ہٹا دیا اور ابن اثال کے ہاتھوں زہر دلوا کر ان کا کام تمام کر دیا۔

معاویہ کے حوارئین و مقربین کو بھی شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ یزید کی فرمانروائی کو اپنی زندگی میں مستحکم کر دینا چاہتا ہے فی الحال اس کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

سب سے پہلے جس شخص نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اس جمود کو توڑا اور یزید کی ولیعہدی کے معاملے میں معاویہ کو متحرک کیا اس کا نام مغیرہ بن شعبہ تھا جو

اس وقت کوفہ کا گورنر تھا۔

مغیرہ کا ذاتی مفاد اپنی جاتی ہوئی گورنری کو بچانا تھا، جس کے ذیل میں یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ جب بصرہ کی طرح کوفے میں بھی مغیرہ کی عیاشیاں اور زنا کاریاں اپنے حدود سے تجاوز کر گئیں تو وہاں کے کچھ معزز شہریوں نے اس کے خلاف معاویہ کو شکائتی خطوط لکھے اور اس کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ انھیں خطوط کی بنا پر معاویہ نے مغیرہ بن شعبہ کو فوری طور پر اپنے دربار میں طلب کیا تاکہ اس سے پوچھ تاچھ کے بعد وہ اس کی جگہ سعید بن عاص کو کوفے کی گورنری پر مامور کر سکے۔ لیکن جب مغیرہ کو خفیہ طور پر معاویہ کے اس ارادے کا علم ہوا تو اس نے قصداً ایک ماہ تک اس کی طلبی کو نظرانداز کیا، اس کے بعد اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور جب معاویہ نے اس کی حاضری میں تاخیر کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ حضور آپ ہی کے کام میں مصروف تھا، معاویہ نے کہا، وہ کیا کام تھا؟ مغیرہ نے کہا آپ کے فرزند یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں لوگوں کو ہموار کر رہا تھا۔ معاویہ کے دل کی کلی کھل گئی، اس نے خوش ہو کر پوچھا، اس کام میں تمھیں کہاں تک کامیابی ملی؟ مغیرہ نے کہا کوفہ کے زیادہ تر لوگ یزید کی ولی عہدی کے حامی ہیں اور جو مخالف ہیں ان سے گفتگو کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ معاویہ نے کہا، تو پھر جاؤ اور اپنا کام پورا کرو۔

---

[1] مغیرہ بن شعبہ حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں بصرہ کا گورنر تھا، اس نے وہاں بھی ام جمیل نامی ایک فاحشہ عورت کے ساتھ زنا کی تھی اور رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ دلچسپ واقعہ کی مکمل تفصیل سے آگاہی کے لئے مولف کی کتاب "تفسیر کربلا" کا مطالعہ فرمائیں۔

اس طرح ایک زانی کی جانشینی نے دوسرے زانی کے مجرمانہ افعال کو اپنے دامن میں چھپا لیا اور معززین کوفہ کے شکائتی خطوط یزیدیت کی آندھی میں اڑ گئے۔ اس کے بعد معاویہ کے دربار سے مغیرہ جب مسکراتا ہوا باہر آیا اور اس کے کچھ ساتھیوں نے پوچھا کہ کہو کیا طے پایا، تو اس نے جواب دیا کہ معاویہ کا پاؤں ایسی دلدل میں پھنسا کر آیا ہوں کہ قیامت تک اس سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔

معاویہ سے گفتگو کے بعد مغیرہ کوفہ واپس آ گیا۔ اور وہاں اس نے اپنا کام شروع کر دیا کیونکہ اب اسے اپنی کارگزاری کی رپورٹ معاویہ کی خدمت میں پیش کرنا تھی۔ چنانچہ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بنی امیہ کے مخصوص ہوا خواہوں کو اس نے بلا کر اپنا مقصد ان پر واضح کیا اور انھیں یہ بھی بتایا کہ امیر شام کو یقین نہیں ہے کہ اہل کوفہ یزید کی ولی عہدی کو آسانی سے قبول کرلیں گے۔ اس لئے ایک وفد یہاں سے بھیجا جائے جو معاویہ کو اپنی حمایت کا یقین دلائے اور یہ درخواست کرے کہ وہ یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیں۔ چنانچہ اس وفد کی تیاری میں تیس ۳۰ ہزار درہم سرکاری خزانے سے خرچ کئے گئے اور موسیٰ بن مغیرہ کی قیادت میں یہ جماعت دمشق کے لئے روانہ ہو گئی۔ وہاں پہنچ کر وفد کے لوگوں نے معاویہ سے ملاقات کے دوران وہی کہا جو انھیں پڑھایا گیا تھا۔ زمانہ شناس معاویہ حقیقت کو خوب سمجھتا تھا، چنانچہ گفتگو کے بعد اس نے موسیٰ بن مغیرہ سے تنہائی میں پوچھا کہ تمہارے باپ نے ان لوگوں کے دین و ایمان کا سودا کتنے میں کیا ہے؟ موسیٰ نے کہا، تیس ۳۰ ہزار درہم میں۔[1]

معاویہ، وفد کی درخواست سے کہ یزید کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا جائے،

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۵۔

مطمئن نہیں تھا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یہ زرخرید بندے مسلمانوں کی رائے عامہ کے ترجمان نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اس نے اس اہم معاملہ میں مشورہ کی غرض سے زیاد بن ابیہ کو (جسے وہ سیاسی طور پر اپنا بھائی بنا چکا تھا) ایک خط تحریر کیا اور اس میں اپنا دلی مدعا بیان کیا۔ زیاد کو معاویہ کی اس خواہش کا اندازہ پہلے ہی سے تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے خاص محرم راز عبید بن کعب کو فوری طور پر طلب کیا اور اس سے کہا کہ خلیفۃ المسلمین کا خیال یزید کو اپنا ولی عہد بنانے اور اس کے لئے مسلمانوں سے بیعت حاصل کرنے کا ہے۔ مگر چونکہ یزید ایک آوارہ مزاج، بدکردار خودسر اور مطلق العنان انسان ہے، اس لئے انھیں اس کے لئے عام مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور بیزاری کا خدشہ بھی ہے، اور یہ خدشہ میرے خیال میں درست ہے لہٰذا تم میرا خط لے کر خلیفۃ المسلمین کے پاس جاؤ اور انھیں زبانی بھی میرا یہ پیغام دو کہ اس کام میں عجلت نہ کریں اور بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں۔ تاخیر اس سے بہتر ہے کہ جلد بازی کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں ظاہر ہو۔[1]

زیاد اور عبید کے درمیان یہ بات بھی ٹھہری کہ یزید سے مل کر وہ یہ کہے کہ اگر رائے عامہ کو آپ اپنے حق میں ہموار کرنا چاہتے ہیں تو ان باتوں کو ترک کر دیجئے جنھیں مسلمان عام طور پر ناپسند کرتے ہیں۔

غرض کہ عبید، زیاد کا خط اور پیغام لے کر روانہ ہوا اور معاویہ یزید سے مل کر اس نے انھیں زیاد کے مشورے سے آگاہ کیا اور ان سے ولی عہدی کے معاملہ میں تعجیل نہ کرنے کی درخواست کی۔

سنہ ۵۰ھ میں مغیرہ کا انتقال ہوا اور اس کے بعد سنہ ۵۳ھ میں زیاد بھی دنیا سے

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۶۹۔

رحلت کر گیا۔ زیاد کے انتقال کے بعد معاویہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو خاص خاص خیر خواہ ایک ایک کر کے راہی ملک عدم ہو جائیں اور بعد میں میری آواز محض صدا بہ صحرا ثابت ہو۔ اس لئے اس نے یزید کی ولی عہدی کا ایک تحریری فرمان لکھ کر مجمعٔ عام میں اس کا اعلان کر دیا اور بزورِ شمشیر مسلمانوں سے اس کا اقرار لیا جانے لگا۔[1]

واقعات بتاتے ہیں کہ مغیرہ بن شعبہ نے بڑی حد تک یزید کی ولی عہدی پر رائے عامہ کو ہموار کر لیا تھا۔ اور زیاد نے بھی اپنی ذاتی رائے کے باوجود بصرہ کے عوام کو کافی حد تک تیار کر لیا تھا اور وہاں مخالفت کا امکان نہ تھا۔ شام معاویہ کا اپنا ملک تھا۔ وہاں ایک عبدالرحمٰن بن خالد کی طرف سے مخالفت کی لہر اُٹھ سکتی تھی لیکن معاویہ نے انھیں پہلے ختم کر دیا تھا، دوسرے سعید بن عاص تھے، انھوں نے یزید کی ولی عہدی پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی مگر معاویہ نے ان کی منھ بھرائی کر کے انھیں خراسان کا حاکم بنا دیا، لہٰذا وہ بھی خاموش ہو گئے۔ شام اور عراق سے فراغت کے بعد معاویہ نے مکہ اور مدینہ کی طرف توجہ کی۔ اس وقت مروان بن حکم مدینہ کا حاکم تھا۔ معاویہ نے اسے لکھا کہ ہم نے یزید کو اپنا ولی عہد قرار دے دیا ہے اور یہاں اس کی بیعت ہو چکی ہے لہٰذا تم بھی بیعت کرو اور مدینہ کے لوگوں سے بھی بیعت لو۔

مروان نے جب معاویہ کا یہ خط پڑھا تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور اسی وقت گفتگو کے لئے دمشق روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے معاویہ سے تیز و تند لہجے میں گفتگو کی اور کہا کہ حسنؑ ابن علیؑ سے صلح کا جو معاہدہ ہوا ہے اس کے مطابق تجھے کیا حق

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۷۰۔

ہے کہ تو یزید کو اپنا ولی عہد مقرر کرے۔ معاویہ مروان کے اس تیکھے انداز اور سیاسی حربے کا مطلب سمجھ گیا۔ چنانچہ وہ نرمی اختیار کرتے ہوئے بولا کہ بے شک تم ہمارے پشت پناہ، مددگار اور ہمدرد ہو اس لئے میں یزید کے بعد تمہیں اس کا ولی عہد قرار دیتا ہوں"۔

یہ ایک ایسا پرفریب جادو تھا کہ جس نے مروان کے سارے غصّے کو چشم زدن میں کافور کر دیا۔ اور ایک مکار دوسرے مکار کی باتوں سے ہمیشہ کے لئے مطمئن ہو کر مدینہ واپس آ گیا۔

مدینہ پہنچ کر مروان نے ایک جلسہ طلب کیا اور اس میں اس نے یزید کی ولی عہدی کا اعلان کرتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو اسی طرح حکومت کا وارث قرار دیا ہے جس طرح حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو اپنا جانشین بنایا تھا۔ یہ سُننا تھا کہ عبدالرحمٰن بن ابوبکر بپھر گئے اور کہا کہ تو جھوٹ بولتا ہے۔ ابوبکر نے اپنے بیٹے کے لئے بیعت نہیں لی تھی۔ یہ تو قیصر و کسریٰ کا طور طریقہ ہے۔ ہم لوگ ہرگز یزید ایسے زانی، شرابی اور بدکردار کی بیعت نہیں کریں گے۔

عبدالرحمٰن ابن ابوبکر کے اس خیال کی تائید حضرت امام حسینؑ، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر وغیرہ نے بھی کی۔ جس کی اطلاع مروان نے معاویہ کے پاس بھیج دی اور اپنے مکتوب میں لکھا کہ فلاں فلاں حضرات نہ یزید کی بیعت پر تیار ہیں اور نہ ہی اس کی ولی عہدی کو تسلیم کرنے پر راضی ہیں۔

معاویہ کو جب مروان کا یہ خط ملا تو اس نے کچھ دنوں تک خاموشی اختیار کی۔ پھر یزید کو ساتھ لے کر حج کے بہانے سے نکل پڑا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جن لوگوں نے یزید کو ولی عہد تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے ان کی اسلام میں کیا اہمیت ہے؟ یہ بات قابل غور ہے کہ مسلمانوں کے ہر فرقے کے نقطہ نظر سے جن افراد کو اسلامی

معاملات سے دلچسپیوں کا ورثہ دار کہا جا سکتا تھا وہ سب کے سب یزید کی ولی عہدی سے اختلاف پر متفق و متحد تھے۔ چنانچہ ایک طرف حسینؑ ابن علیؑ تھے تو دوسری طرف عبدالرحمٰن بن ابوبکر، عبداللہ بن عمر، عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن زبیر تھے۔ معاویہ ان لوگوں کو اپنی طاقت و سطوت سے بھی مرعوب کرنا چاہتا تھا اور دولت و ثروت سے بھی، جس کا ثبوت تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

مورخین کا بیان ہے کہ معاویہ اور یزید ایک ہزار سپاہیوں کے ہمراہ دمشق سے روانہ ہو کر جب مدینہ کے نزدیک پہنچا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات امام حسینؑ علیہ السّلام سے ہوئی۔ اس نے آپ کو دیکھتے ہی کہا کہ اے حسینؑ! تم قربانی کا وہ دنبہ ہو جس کا خون جوش کھا رہا ہے۔ قسم خدا کی یہ خون ایک دن ضرور بہایا جائے گا۔ اس پر امام نے فرمایا اے ملعون اپنی زبان کو قابو میں رکھ، ہم آل رسُولؐ ایسے کلمات کے سزاوار نہیں ہیں۔

پھر ابن زبیر سے ملاقات ہوئی تو معاویہ نے کہا، تم اس مکار سوسمار (گوہ) کے مانند ہو جو سوراخ میں اپنا سر ڈال کر دم ہلاتا رہتا ہے۔ خدا کی قسم عنقریب یہ دم پکڑی جائے گی۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابوبکر سے ملاقات کے دوران اس نے کہا، تو سٹھیا گیا ہے اور تیری عقل جاتی رہی ہے۔ دور ہو جا میرے سامنے سے۔ اس کے بعد عبداللہ بن عمر سے بھی اس نے ایسا ہی ناشائستہ و ناروا سلوک کیا۔[1]

اس کے بعد مدینہ کے لوگوں کو بھی معاویہ نے ڈرایا، دھمکایا اور قتل کی دھمکیاں دیں۔ حضرت عائشہ نے جب یہ سُنا تو وہ بپھرتی ہوئی معاویہ کے پاس گئیں اور فرمایا کہ اے معاویہ! تو نے پہلے میرے ایک بھائی محمد بن ابوبکر کو قتل کرا کے ان کی

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۴۵۴۔

لاش کو آگ میں جلوا دیا اور اب میرے دوسرے بھائی عبدالرحمٰن کی بھی جان کا دشمن ہوا ہے اور ان کے بارے میں سخت و سست الفاظ استعمال کرتا ہے۔ خدا کی قسم تو ان لوگوں میں سے ہے جنھیں رسُول اللہؐ نے فتح مکہ کے موقع پر قتل سے آزاد کر دیا تھا۔

غرض کہ معاویہ جب حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہ ابن عمر، عبدالرحمٰن بن ابوبکر، ابن عباس اور ابن زبیر کو ڈرانے، دھمکانے اور خوف زدہ کرنے میں ناکام رہا تو ان لوگوں کو ہموار کرنے کے لئے اس نے دولت کا حربہ استعمال کیا۔ چنانچہ اس نے ایک لاکھ درہم سب سے پہلے عبدالرحمٰن بن ابوبکر کے پاس بھیجے مگر انھوں نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم دنیا کے لئے اپنا دین فروخت نہیں کرتے۔ اس کے بعد وہ مکہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

پھر معاویہ نے وہی ایک لاکھ درہم عبداللہ ابن عمر کے پاس روانہ کئے، انھوں نے بھی یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میرا دین دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ پھر اس نے وہی رقم امام حسینؑ علیہ السّلام کی خدمت میں ارسال کی لیکن حسینؑ نے معاویہ کی اس احمقانہ پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے اس کی زرداری کو اس کے منھ پر مار دیا۔

ان تمام حضرات کے علاوہ ام المومنین حضرت عائشہ نے بھی یزید کی ولی عہدی کی مخالفت میں نمایاں حصّہ لیا۔ جیسا کہ جلال الدین سیوطی کا بیان ہے کہ معاویہ مدینہ میں منبرِ رسُول پر بیٹھا ہوا لوگوں سے یزید کی بیعت لے رہا تھا کہ ام المومنین حضرت عائشہ اپنے حجرے سے چیخ پڑیں اور انھوں نے فرمایا کہ اے معاویہ، بس خاموش ہو جا۔ یہ کیا کر رہا ہے؟ کیا تجھ سے پہلے شیخین نے بھی اپنے بیٹوں کے لئے بیعت کا مطالبہ کیا تھا؟[1]

---

[1] دیکھئے تاریخ الخلفاء اور طبری ج ۶ ص ۱۷۷۔

ام المومنین حضرت عائشہ کے اس طرز عمل سے ظاہر ہے کہ یزید کی ولی عہدی کا اکابرین اسلام کی نظر میں اصول، شریعت اور آئین اسلامی کے خلاف تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر وحید الزماں لکھتے ہیں کہ :-

اسلام کے شروع سے ہی اسلام کا حاکم، دین اور دنیا دونوں کا مقتدا سمجھا جاتا تھا۔ مذہب اور سیاست کا یہ اجتماع عقلمندانہ اصول پر مبنی تھا یا نہیں، یہ ایک مختلف فیہ بات ہے جس کے متعلق میں اپنی رائے کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا۔ لیکن یہ اصول عام طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور اس لئے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ خلیفۂ اسلام میں علاوہ سیاسی قابلیت کے مذہبی اور دینی صفات بھی بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ اور یہ سب کو معلوم تھا کہ یزید اس لحاظ سے کسی طرح بھی مستحق خلافت نہیں تھا۔

مختصر یہ کہ مدینہ میں اپنی ناکامی کے بعد معاویہ غم و غصّہ اور شرمساری کا طوفان دل میں چھپائے مکہ کی طرف روانہ ہوا اور مناسک حج سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس نے حضرت امام حسینؑ، عبدالرحمٰن بن ابوبکر، عبداللہ بن عمر اور ابن زبیر سے (جو حج کے موقع پر وہاں موجود تھے) یزید کی بیعت حاصل کرنے کی ایک آخری کوشش اور کی۔

چنانچہ معاویہ کا قافلہ جب شام کی طرف واپس جانے کے لئے تیار ہوا اور تمام سامان سفر اکٹھا کر لیا گیا تو اس نے کعبہ سے ملحق ایک منبر رکھوایا اور منادی کرادی کہ سب مسلمان اس کی تقریر سننے کے لئے جمع ہو جائیں۔ اور اس موقع پر خصوصی طور سے امام حسینؑ، عبدالرحمٰن بن ابوبکر، عبداللہ ابن عمر اور ابن زبیر کو بھی مدعو کیا گیا۔ چنانچہ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو معاویہ منبر پر گیا اور مجمعٔ عام میں ان لوگوں کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔ یزید آپ حضرات کا بھائی ہے، میری خواہش ہے کہ اسے اپنے بعد خلافت کے لئے پیش کر دوں، اس طرح کہ خلیفہ تو وہی رہے لیکن تمام امور

سلطنت کی انجام دہی آپ حضرات کے ہاتھ میں رہے۔

یہ سُن کر عبداللہ ابن زبیر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے کہا، اے معاویہ! ہم تجھے تین باتوں میں سے ایک بات کا حق دیتے ہیں۔ اول یہ کہ تو وہ صورت اختیار کر جو وفات رسُول کے بعد رونما ہوئی، یعنی خلافت کو لوگوں کے انتخاب پر چھوڑ دے۔ دوسرے یا پھر وہ طریقہ اختیار کر جو ابوبکر نے اختیار کیا تھا کہ خلافت کو اپنے خاندان اور اپنی اولادوں سے دور رکھا تھا۔ اور تیسرا وہ طریقہ ہے جو حضرت عمر نے اختیار کیا تھا کہ خلیفہ کا انتخاب شوریٰ کے سپرد کر دیا تھا۔

عبداللہ ابن عمر کی یہ باتیں سن کر معاویہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے کہا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کی مخالفت اگر تم میں سے کسی نے کی تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے فوجیوں کو حکم دیا کہ ابن عمر اور اس کے دو سپاہی برہنہ شمشیر لے کر مسلط ہو جائیں اور اختلاف کا ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نکلے تو انھیں فوراً قتل کر دیں۔ لیکن بزور شمشیر بیعت حاصل کرنے کا یہ طریقہ بھی معاویہ کے لئے کارآمد ثابت نہ ہوا، اس لئے کہ عام مسلمانوں میں انتشار پیدا ہونے لگا اور معاملے کی نزاکت کو دیکھ کر معاویہ اپنا سا منھ لے کر شام کی طرف روانہ ہو گیا۔

ان تمام امور پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت امام حسین اور ان کے وفادار جاں نثار کچھ ساتھی اپنے موقف میں ایک مستحکم استقلال کے ساتھ بہر منزل ثابت قدم رہے۔ آپ نے نہ یزید کی ولی عہدی قبول کی اور نہ اس کی بیعت کی۔ نیز واقعات کا تسلسل یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ حسینؑ کی رگ گردن کو قطع کرنے کے لئے جو تلوار سقیفہ میں تیار کی گئی تھی وہ رفتہ رفتہ منافقانہ منزلیں طے کرتی ہوئی معاویہ کے ہاتھ میں آئی اور معاویہ نے اعلان ولی عہدی کے ساتھ وہ تلوار یزید کی طرف

منتقل کر دی اور ۶۰ھ میں اپنے سیاہ اعمال کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

معاویہ اور حدیث سازی

اسلام کے ابتدائی دور میں حدیثوں کے بیان کرنے کا جو طریقہ رائج تھا، وہ زبانی تھا۔ باقاعدہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ معاویہ کے دور میں شروع ہوا جب اس نے عبید بن شریہ کو (جو زبانی حدیثوں کا راوی تھا) صنعاء سے بلا کر کاتبوں اور محرروں کے ذریعہ اس کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو قلم بند کرایا، اور جس کے نتیجے میں کئی کتابیں عالم وجود میں آئیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام "کتاب الملوک واخبار الماضیین" ہے۔ جو معاویہ کے حکم سے لکھی گئی کتابوں میں غالباً سب سے پہلی کتاب ہے۔

عبید کے بعد "عوانہ بن حکم" (المتوفی ۱۴۷ھ) کا نام قابل ذکر ہے جو اخبار و انساب کا ماہر تھا۔ اس نے عام کتابوں کے علاوہ خاص بنی امیہ اور معاویہ کے حالات پر ایک کتاب لکھی جو پہلوی زبان میں تھی اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں ہشام بن ملک کے دور میں ہوا۔

۱۴۳ھ میں جب تفسیر، فقہ اور حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو دیگر علوم کے ساتھ تاریخ و رجال میں بھی مستقل کتابیں لکھی گئیں اور محمد بن اسحاق (المتوفی ۱۵۱ھ) سیرت نبوی پر ایک کتاب منصور عباسی کی تحریک پر لکھی جو غالباً فن تاریخ کی پہلی کتاب ہے۔

اس کے بعد تاریخ بتدریج ترقی کرتی رہی اور بڑے بڑے نامور مورخ پیدا ہوتے رہے۔ ان مورخین میں جن لوگوں نے خاص طور پر صحابہ کے حالات قلم بند کئے ان میں نصر بن مزاحم کوفی، مصنف کتاب الجمل، سیف بن عمر الاسدی،

مصنف کتاب فتوح الکبیر، معمر بن راشد کوفی مصنف کتاب المغازی، عبداللہ بن سعد زہری مصنف کتاب فتوحات خالد بن ولید، ابوالبختری وہب بن وہب مصنف کتاب صفت النبی و فضائل انصار۔ ابوالحسن علی بن محمد عبداللہ مدائنی، احمد بن حارث خزار (مدائنی کا شاگرد) عبدالرحمٰن بن عبیدہ مصنف مناقب قریش اور عمر بن الشبہ مصنف کتاب امراء الکوفہ و امراء البصرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اگرچہ ان مصنفین کی کتابیں اب ناپید ہو چکی ہیں لیکن دیگر کتابیں جو اس زمانے یا اس سے قریب تر زمانے میں لکھی گئیں ان میں بہت کچھ سرمایہ ان کتابوں کا محفوظ ہے۔ مثلاً عبداللہ بن مسلم قتیبہ کی کتاب المعارف، احمد بن داؤد ابوحنیفہ دینوری (المتوفی ۲۷۹ھ) کی کتاب اخبار الطوال، محمد بن سعد واقدی (المتوفی ۲۳۰ھ) کی کتاب طبقات ابن سعد، محمد بن ابی یعقوب کی کتاب تاریخ یعقوبی، احمد بن یحیٰ بلاذری کی کتاب فتوح البلدان، اور انساب الاشراف، ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی کتاب تاریخ طبری (جو تیرہ جلدوں میں ہے) علی بن الحسین مسعودی کی کتاب مروج الذہب اور کتاب الاشراف وغیرہ۔

یہ تصانیف جس دور کی ہیں وہ متقدمین کا دور کہلاتا ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز سے متوسطین کا دور شروع ہوتا ہے اس دور میں ابن اثیر، سمعانی، ذہبی، ابوالفداء نویری اور سیوطی وغیرہ نے نام پیدا کیا۔ مگر ان لوگوں میں خامی یہ تھی کہ تاریخ میں اضافہ کے بجائے انھوں نے جو طریقۂ کار اختیار کیا وہ یہ تھا کہ متقدمین میں سے کسی کی تصنیف سامنے رکھ لی اور اس میں تغیرات و اختصار پیدا کر کے اس کی ہیئت بدل دی۔ لیکن اس طریقۂ کار کے باوجود ان کتابوں کو عوامی حلقوں میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی اور تاریخ ابن اثیر نے تو وہ شہرت

ومقبولیت حاصل کی کہ اکثر قدماء کی تصنیفیں ناپید ہوگئیں۔

مختصر یہ کہ اموی اور عباسی عہد میں احادیث اور فقہ کی اشاعت بکثرت ہوئی اور خلفائے ثلاثہ کی شان میں جھوٹی حدیثوں اور غلط روایتوں کی بنیاد پر خوب کتابیں لکھی گئیں۔ اور چونکہ بنی عباس کے حکمرانوں نے طاقت اور دولت کا استعمال کر کے خاص توجہ کے ساتھ کتابیں تصنیف کرائیں اس لئے ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں خلفائے ثلاثہ، بنی امیہ اور بنی عباس کی فضیلت کے سلسلے میں کیا کچھ نہ لکھا گیا ہوگا۔ جب کہ یہ طے شدہ بات ہے کہ معاویہ کی حکومت کی بنیاد حضرت عثمان کی خلافت پر تھی، حضرت عثمان کی خلافت حضرت عمر کی مرہون منت تھی، حضرت عمر کی خلافت حضرت ابوبکر کی نوازشوں کا نتیجہ تھی اور خود حضرت ابوبکر کی خلافت سقیفہ بنی ساعدہ میں دھاندلی اور بے ایمانی کا ماحصل تھی۔ چنانچہ بے ضمیر محدثین اور مورخین نے بھی دنیاوی منفعت کے لئے وہ کارنامہ انجام دیا کہ غلط، مہمل اور لغو حدیثوں وروائتوں سے کتابوں کا دامن بھر گیا اور ہزاروں کی تعداد میں جعلی و فرضی حدیثیں وروائتیں قلم کے ذریعہ استحکام پاگئیں۔

معاویہ کے دورِ استبداد میں یہ ناممکن تھا کہ خلفائے ثلاثہ یا بنی امیہ کی شان کے خلاف کوئی ایک حرف بھی اپنے ہونٹوں تک لاسکے۔ اگر وہ ایسا کرتا بھی تو اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جاتی، اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دئے جاتے، اور اس کی آنکھوں میں لوہے کی گرم اور دہکتی ہوئی سلاخیں چلا دی جاتیں۔ یہی وہ خاص وجہ تھی کہ خلفاء کے ساتھ ساتھ بنی امیہ کے لئے بھی تاریخ کا دامن جعلی حدیثوں اور غلط روائتوں سے چھلک پڑا۔

چنانچہ امام بخاری نے جب اپنے دور میں صحیح حدیثوں کو جمع کرنا چاہا تو

وہ کئی لاکھ حدیثوں میں سے اپنی جامع میں صرف ۷۳۹۳ حدیثوں کو جگہ دے سکے اور ان میں سے مکررات کو علٰحدہ کر دیا جائے تو مجموعی طور پر کل ۲۷۶۱ حدیثیں باقی رہ جاتی ہیں۔

فرضی اور بے بنیاد حدیثوں کے اس طوفان نے اسلام کے مقصد کو جو نقصان عظیم پہنچایا، اس کی تلافی پھر ممکن نہ ہوسکی۔ کیونکہ ان فرضی حدیثوں میں سے بہت سی مقبول ہو کر رواج پاگئیں جن کی وجہ سے ہزاروں اقوال بے سبب پیغمبرؐ کی طرف منسوب ہوگئے اور امام ابوحنیفہ کے دور میں حدیثوں کا جو دفتر تیار ہوا وہ اغلاط، لغویات اور مہملات سے پُر تھا۔

محدثین کا کہنا ہے امام مالک نے جب موطاء لکھی تو اس وقت اس میں حدیثوں کی تعداد دس ہزار تھی لیکن تحقیق کے بعد یہ تعداد صرف چھ سات سو رہ گئی۔

امام شافعی کا کہنا ہے کہ ارباب معرفت کے نزدیک صحیح حدیثیں بہت ہی کم تعداد میں ہیں کیونکہ حضرت ابوبکر نے جو حدیثیں رسُولؐ اللہ سے روایت کی ہیں ان کی تعداد کل سترہ ہے۔ عمر بن خطاب کی روائتوں سے پچاس سے زیادہ حدیثوں کا ثبوت نہیں ملتا اور یہی حال عثمان کا بھی ہے۔

اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بھی بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو حاکم کے نزدیک درست ہیں لیکن ائمہ احادیث کے نزدیک وہ غلط اور مہمل ہیں۔ اور یہی نوعیت ان حدیثوں کی بھی ہے جنھیں ابونعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اور تقریباً یہی صورت خطیب بغدادی، ابوالفضل، ابوموسیٰ، ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی کی پیش کردہ حدیثوں کی بھی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کا بیان ہے کہ "ابونعیم، خطیب بغدادی، ابوالفضل،

ابوموسیٰ مدائنی اور حافظ عبدالغنی وغیرہ جو حدیثوں کے امام تھے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ خلفاء اور صحابہ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کیا کرتے تھے[1]"

معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت عثمان چونکہ اہل سنت کے دینی پیشوا اور مذہبی مقتدا تھے اس لئے اس مسلک کے راوی ان کے فضائل میں بے دھڑک غلط اور فرضی حدیثیں اور روائتیں بیان کیا کرتے تھے اور علماء آنکھ بند کر کے اپنی کتابوں میں جمع کرتے رہتے تھے۔

غلط حدیثیں وضع کرنے میں ابوہریرہ سب سے بھاری تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس حدیثیں ڈھالنے کی آٹومیٹک مشین تھی۔ چنانچہ صرف تقی ابن مخلد کی مسند میں ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کی تعداد پانچ ہزار تین سو بتائی گئی ہے۔ اور بخاری کا کہنا ہے کہ ابوہریرہ سے آٹھ سو علماء نے حدیثیں روایت کی ہیں۔ چنانچہ جو حدیثیں نسائی، ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر مبالغہ آرائی پر منحصر ہیں اور خلفاء و صحابہ کے فضائل میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر انھیں کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

جلیل القدر سنی عالم محمد بن عقیل کا بیان ہے کہ امام حسن سے صلح کے بعد معاویہ نے اپنے گورنروں، حاکموں اور والیوں کو حضرت علیؑ پر سب وشتم کرنے کا فرمان جاری کیا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ جو شخص علیؑ کے فضائل بیان کرے گا، حکومت اس سے بری الذمہ رہے گی۔ چنانچہ اس فرمان کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علیؑ کے فضائل سختی سے دبا دئے گئے، نیز شہروں اور دیہاتوں کے معاویہ نواز واعظ

---

[1] سیرۃ النبی ص ۳۹۔

اور خطیب حضرت علیؑ پر منبروں سے برسرِعام تبرا کرنے لگے۔ اس نئی مصیبت اور افتاد میں سب سے زیادہ کوفہ کے لوگ مبتلا ہوئے کیونکہ وہاں علوی شیعوں کی تعداد زیادہ تھی۔ متنزاد یہ کہ معاویہ نے ان لوگوں پر زیاد ابن سمیہ کو حاکم مسلط کر دیا۔ یہ آل رسولؐ کا جانی دشمن، بدترین مخالف اور کوفہ کے شیعوں سے اچھی طرح آگاہ اور واقف تھا۔ چنانچہ اس نے قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ شیعوں کو گرفتار کیا اور انھیں قتل کیا، جو لوگ قتل ہونے سے کسی طرح بچ گئے ان کے ہاتھ پیر کاٹ دئے گئے یا ان کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلاخیں چلا دی گئیں۔ ہزاروں افراد کو درختوں پر لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ لاکھوں بے گھر اور آوارہ وطن ہو گئے۔ ایسے اندوہ اور خونچکاں ماحول میں بھلا کس کی مجال تھی جو بنی امیہ یا خلفائے ثلاثہ کے خلاف زبان کھولتا، یا حق بیانی کی جسارت کرتا۔

معاویہ نے اپنے گورنروں اور والیوں کے نام یہ فرمان بھی جاری کیا کہ "کسی علوی شیعہ کی بیان کی ہوئی کسی بھی حدیث یا روایت کے بارے میں کسی گواہی کو قبول نہ کیا جائے اس کے برعکس جو لوگ حضرت عثمان کے فضائل میں حدیثیں بیان کریں انھیں حکومت کی جانب سے خصوصی مراعات اور عزت دی جائے اور ان کی فہرست مرتب کر کے ہمارے پاس ارسال کی جائے" تاکہ انھیں انعام و اکرام سے نوازا جاسکے۔ غرض کہ یہ شاہی فرمان جہاں جہاں پہنچا اسے خصوصی اہتمام کے ساتھ مشتہر کیا گیا اور حضرت عثمان کی شان میں حدیثیں جمع کرنے کے لئے جگہ جگہ کاتب اور محرر مقرر کر دئے گئے۔

اس فرمان کا اثر یہ بھی ہوا کہ دولت وثروت کے بھوکے راوی زمین سے پیدا ہونا شروع ہو گئے اور ہر کاذب انسان حدیثوں اور روائتوں کا خالق بن گیا۔ جھوٹے اور نچلی سطح کے لالچی لوگ حضرت عثمان کی شان میں بے سروپیر کی

حدیثیں بیان کرتے تھے اور کاتبوں سے انھیں لکھوا کر معاویہ کے پاس بھیج دیا جاتا تھا، اور وہاں سے انعامات و جاگیروں کے پروانے جاری ہو جاتے تھے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی کم وقفے میں عثمان کی شان میں حدیثوں کا ایسا زبردست انبار اور ڈھیر لگ گیا کہ خود معاویہ بھی پریشان ہو گیا۔ اور یہ حکم اسے جاری کرنا پڑا کہ حضرت عثمان پر حدیثیں زیادہ ہو چکی ہیں لہٰذا اس سلسلے کو روک کر راویوں کو یہ ہدایت کی جائے کہ اب وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی شان میں حدیثیں بیان کریں۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ جیسی حدیثیں علیؑ کی شان میں رسُول اللہ کی زبان سے وارد ہوئی ہیں بلکہ ویسی ہی حدیثیں ان حضرات کے لئے بھی بیان کی جائیں کیونکہ یہ تدبیر میرے لئے باعث مسرت ہے۔

اس حکم کے بعد حضرت عثمان کی شان میں حدیث سازی کا سلسلہ تو بند ہو گیا لیکن حضرت ابوبکر اور عمر کے لئے جھوٹے راویوں کی زبانوں پر حدیثوں اور روائتوں کی فصل اُگنے لگی۔ یہاں تک کہ دیکھتے ہی دیکھتے جعلی اور فرضی احادیث و روایات کے کھلیا لگنا شروع ہو گئے اور ایسی ایسی خود ساختہ حدیثیں عالم وجود میں آگئیں جن کی حیثیت چانڈو خانے کی گپ سے زیادہ قطعی نہیں تھی۔

یقیناً یہ وہ سیلاب تھا جس میں بڑے بڑے علماء، حفاظ اور مذہبی علوم کے علمبردار بہہ گئے۔ متزاد یہ کہ یہی حدیثیں مدرسوں میں بھی رائج کر دی گئیں اور انھیں کی روشنی میں طلباء کو درس دیا جانے لگا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو جھوٹ تھا وہ سچ بن گیا اور جو سچ تھا اسے جھوٹ تسلیم کر لیا گیا۔ مختصر یہ کہ معاویہ کی اس کوشش نے خلفائے ثلاثہ اور بنی امیہ کو نہ صرف فضیلت کے آسمان پر پہنچا دیا بلکہ کہیں کہیں انھیں رسُول اللہ سے بھی افضل بنا دیا۔

معاویہ کی وصیّت

بعض مورخین کا بیان ہے کہ وقت آخر جب معاویہ کا دم اس کے سینے میں گھٹنے لگا اور سانسوں کا نظام درہم برہم ہوا تو اس نے یزید کو طلب کیا اور اس نے کہا، اے فرزند! میں نے اپنی استبدادی قوت کو بروئے کار لا کر تیرے دشمنوں کو تیرے اقتدار کے راستے سے ہٹا دیا ہے اور عرب کے بڑے بڑے سرکشوں اور سورماؤں کو زیر کر کے خلافت کو تیرے حق میں مستحکم کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہ ابن عمر، عبدالرحمٰن ابن ابوبکر اور عبداللہ ابن زبیر پر قابو حاصل نہ ہو سکا۔ اس لئے میں ان لوگوں کی طرف سے فکرمند ہوں، حالانکہ عبادت کی کثرت نے عبدالرحمٰن ابن ابوبکر کا کام خود ہی تمام کر دیا ہے اور ان میں وہ قوت نہیں رہ گئی، لہٰذا جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کے سوا کوئی نہیں رہ گیا تو مجھے امید ہے کہ وہ تیری بیعت کر لیں گے۔ عبداللہ ابن عمر عورتوں کا شیدائی اور دوسروں کے مشوروں پر چلنے والا انسان ہے، اس لئے وہ اپنے اصحاب کی رائے پر عمل کرے گا۔ البتہ ابن زبیر شیر کی طرح تیری گھات میں رہے گا اور لومڑی کی طرح تجھے دھوکا دے گا لہٰذا جب موقع ملے تو اسے قتل کر دینا۔ اب رہ گئے حسینؑ ابن علیؑ، ان کی رگوں میں ہاشمی خون ہے، وہ کبھی تیری بیعت نہیں کریں گے اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ حق کے راستے سے تجھ پر خروج کریں گے۔ اس لئے ان سے مقابلے کے لئے تیار رہنا۔[1]

اس کے برخلاف، طبری اور دینوری کا بیان ہے کہ معاویہ کی موت کے

---

[1] سرگزست معاویہ ص ۴۵۶۔

وقت یزید اس کے پاس موجود نہیں تھا، بلکہ وہ اپنی تفریح گاہ "حوارین" میں رنگ رلیاں منا رہا تھا۔[1] چنانچہ معاویہ کی آنکھیں جب پتھرانے لگیں اور موت کا پسینہ نمودار ہوا تو اس نے محکمہ پولیس کے سربراہ ضحاک بن قیس فہری اور سیکورٹی انچارج مسلم بن عقبہ کو طلب کر کے ان سے کہا کہ موت میرے سر پر کھڑی ہے لہٰذا جب یزید آ جائے تو تم میرا یہ وصیت نامہ اسے دے دینا۔ وصیت نامہ میں اس نے منجملہ دیگر باتوں کے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ اے یزید! مجھے تیری مخالفت کے سلسلے میں حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہ ابن زبیر اور ابن عمر کی ذات سے سخت اندیشہ ہے۔[2]

اس اختلاف سے قطع نظر کہ یزید معاویہ کی موت کے وقت اس کے پاس موجود تھا یا نہیں، ان دونوں بیانوں میں یہ بات متفقہ طور پر تسلیم شدہ ہے کہ معاویہ نے وقت آخر اپنی وصیّت کے ذریعہ یزید کو متنبہ کر دیا تھا کہ حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہ ابن زبیر کا وجود اس حکومت کے لئے خطرے کا باعث ہے اور یہی وجہ تھی کہ تخت نشین ہوتے ہی یزید نے سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ والیٔ مدینہ ولید بن عقبہ کو اس نے لکھا کہ حسینؑ ابن علیؑ، عبداللہ ابن زبیر اور عبداللہ ابن عمر کو اس وقت تک نہ چھوڑ جب تک ان لوگوں سے میری بیعت نہ لے لینا۔[3]

---

[1] طبری ج ۶ ص ۱۸۲، ۱۸۳ [2] اخبار الطوال ص ۲۲۷۔ [3] اس سلسلے کے تفصیلی حالات کے لئے مولف کی کتاب "تفسیر کربلا" کا مطالعہ فرمائیں۔

معاویہ کی موت

طبری اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ اپنی موت سے کچھ دیر قبل معاویہ نے اپنے گھر والوں سے یہ فرمائش کی کہ میرے سر میں تیل ڈال کر کنگھی کر دو، داڑھی میں خضاب اور آنکھوں میں سرمہ لگا دو اور میرے چہرے پر صندل کا ابٹن مل کر اسے چکنا کر دو۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو اس نے کہا کہ اب فرش بچھا کر گاؤ تکیہ کے سہارے مجھے بٹھا دو اور لوگوں کو بلا کر ان سے کہو کہ وہ کھڑے ہو کر مجھے سلام کریں اور ان میں سے کوئی شخص بیٹھنے کی جسارت نہ کرے۔

چنانچہ لوگ آتے تھے، کھڑے ہو کر سلام کرتے تھے اور حیرت و استعجاب سے دیکھتے تھے کہ معاویہ زلفیں سنوارے آنکھوں میں سرمہ لگائے ہوئے چکنا چپڑا بنا بیٹھا ہے، تو کہتے تھے کہ اس کا آخری وقت آ چکا تھا لیکن یہ تو پہلے سے زیادہ تندرست و توانا معلوم ہوتا ہے۔ غرض کہ سینکڑوں لوگ جب سلام کر کے رخصت ہو گئے تو معاویہ نے ایک شعر پڑھا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ:۔

"میں نے اپنے کو اس لئے سنوارا ہے کہ لوگوں کو دکھا دوں کہ حادثات زمانہ تو کیا موت کی سختیوں سے بھی میں متزلزل نہیں ہوتا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ موت کی کشمکش کے دوران بھی معاویہ کی مکاری ختم نہیں ہوئی تھی، وہ دنیا سے جا رہا تھا لیکن بادی النظر میں لوگوں کو دھوکا دے رہا تھا کہ میں تندرست اور صحت مند ہوں۔[1]

تاریخوں سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ معاویہ کی موت کا سبب کیا تھا؛

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۴۵۸۔

ابن کثیر کا بیان ہے کہ اسے لقوہ کی بیماری لاحق تھی' طبری کا کہنا ہے کہ اسے خون تھوکنے کا مرض ہوگیا تھا اور اسی میں اس کی جان چلی گئی' جب کہ مولوی عبدالوحید خاں کی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ معاویہ کے گلے میں کینسر تھا جس کی وجہ سے وقت آخر اس کے حلق سے کتوں اور بلیوں کی آوازیں نکلنے لگی تھیں اور اسی حالت میں اس کا انتقال ہوگیا۔[1]

علامہ راغب اصفہانی "محاضرات" میں رقم طراز ہیں کہ جب معاویہ اس سے پہلے بیمار ہوا تھا تو ایک طبیب نے اس کا علاج کیا تھا اور اسے تسکین دی تھی کہ تم اچھے ہو جاؤ گے۔ چنانچہ وہ اچھے ہو گئے۔ دوبارہ پھر بیمار پڑے تو ایک نصرانی ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میرے پاس ایک ایسا تعویذ ہے کہ اسے جس بیمار کے گلے میں ڈال دیا جائے وہ شفایاب ہو جائے گا۔ معاویہ نے وہ تعویذ لے کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ اتفاقاً اس طبیب کا پھر گزر ہوا جو پہلے آچکا تھا۔ اس نے معاویہ کو دیکھ کر کہا کہ اب یہ یقیناً مر جائیں گے چنانچہ اسی رات کو ان کا انتقال ہوگیا۔ لوگوں نے اس طبیب سے پوچھا کہ آپ نے کیونکر جانا کہ معاویہ مر جائیں گے۔ اس نے کہا' حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ نے فرمایا تھا کہ معاویہ اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک اس کے گلے میں صلیب نہ لٹکائی جائے گی۔ چنانچہ جو تعویذ وہ پہنے تھا اس پر صلیب بنی ہوئی تھی اس لئے میں نے یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ وہ ضرور مر جائے گا۔

مورخ ابوالفدا کا کہنا ہے کہ حشر کے دن معاویہ یہودی اور عیسائی محشور ہوگا کیونکہ وہ حضرت علیؑ کا جانی دشمن اور انھیں اذیتیں پہنچانے والا ایک ظالم و جابر انسان تھا اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ جو شخص علیؑ اور ان کی اولادوں

---

[1] سرگزشت معاویہ ص ۴۵۸۔

کو اذیت پہنچائے گا وہ حشر کے میدان میں یہودی اور عیسائی محشور ہوگا۔

یہ روایت بھی بہت مشہور ہے کہ جس جگہ معاویہ کی اصل قبر تھی وہاں اب چوڑیاں بنانے کی بھٹی بنی ہوئی ہے جو جہنم کی آگ کی طرح ہر وقت دھکتی رہتی ہے۔

معاویہ کی تاریخ انتقال کے بارے میں بھی مورخین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض نے رجب ۶۰ھ کی پہلی تاریخ، بعض نے پندرہ تاریخ اور بعض نے اکیسویں تاریخ بتائی ہے۔ مگر طبری کے بیان کے مطابق مرگ معاویہ کی اصل تاریخ ۲۲، رجب ۶۰ھ ہے اور عام مسلمانوں کا اسی تاریخ پر اتفاق ہے۔ وقت انتقال معاویہ کی عمر کے بارے میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی عمر اس وقت ۷۸ سال کی تھی"۔

معاویہ کی فضیلت

مسلمانوں کا ناصبی[1] گروہ معاویہ کو فضیلت مآب ثابت کرنے کے لئے عام طور پر جن حدیثوں کا سہارا لیتا ہے وہ جعلی، فرضی، جھوٹی، من گھڑت اور موضوعہ ہیں۔ نہ ان کی کوئی اصلیت و حقیقت ہے اور نہ کوئی اہمیت۔ لیکن اس کے باوجود معاویہ نواز علماء و محدثین نے ان حدیثوں کو نہ صرف اپنی کتابوں میں

---

[1] ناصبی کی اصطلاح سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی دائمی دشمنی' یا بغض و حسد کے ہیں۔ ناصبی کا لفظ ان نام نہاد مسلمانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جو حضرت علیؑ اور ان کی اولادوں سے نفرت، عداوت یا بغض و حسد رکھتے ہیں۔ اس اصطلاح کے دائرے میں مروان بن حکم' زیاد بن سمیہ اور معاویہ ابن ابوسفیان کے ساتھ ساتھ دور رسالت کی وہ بھاری بھرکم شخصیتیں بھی آجاتی ہیں جنھیں مسلمان انتہائی محترم و مقدس خیال کرتے ہیں"۔ (مولف)

خصوصی اور نمایاں طور پر نقل کیا ہے بلکہ انھیں صداقت کا قلمی جامہ پہنانے کی کوشش میں اپنی علمی صلاحیتوں کا بھرم بھی کھو بیٹھے ہیں۔ مثال کے طور پر سنن ترمذی میں نقل کی گئی دو حدیثیں ملاحظہ ہوں جن میں رسولؐ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے معاویہ صاحب کے حق میں دعائیہ کلمات استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) اے اللہ! تو معاویہ کو ہدایت یافتہ' ہدایت دینے والا' اور ہدایت کا ذریعہ قرار دے۔

(۲) عمر بن سعد سے مروی ہے کہ "رسولؐ اللہ نے فرمایا"۔ اے خدا! معاویہ کے ذریعہ لوگوں کی ہدایت فرما۔

ترمذی کے نزدیک پہلی حدیث اپنے اسناد کے اعتبار سے احسن اور دوسری ضعیف ہے۔ لیکن اگر ان دونوں حدیثوں کو اسناد کی میزان پر پرکھا جائے تو یہ دونوں بوکس، مہمل اور غیر معیاری ثابت ہوتی ہیں اور نہ ہی ان حدیثوں میں ایسی کوئی بات ہے جس سے معاویہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہو۔

اس کے علاوہ رسولؐ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اگر معاویہ کے حق میں اس قسم کی کوئی دعا کی ہوتی تو اسے شرف قبولیت سے ہمکنار بھی ہونا چاہئے تھا کیونکہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی پیغمبرؐ کی دعا اپنے اثر سے محروم نہیں رہ سکتی۔

دوسرے یہ کہ معاویہ کے کردار زندگی کو تاریخ کے آئینے میں دیکھنے والا کوئی بھی حق پسند و مصنف مزاج انسان ان کے بارے میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ وہ "ہدایت یافتہ" یا "ہدایت کا ذریعہ" تھے۔ بلکہ وہ یہ رائے قائم کرے گا کہ معاویہ صاحب گمراہی کے امام اور گمراہوں کے پیشوا تھے جنھوں نے زندگی بھر دھوکا' فریب، جعل سازی' مکاری اور فتنہ پردازی سے کام لے کر اپنے' اور اپنے بعد اپنے بدکردار بیٹے کے لئے حکومت کی بنیادوں کو مضبوط و مستحکم کیا اور مرتے وقت یزید کو "قتل حسینؑ" کا مشورہ دے کر امت مسلمہ

میں ایک ایسا فتنہ برپا کر گئے' جس کی بازگشت قیامت تک سنائی دیتی رہے گی۔

تیسرے یہ کہ جب حتمی طور پر یہ بات تمام معتبر و مستند اسلامی کتابوں سے ثابت ہے کہ معاویہ صاحب خود ہدایت یافتہ نہیں تھے تو وہ دوسروں کے لئے ہدایت کا ذریعہ کیونکر بن سکتے ہیں؟

چوتھے یہ کہ بالفرض محال چند لمحوں کے لئے اگر ان حدیثوں کو درست مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں یہی رائے قائم ہو سکتی ہے کہ جس طرح کسی گنہگار اور خطا کار انسان' یا کسی مشرک و کافر کے مشرکانہ و کافرانہ فعل کو دیکھ کر یہ کلمہ بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے کہ "پروردگار اسے ہدایت فرما" یا "نیک عمل کی توفیق عطا کر" اسی طرح پیغمبرؐ اسلام کی زبان مبارک پر معاویہ کو دیکھ کر اس قسم کے کلمات کا جاری ہونا' اور بعد میں تغیر و تبدل کے ذریعہ انھیں کلمات سے اپنے مطلب کی حدیثیں وضع کر لینا بعید از قیاس ہرگز نہیں ہے۔

پانچویں یہ کہ رسولؐ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ بنی امیہ جنھوں نے مجبوراً اور مصلحتاً اسلام قبول کیا ہے' میرے بعد کیا کیا فتنے برپا کریں گے۔ اور حضور کو اس بات کا بھی اندازہ تھا کہ بنی امیہ کے سردار ابوسفیان کی اولادوں میں معاویہ سب سے بڑا فتنہ پرداز ثابت ہوگا' اس لئے ایسے بدباطن شخص کی فضیلت میں آپ کی زبان مبارک سے اس قسم کی حدیثوں کا وارد ہونا محض غیر یقینی ہی نہیں بلکہ ناممکنات میں سے ہے۔

چھٹے یہ کہ۔ معاویہ کو بھی یہ معلوم تھا کہ اہل حجاز انھیں اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کے مجبوری والے اسلام سے بھی واقف ہیں۔ نیز یہی وہ لوگ ہیں جو اہل الرائے ہیں اور انھیں کو شوریٰ کا اختیار بھی حاصل ہے لہٰذا وہ بنی امیہ کی مدد سے بزور شمشیر ان پر مسلط ہو گئے۔ جیسا کہ مسجد نبوی کی تقریر اور عائشہ بنت عثمان سے معاویہ کی

گفتگو اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے"۔

ساتویں یہ کہ امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی کتابوں میں معاویہ کے "فضائل و مناقب" کا کوئی باب قائم نہیں کیا' جب کہ دوسرے صحابہ کے فضائل الگ الگ ابواب کے ساتھ ان کی کتابوں میں مرقوم ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دو چار فضیلتیں بھی معاویہ کی ذات سے وابستہ ہوتیں تو یہ علماء اپنی کتابوں میں ان کے لئے بھی کوئی باب ضرور قائم کرتے۔

آٹھویں یہ کہ۔ ابن خلکان نے امام نسائی کے سلسلے میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ:۔

آخر عمر میں جب وہ دمشق گئے تو ان سے معاویہ کے فضائل کے بارے میں لوگوں نے پوچھا' انھوں نے فرمایا کہ میں ان کے فضائل کے رموز کیا بیان کروں۔ مختصر یہ کہ مجھے تو ان کی یہ فضیلت معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق صرف یہ فرمایا کہ "خدا اس ملعون کا پیٹ کبھی نہ بھرے"۔

اہل شام نے پیغمبر اکرم کی یہ حدیث امام نسائی کی زبان سے سن کر انھیں پٹک دیا اور ان کے دونوں خصیتے نکال لئے نیز اس قدر روندا کہ اسی میں ان کی جان چلی گئی۔ اس حدیث کو امام مسلم نے بھی اپنی صحیح میں مختلف لفظوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔

نویں یہ کہ۔ معاویہ کی شان میں اس قسم کی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اس کا دامن اسلامی فضیلتوں سے یکسر خالی تھا۔ نیز یہ کہ حضرت علیؑ ابن ابیطالب کے مخالفین کو تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے اندر جب کوئی عیب نظر نہ آیا تو ان لوگوں نے امیر المومنین کے سب سے گھٹیا دشمن اور سیاسی حریف معاویہ کے بارے میں ایسی حدیثیں وضع کر کے انھیں رسول اکرم کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیں جیسی کہ حضور کی زبان سے علیؑ کی شان میں وارد ہوئیں

تھیں۔ لیکن ان بیوقوفوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ معاویہ کی زندگی سے عدم مطابقت کی بنا پر یہ حدیثیں کتنی مضحکہ خیز ہو جائیں گی۔

دسویں یہ کہ۔ اسی قسم کی اور بھی من گھڑت اور مضحکہ خیز روایتیں اور حدیثیں معاویہ کی شان میں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ روایت کہ:۔

معاویہ صاحب عشق رسول میں اس قدر دیوانے تھے کہ کسی بدو کی چال ڈھال میں رسول اللہ کی جھلک کی اطلاع انھیں جب دی گئی تو وہ مضطرب و بے چین ہو گئے اور ان کی یہ اضطرابی کیفیت اتنی ترقی کر گئی کہ انھوں نے خط لکھ کر اس بدو سے زیارت کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ وہ آیا تو اسے دیکھ کر آپ نے درود سلام کے نعرے بلند کئے اور اس کی تعظیم و احترام میں مسند شاہی چھوڑ کر سروقد کھڑے ہو گئے اور اسے گلے سے لگایا نیز مال و زر سے نوازا۔

لیکن۔ انھوں نے نفس رسول (علیؑ) سے جنگ کی' پیغمبرؐ کی ذریت کو تباہ و برباد کیا' اور رسول اللہ کے فرزند امام حسنؑ مجتبیٰ کو زہر سے شہید کیا۔ تاکہ ان کے فاسق و فاجر بیٹے (یزید) کی خلافت کا راستہ ہموار ہو سکے۔

معاویہ اور مودودی

پاکستان کے ممتاز سنی عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "خلافت و ملوکیت" میں معاویہ ابن ابوسفیان کے مجرمانہ طرز عمل کے خلاف جو چارج شیٹ مرتب کی ہے اس سے عالم اسلام کا ہر پڑھا لکھا انسان واقف ہے۔ تاہم اس موقع پر ہم مولانا موصوف کی مرتبہ چارج شیٹ کے کچھ اقتباسات نقل کر دینا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ جو حضرات "خلافت و ملوکیت" کا مطالعہ کسی وجہ سے نہیں فرما سکے وہ ان اقتباسات کی روشنی میں معاویہ کے کیریکٹر کو اچھی طرح

سمجھ سکیں اور اس کے بارے میں کسی فیصلے تک پہنچ سکیں۔

قانون کی بالاتری کا خاتمہ

سب سے بڑی مصیبت جو ملوکیت کے دور میں مسلمانوں پر آئی وہ یہ تھی کہ اس دور میں قانون کی بالاتری کا اصول توڑ دیا گیا۔ حالانکہ وہ اسلامی ریاست کے اہم ترین بنیادی اصولوں میں سے تھا۔ اسلام جس بنیاد پر دنیا میں اپنی ریاست قائم کرتا ہے وہ یہ کہ شریعت سب پر بالا ہے۔ حکومت اور حکمران راعی اور رعیت بڑے اور چھوٹے' عوام و خواص سب اس قانون کے تابع ہیں کوئی اس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں' دوست ہو یا دشمن' حربی کافر ہو یا معاہد' مسلم رعیت ہو یا ذمی مسلمان وفادار ہو' یا باغی یا برسر جنگ غرض جو بھی ہو شریعت میں اس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے جس سے کسی حال میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

"خلافت راشدہ اپنے پورے دور میں اس قاعدے کی سختی کے ساتھ پابند رہی حتیٰ کہ حضرت عثمان اور حضرت علیؑ نے انتہائی نازک اور سخت اشتعال انگیز حالات میں بھی حدود شرع سے باہر قدم نہ رکھا۔ ان راست رو خلفاء کی حکومت کا امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ ایک حدود آشنا حکومت تھی نہ کہ مطلق العنان حکومت"[1]

مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو بادشاہوں نے اپنے مفاد' اپنی سیاسی اغراض

---

[1] اس پیراگراف سے میں پوری طرح متفق نہیں ہوں۔ تفصیل کے لئے مولف کی کتاب "تحفہ ء حصہ اول و دوم" کا مطالعہ فرمائیں انشاءاللہ حضرات شیخین اور حضرت عثمان کی شرعی پابندیوں کا سراغ بعید معلوم ہو جائے گا۔ (مولف)

اور خصوصاً اپنی حکومت کے قیام و بقا کے معاملہ میں شریعت کی عائد کی ہوئی کسی پابندی کو توڑ ڈالنے اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کیا۔ اگرچہ ان کے عہد میں بھی مملکت کا قانون اسلامی قانون ہی رہا...... لیکن ان بادشاہوں کی سیاست دین کی تابع نہ تھی۔ اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس معاملے میں حرام و حلال کی تمیز روا نہ کرتے تھے...... یہ پالیسی حضرت معاویہ کے عہد ہی سے شروع ہو گئی تھی"[1]۔

معاویہ کی بدعتیں

پہلی بدعت:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفاء کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے نہ مسلمان کافر کا۔ معاویہ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمانوں کو کافر کا وارث قرار دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آ کر اس بدعت کو ختم کیا[2]۔

دوسری بدعت:۔ دیت کے معاملہ میں بھی معاویہ نے سنت کو بدل دیا۔ سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہو گی۔ مگر معاویہ نے اسے نصف کر دیا اور باقی نصف خود لینی شروع کر دی[3]۔

تیسری بدعت:۔ مال غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی معاویہ نے کتاب اللہ و سنت رسول کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رو سے پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے اور باقی

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۰، ۱۶۱ [2] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۱۔ [3] خلافت و ملوکیت ص ۶۱۔

چار حصے اس فوج میں تقسیم کئے جانے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو لیکن معاویہ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال لیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔[1]"

سنگین الزامات

حضرت علیؑ پر سبّ و شتم:۔ معاویہ خود اور ان کے حکم سے تمام گورنر خطبوں میں بر سر منبر حضرت علیؑ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی میں، منبر رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؑ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتے دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے آ کر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایات کو بھی بدلا۔[2]

استلحاق زیاد:۔ زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی ان کے افعال میں سے ہے جن میں انھوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی...... معاویہ نے زیاد کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انھیں کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۲۔ [2] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۱۔

اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہری ہے مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریحاً ناجائز فعل ہے کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔[1]"

گورنروں کی آزادی:۔ معاویہ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا کہ ایک شخص نے دوران خطبہ اس کو کنکر مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ معاویہ کے پاس جب استغاثہ کیا گیا تو اس نے فرمایا کہ ..... میرے عمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں ہے۔ زیاد کو جب معاویہ بصرے کے ساتھ کوفہ کا بھی گورنر مقرر کیا اور وہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کے لئے کوفہ کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ لوگوں نے اس پر کنکر پھینکے۔ اس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کرا دئے اور کنکر پھینکنے والے تمام افراد کو (جن کی تعداد ۳۰ سے ۸۰ تک بیان کی جاتی ہے) گرفتار کرا کے اسی وقت ان کے ہاتھ کٹوا دئے۔ کوئی مقدمہ ان پر نہ چلایا گیا، کسی عدالت میں وہ نہ پیش کئے گئے۔ اس گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطع ید کی سزا دے ڈالی جس کے لئے قطعاً کوئی شرعی جواز نہ تھا مگر دربار خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ اس سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بسر بن ارطاۃ نے کئے جسے معاویہ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؑ کے قبضے سے نکالنے کے لئے بھیجا تھا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لئے مامور کیا تھا۔ اس شخص نے یمن میں حضرت علیؑ کے گورنر عبداللہ بن عباس

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۲، ۱۶۳۔

کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ان بچوں کی ماں اس صدمے سے دیوانی ہو گئی...... اس کے بعد اسی ظالم شخص کو معاویہ نے ہمدان پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا جو اس وقت حضرت علیؑ کے قبضہ میں تھا۔ وہاں اس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک ظلم عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئی تھیں انھیں لونڈیاں بنا لیا۔ حالانکہ شریعت میں اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے اور سیاسی معاملات میں شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں۔[1]

سروں اور لاشوں کی بے حرمتی:۔ سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی اسی "معاویہ" کے دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔

سب سے پہلا سر جو زمانۂ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمار بن یاسر کا سر تھا۔ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے اور ابن سعد نے بھی طبقات میں اسے نقل کیا ہے کہ جنگ صفین میں حضرت عمار یاسر کا سر کاٹ کر معاویہ کے پاس لایا گیا۔

اس کے بعد دوسرا سر عمرو بن الحمق کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے...... اسے بر سر عام گشت کرایا گیا اور پھر لے جا کر ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا۔ ایسا ہی وحشیانہ سلوک مصر میں محمد بن ابوبکر کے ساتھ کیا گیا جو وہاں حضرت علیؑ کے گورنر تھے۔ معاویہ کا جب مصر پر قبضہ ہوا

---

[1] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵۔

تو انھیں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا اور پھر ان کی لاش کو ایک مردہ گدھے کی کھال میں رکھ کر جلا دیا گیا۔[1] اس کے بعد تو یہ ایک مستقل طریقہ بن گیا کہ جن لوگوں کو سیاسی انتقام کی بنا پر قتل کیا جائے ان کی لاشوں کو بھی معاف نہ کیا جائے۔ حضرت حسینؑ رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے دمشق لے جایا گیا اور ان کی لاش کو گھوڑے دوڑا کر روندا گیا۔[2]

ان تاریخی اعترافات کے علاوہ مولانا مودودی نے اپنی مسلکانہ مجبوریوں کی بنا پر معاویہ کی کچھ خدمات کا اعتراف بھی بڑے مستحسن انداز میں کیا ہے جن میں دو باتوں کو موصوف نے بڑی اہمیت دی ہے۔ اوّل یہ کہ "معاویہ نے پورے عالم اسلام کو دوبارہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع کیا۔" اور دوسرے یہ کہ "انھوں نے فتوحات کے دائرے کو وسیع کیا۔"

دوبارہ عالم اسلام کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ پیغمبرؐ کی وفات کے بعد اسلامی معاشرے کا شیرازہ مکمل طور پر بکھر چکا تھا اور خلفاء کی ناقص پالیسیوں نے مسلمانوں میں افتراق و انتشار پیدا کر دیا تھا۔ جسے ختم کر کے معاویہ نے مسلمانوں کو سمیٹا اور اپنی ملوکیت کے دائرے میں نصب شدہ تخریبی اور غیر اسلامی جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اس خدمت کو بیان کرتے وقت مولانا موصوف کے ذہن عالیہ میں یقیناً یہ بات بھی رہی ہو گی کہ حضرت علیؑ کی شہادت اور امام حسنؑ علیہ السّلام کی خلافت سے دستبرداری کے بعد معاویہ اور اس کے گورنروں کے مظالم نے مسلمانوں کو اس امر پر مجبور کر دیا تھا کہ

---

[1] بعض مستند کتابوں میں ہے کہ معاویہ کے حکم سے محمد بن ابوبکر کو گدھے کی کھال میں سلوا کر زندہ جلا دیا گیا تھا۔ [2] خلافت و ملوکیت ص ۱۶۵، ۱۶۶۔

وہ اس کے اقتدار کو تسلیم کرلیں۔ لہٰذا یہ کہنا ہی عبث ہے کہ اس نے پورے عالم اسلام کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرلیا تھا۔ مگر ہائے رے مسلک کی مجبوریاں!!۔

جہاں تک فتوحات کے دائرے میں وسعت پیدا کرنے کا سوال ہے، اس کے بارے میں مولانا موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ "معاویہ نے اسلام کے غلبہ کا دائرہ اور وسیع کردیا"۔ کاش کہ اس کے بجائے مودودی صاحب یہ تحریر فرماتے کہ "معاویہ نے ملوکیت کے غلبہ کا دائرہ اور وسیع کردیا" کیونکہ امام حسنؑ کی وفات کے بعد عالم اسلام اور مسلمانوں پر ملوکیت غالب آچکی تھی اور اس کا اعتراف مولانا نے اپنی کتاب میں مختلف مواقع پر خود کیا ہے۔"

آزادئ اظہار رائے کا خاتمہ

مذکورہ عنوان کے تحت مولانا موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ:۔ "دور ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دئے گئے تھے اور زبانیں بند کردی گئیں تھیں۔ اب قاعدہ یہ ہوگیا تھا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو ورنہ چپ رہو۔ اگر تمہارا ضمیر ایسا زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید، قتل اور کوڑوں کی سزا کے لئے تیار ہوجاؤ۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے سے باز نہ آئے، انھیں بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہوجائے[1]۔"

معاویہ کے نام دو خطوط

(۱) محمد ابن ابوبکر کا خط معاویہ کے نام:۔ جنگ صفین سے

[1]۔ خلافت و ملوکیت ص ۱۶۹۔

کچھ پہلے محمد بن ابوبکر نے اپنے ایک خط میں معاویہ کو لکھا کہ:۔ خلفاء نے علیؑ ابن ابیطالب کے حقوق کو غصب کیا اور اب تو بھی ضلالت و گمراہی میں پڑا ہوا ہے انشاء اللہ عنقریب تجھ کو معلوم ہوگا کہ حق اور عاقبت کن لوگوں کے ساتھ ہے۔

اس خط کے جواب میں معاویہ نے محمد بن ابوبکر کو لکھا کہ:۔ خلفاء علیؑ کے حقوق سے آگاہ تھے لیکن تمہارے باپ ابوبکر اور فاروق (عمر) نے باہم اتفاق کرکے علیؑ سے ان کے حق کو چھین لیا۔ اب تو مجھے کیا نصیحت کرتا ہے؟ جب کہ تیرے باپ بن قحافہ کے استبدادی طریقے سے اس کی ابتدا کی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہم سب اس فعل میں تیرے باپ کے ساتھ شریک تھے۔ اگر تیرا باپ عمر کے ساتھ مل کر ایسا فعل زشت نہ کرتا اور وہ علیؑ کا مطیع رہتا تو ہم کبھی مطیع رہتے اور خاندان رسالت کی مخالفت نہ کرتے۔ اس صورت میں اسلام اپنے حقیقی مرکز پر قائم رہتا، مگر اسلام کا اپنا حقیقی مرکز پر قائم رہنا ہم لوگوں کو منظور نہ تھا[1]۔"

(۲) حضرت عمر کا خط معاویہ کے نام:۔ حضرت عمر کے زمانۂ خلافت میں معاویہ جب شام کا حاکم تھا تو انھوں نے اسے خفیہ طور پر ایک خط لکھا تھا جو اسلام سے نفرت اور خاندان رسالت سے ازلی دشمنی کا مظہر ہے۔ اس خفیہ تحریر کا راز اس وقت کھلا جب ۶۱ھ میں امام حسین علیہ السّلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ تین دن کے بھوکے پیاسے میدان کربلا میں شہید کردئے گئے اور ان کی شہادت کے بعد عبداللہ ابن عمر نے یزید ابن معاویہ کو ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر تھا کہ تو نے آل رسولؐ کو شہید کرکے اسلام میں ایک فتنۂ عظیم برپا کردیا ہے۔

[1]۔ تاریخ کامل ج ۶ ص ۷۹ مطبوعۂ مصر۔

جواب میں یزید نے عبداللہ ابن عمر کو لکھا کہ اے احمق! یہ راہ تو تیرے باپ ہی کی دکھائی ہوئی ہے، لہٰذا حسینؑ کے قتل کا الزام بھی تیرے باپ کے سر جاتا ہے، اور اگر اس امر میں تجھے کوئی اختلاف ہے تو تیرے باپ کی تحریر میرے پاس موجود ہے۔"

یزید کا یہ خط موصول ہوا تو عبداللہ ابن عمر غصہ کی حالت میں عازم دمشق ہوئے اور وہاں پہنچ کر انھوں نے یزید سے تلخ لہجے میں گفتگو کی۔ یزید نے عبداللہ سے دریافت کیا کہ کیا تم اپنے باپ کی تحریر پہچانتے ہو؟ عبداللہ نے کہا "ہاں"۔ تب یزید نے ایک صندوق اپنے محل سے منگوایا اور اس میں سے ایک خط نکال کر عبداللہ ابن عمر کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا "یہ تمہارے باپ کے ہاتھ کی تحریر ہے یا نہیں؟ عبداللہ ابن عمر نے کہا، بے شک یہ میرے والد کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ اس پر یزید نے مسکراتے ہوئے کہا، اب تم اسے اچھی طرح پڑھ لو۔ عبداللہ نے پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا:۔

اے معاویہ! آگاہ ہو کہ محمدؐ نے حیلہ، اور جادو کے ذریعے مجھے "لات وہبل" کی پرستش اور عبادت سے روکا، اور محمدؐ کا جادو موسیٰؑ کے جادو سے زیادہ کارگر تھا، لیکن ہم اپنے سابقہ دین پر قائم ہیں۔ ہمارے دل سے لات وہبل کی محبت ہرگز نہیں گئی اور نہ مرتے دم تک کبھی جائے گی۔ محمدؐ نے جب دنیا سے رحلت کی تو میں نے اپنی تدبیروں کو بروئے کار لاکر اپنے قبیلے کی مدد سے اسلام کی زمین کو روند ڈالا۔ اور علیؑ کے خلاف چالیس آدمیوں کو جھوٹی گواہی پر مامور کیا کہ محمدؐ فرما گئے تھے کہ خلیفہ قریش سے ہوگا۔ اس طرح ہم نے علیؑ کے ہاتھ سے خلافت چھین لی۔ میں اگرچہ ظاہری طور پر پیغمبرؐ کی متابعت کرتا رہا مگر میرا باطن آج بھی وہی ہے جو قبل اسلام تھا اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہوسکا اولاد محمدؐ کی

ایذا رسانی میں کوئی رعایت یا کمی میں نے نہیں کی۔ اور جب تک زندہ رہوں گا اس سلسلے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔"

اے معاویہ! تجھ کو میں نصیحت کرتا ہوں کہ جہاں تک ہوسکے آل رسولؐ کو ذلیل و رسوا اور تباہ و برباد کرتے رہنا اور جب موقع ہاتھ آئے تو خاندان رسالت کی کسی فرد کو زندہ نہ چھوڑنا۔ اور اس بات کی بھی امکانی کوشش کرنا کہ کسی بھی حالت میں آل رسولؐ قوت نہ پکڑنے پائیں۔ لیکن خبردار، ظاہرا طور پر مسلمان بنے رہنا، تاکہ لوگ تجھ پر خروج نہ کرسکیں۔ اور میرے اس خط کو صیغۂ راز میں رکھنا[1]۔"

یہ خط پڑھنے کے بعد عبداللہ ابن عمر کے دل کو سخت دھچکا لگا اور وہ روتے ہوئے خاموشی کے ساتھ واپس آگئے۔ نیز ان دونوں خطوط کی تمام باتیں پوری طرح واضح ہیں اس لئے میں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔"

معاویہ کے بارے میں چند علمائے اہلسنت کے نظریات

معاویہ کے بارے میں علمائے اہلسنت کے نظریات و خیالات بہت واضح ہیں۔ یزیدیت اور ناصبیت کے مبلغین کو چھوڑ کر کوئی بھی سنی عالم ایسا نہیں ہے جو معاویہ کو خلفائے راشدین کی فہرست میں شامل کرنے یا ان کی بے اعتدالیوں کو سند جواز عطا کرنے کے لئے تیار ہو۔ اور نہ ہی کوئی معاویہ کے حضرات شیخین سے سرداری میں افضل ہونے کا قائل ہے۔"

جن غیر متعصب سنی عالموں نے معاویہ کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں ان کی فہرست کافی طویل ہے اس لئے ہم یہاں چند مقتدر عالموں کے

[1]۔ خلعت فلانلم ص ۲۵۵، انوار النعمانیہ ج ۱ ص ۲۱، ثبوت خلافت دوم ص ۱۰۲۔

نظریات و خیالات پر ہی اکتفا کریں گے۔"

علامہ حسن بصری

معاویہ کے اندر چار خصلتیں ایسی تھیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی اس کے اندر ہوتی تو اس کے عذاب کی تلوار امت مسلمہ کی گردنوں کے لئے کافی ہوتی۔ اول یہ کہ اس نے بغیر مشورہ حکومت اسلامی پر قبضہ کر لیا' جب کہ بہت سے صحابہ اور صاحب فضیلت لوگ اس وقت موجود تھے۔ دوسرے یہ کہ اس نے اپنے شرابی بدکردار اور زانی بیٹے کو اپنا جانشین اور ولی عہد قرار دیا جو ریشمی لباس پہنتا تھا اور گانے بجانے کا شوقین تھا۔ تیسرے یہ کہ اس نے زیاد بن سمیہ کو اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا' جب کہ رسول اللہ نے حتمی طور پر یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ بیٹا اس شوہر کا ہوتا ہے جو اس کے بستر پر پیدا ہوا ہو اور زانی کے لئے صرف پتھر ہیں۔ اور چوتھے یہ کہ اس نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا[1]۔"

مولوی عبدالشکور لکھنوی

فائدہ عقیدہ نمبر ۱۱۔ حضرت علیؑ مرتضیٰ کو اپنے زمانۂ خلافت میں دو خانہ جنگیاں پیش آئیں۔ اول جنگ جمل میں ایک جانب علیؑ مرتضیٰ تھے اور دوسری جانب ام المومنین حضرت عائشہ تھیں ...... دوم جنگ صفین میں ایک جانب حضرت علیؑ اور دوسری طرف حضرت معاویہ تھے۔ اس لڑائی کے متعلق اہل سنت کا فیصلہ ہے کہ حضرت علیؑ مرتضیٰ خلیفۂ برحق تھے اور حضرت

---

[1] اس واقعہ کو بہت سے مورخین نے بیان کیا ہے اس لئے کسی مخصوص حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔

معاویہ اور ان کے ساتھ والے باغی و خاطی[1]۔"

مولانا ابوالکلام آزاد

خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کا دور فتن و بدعات سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے نظام حکومت اسلامی کی بنیادیں متزلزل کر دیں۔ بنی امیہ کی سب سے پہلی بدعت اور اسلام و مسلمین پر ان کا ظلم یہ ہے کہ انھوں نے نظام حکومت اسلامیہ کا تختہ یکسر الٹ دیا اور خلافت راشدہ صحیحہ کے بجائے مستبدہ و ملک عضوض کی بنیاد ڈال۔ یہ انقلاب بہت شدید تھا اور بہت مشکل تھا کہ ملک کو اس پر راضی کیا جائے۔ صحابہ کرام بھی موجود تھے اور خلافت راشدہ کے واقعات بچے بچے کی زبان پر تھے۔ اس لئے اس احساس اسلامی کو مٹانے کے لئے تلوار سے کام لیا گیا۔ اور جس نے حق کے لئے زبان کھولی اس کو بزور شمشیر و خنجر چپ کرا دیا گیا۔ رفتہ رفتہ احساس اور خیالات پلٹنے لگے اور حقیقت روز بروز مستور و محجوب ہوتی گئی[2]۔

مولانا مناظر حسن گیلانی

ملوک بنی امیہ، جنھوں نے اسلام کے نظریۂ خلافت کو مسترد کر کے اپنی سیاسی بازیگریوں کا محور اس نصب العین کو بنا لیا تھا کہ بخت و اتفاق سے جو حکومت ان کے ہاتھ لگ گئی ہے اس کا تسلسل انھیں کے خاندان میں باقی رہے۔ پھر اس نصب العین کے تحت یہ جن ناکردنیوں کے ارتکاب پر آمادہ ہوئے اس سے بھلا کون واقف نہیں ہے[3]۔

---

[1] خلفائے راشدین ص ۱۱۔ [2] مقالات الہلال تلخیص ص ۱۱۴، ۲۰۷۔

[3] مناقب خوارزمی ج ۱ ص ۱۷۰۔

مولوی عبیداللہ انور امیر جمعیتہ العلمائے اسلام (ہزاری گروپ)

اپنے رسالہ خدام الدین میں رقم طراز ہیں کہ:۔ امیر معاویہ کے گرد دنیا پرستوں کی ایک بہت بڑی جماعت جمع ہو چکی تھی' اور یہ لوگ صرف دنیا طلبی کے لئے ہر جائز و ناجائز فعل پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ خلفائے راشدین کی سنت یہ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب مسلمانوں کی مجلس شوریٰ کرے۔ مگر امیر معاویہ نے قیصر و کسریٰ کے سنت کے مطابق بادشاہت کا سلسلہ قائم کر دیا[1]۔

شاہ معین الدین احمد ندوی

امیر معاویہ اسلام کے سب سے بڑے قزاق اور مطلق العنان بادشاہ تھے اس لئے ان کے دور میں خلافت راشدہ کی جمہوریت اور اس کا طریق جہانبانی تلاش کرنا ہی بے سود ہے[2]۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

اہل سنت سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ معاویہ ابن ابوسفیان حضرت علیؑ کی خلافت ابتدائی سے اس وقت تک باغیوں میں تھے جب تک امام حسنؑ نے اقتدار ان کے سپرد نہیں کیا تھا' اور جب امام حسنؑ کے حوالے کر دیا تو وہ بادشاہ بن بیٹھے۔ اسی لئے۔۔ اہلسنت انھیں اسلام کا پہلا بادشاہ کہتے ہیں۔ اب رہا یہ شک کہ معاویہ جب باغی ٹھہرے اور ناحق غلبہ حاصل کرنے والے قرار پائے تو سنی

---

[1] رسالہ خدام الدین لاہور ۲۲ جون ۱۹۶۱ء [2] غیر مہاجر انصار صحابہ ج ۱ ص ۴۷۔

حضرات ان پر لعنت کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اہلسنت کے نزدیک گناہ کبیرہ کے مرتکب پر لعنت جائز نہیں ہے۔ اور باغی چونکہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے اس لئے اس پر لعنت منع ہے[1]۔

مولوی عبدالوحید خاں ہیولوی

معاویہ ابن ابوسفیان کو باغی، غاصب، خود غرض، مکار، فریبی، قاتل مجرم ظالم و جابر خاندان رسالت کا دشمن اور اسلام میں

فتنہ پیدا کرنے والا قرار دینے کے لئے مستند و معتبر تاریخی شواہد موجود ہیں اور خدا اور رسولؐ نے ایسوں پر لعنت کا حکم بھی دیا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک وہ لعنت کا مستحق ہے[1]۔

علامہ وحید الزماں خاں حیدرآبادی

علامہ وحید الزماں خاں کا شمار ہندوستان کے جید سنی عالموں میں ہے اور آپ نے صحاح ستہ کے تراجم کی خدمات بھی انجام دئے ہیں۔ موصوف معاویہ اور یزید کی غاصبانہ خلافت پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

فَاضْرِبُوا عُنُقَ الْآخَرِ...... الخ۔ جب ایک امام سے حسب وصیت ایک امام کے یا بہ صلاح و مشورہ اور باتفاق اکثر ارباب حل و عقد بیعت ہو جائے اور پھر کوئی دوسرا شخص امام بننا چاہے تو اس کی گردن مار دو۔ خواہ وہ کوئی بھی ہو، کیونکہ وہ اسلام میں نا اتفاقی اور لڑائی کرانا چاہتا ہے اور امام وقت کی مخالفت

---

[1] تحفہ اثنا عشری ص ۲۸۵۔ [2] سرگزشت معاویہ ص ۴۶۱۔

اور بغاوت کرتا ہے۔

اس حدیث کے بموجب حضرت علیؑ معاویہ اور ان کے طرفداروں سے لڑے اس لئے کہ وہ لوگ باغی تھے۔ حضرت علیؑ کی خلافت بہ صلاح و مشورہ اور بہ اتفاق ارباب حل و عقد عمل میں آئی تھی لیکن معاویہ اور اس کے حامیوں نے اس کے خلاف کیا اس وجہ سے باغی قرار پائے۔ اب اگر کوئی کہے کہ یزید کی بیعت پر بھی اکثر لوگوں نے اتفاق کر لیا تھا اور حضرت امام حسینؑ نے اس کی مخالفت کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ یزید کی بیعت بہ صلاح و مشورہ نہیں ہوئی تھی بلکہ صرف معاویہ کی دھینگا مشتی اور زبردستی کا نتیجہ تھی ورنہ کوئی بھی شخص اس کو پسند نہیں کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ یزید کی بیعت خلاف معاہدہ بھی تھی، کیونکہ معاویہ نے حضرت امام حسنؑ سے عہد کیا تھا کہ میرے بعد خلافت پھر اپنے مستحق کی طرف رجوع کرے گی۔ اس بنا پر معاویہ کو یہ لازم تھا کہ مرتے وقت امام حسینؑ کو جو سب سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے، اصولی اور آئینی طور پر خلیفہ تسلیم کر لیتے۔ مگر دنیا کی طمع نے ان پر ایسا جادو کیا تھا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔ انھیں نہ معاہدہ کا خیال رہا نہ دینداری اور خدا پرستی کا لحاظ۔ اپنے ظالم، نابکار اور شراب خوار بیٹے کو خلیفہ بنا دیا اور وہ بھی لوگوں کو ڈرا دھمکا کر، گردنوں پر تلوار رکھ کر، مال و زر اور ملک و دولت کی طمع دے کر۔ بھلا ایسی خلافت کب صحیح ہو سکتی ہے؟ یہی وجہ تھی کہ امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے صاف انکار کر دیا اور جان دینا گوارہ کر لیا.... اگر کوئی کہے کہ یزید کی خلافت حسب وصیت امام وقت یعنی معاویہ ہوئی تھی اس لئے اس کی خلافت صحیح ہو گئی گو اہل حل و عقد کا اس پر اتفاق نہ ہوا ہو۔ جیسے حضرت عمر کی خلافت حسب وصیت ابوبکر درست اور صحیح ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ خود معاویہ کی خلافت کیونکر صحیح ہو گی وہ تو بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔

جیسے کہ ایک ڈاکو دوسرے ڈاکو کو اپنی جگہ بٹھا دے۔[1]

"حاکم شامی لعین است"

صدہا کرسی نشین است — حاکم شامی لعین است
پیشش زینبؑ حزیں است — صد الوداع حسیناؑ و احسرتا حسینا

فارسی زبان میں یہ چاروں مصرعے اس الوداعی اور مسلسل نوحے سے ماخوذ ہیں جسے لکھنؤ شہر کی ایک مشہور و معروف انجمن عرصہ دراز سے جلوسہائے عزا کے مواقع پر اپنے مخصوص انداز میں پڑھتی ہے۔

مذکورہ مصرعوں کا واقعاتی اور تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جب شام کے مطلق العنان، خود سر اور ظالم و جابر حکمراں یزید ابن معاویہ کے حکم سے نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے بہتر ساتھیوں کو گھیر کر تین دن کا بھوکا پیاسا میدان کربلا میں شہید کر دیا گیا اور ان کی عورتوں کو قیدی بنا کر تمام مقتولین کے کٹے ہوئے سروں کے ساتھ بے پردگی کی حالت میں یزیدی گورنر ابن زیاد کے سامنے کربلا سے کوفہ لا کر پیش کیا گیا تو اس ملعون نے خانوادۂ رسالت کی ان شہزادیوں کو مزید ذلیل و رسوا کرنے کے خیال سے اپنے فوجی کمانڈروں کو حکم دیا کہ انھیں سر برہنہ و رسن بستہ پہلے کوفہ کے بازاروں میں پھرایا جائے اس کے بعد قید کر دیا جائے۔ چنانچہ حکم کی تعمیل عمل

[1] انوار اللغۃ پارہ ۱۵ ص ۱۹۔

میں لائی گئی اور نبیؐ کے گھرانے کی مقدس و محترم اور عمزدہ بیبیوں کو ان کے یتیم و معصوم بچوں کے ساتھ بازاروں میں پھرانے کے بعد ایک کوٹھری نما تنگ و تاریک قید خانے میں مقید کر دیا گیا۔

چند دنوں کے بعد شام کے حاکم یزید کا یہ حکم ابن زیاد کو موصول ہوا کہ قیدیوں کو مقتولین کے سروں کے ساتھ ہمارے پاس روانہ کر دو"۔ چنانچہ سارے قیدی اور مقتولین کربلا کے کٹے ہوئے سر، مخضر بن ثعلبہ اور شمر ملعون کی نگرانی میں کوفہ سے شام کی طرف روانہ کر دئے گئے۔

بے محمل و بے کجاوہ اونٹوں پر سوار یہ ستم رسیدہ قافلہ سنگلاخ اور ناہموار راستوں کی صعوبتوں اور شمر کے تازیانوں کو برداشت کرتا ہوا چھتیس ۳۶ دنوں کا سفر تمام کر کے ۱۶، ربیع الاول ۶۱ھ کو جب شام پہنچا تو تین دن تک اسے شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی، کیونکہ مظلوموں کی مظلومی کا تماشہ دیکھنے کے لئے یزید کے حکم سے اس کے شاہی دربار کو سجایا جا رہا تھا اور شام کے بازاروں کو خاص اہتمام کے ساتھ آراستہ کیا جا رہا تھا۔

جب تزئین کاری اور آئینہ بندی کا کام مکمل ہو گیا تو چوتھے روز رسولؐ کی ذریت کو شام کے بازاروں سے بے پردہ و سر برہنہ گزار کر شاہی دربار میں سات سو نامحرم کرسی نشینوں کے سامنے اس انداز سے لایا گیا کہ سید الشہدا حضرت امام حسینؑ کے بیمار فرزند امام زین العابدینؑ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، پیروں میں بیڑیاں اور گلے میں خار دار آہنی طوق تھا، زینبؑ و ام کلثوم اور رباب و ام لیلیٰ تمام بیبیوں کے ساتھ بے پردہ سر برہنہ تھیں، ان کے ہاتھ پس پشت بندھے ہوئے تھے اور یہ نامحرموں کی نگاہوں سے بچنے کے لئے اپنے چہروں کو بالوں سے چھپائے ہوئے تھیں۔ یتیم اور سہمے ہوئے معصوم بچے ایک رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔

یزید ملعون کے سامنے طلائی طشت میں نواسۂ رسولؐ کا کٹا ہوا سر رکھا تھا، اور وہ مردود ایک چھڑی کے ذریعہ لب و دندان کے ساتھ بے ادبی کر رہا تھا۔

بس، اسی الم انگیز تاریخی پس منظر کو شاعر نے مذکورہ بند کے تین مصرعوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس جاہلانہ ہٹ دھرمی اور متعصبانہ ضد کو کیا کیا جائے کہ لکھنؤ کا یزیدی اور ناصبی فرقہ ایک مدت سے اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ "حاکم شامی لعین است" کا پڑھنا بند کیا جائے۔ کیونکہ ہمارے پیشوا یزید پر جب لعنتوں کے تیر چلائے جاتے ہیں تو ہمارا کلیجہ چھلنی ہوتا ہے۔ حالانکہ اس فرقہ کے لیڈروں کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ حضرت رسولخدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف یزید بلکہ اس کے باپ معاویہ دادا ابوسفیان پر بھی لعنت کی ہے، اور رسولؐ کے طرز عمل سے انحراف کا نتیجہ کفر ہے۔

ان یزیدیوں اور ناصبیوں کے لیڈروں کو یہ بھی معلوم ہے کہ صاحب فہم اور منصف مزاج سنی حضرات یزید کے ساتھ ساتھ اس کے طرفداروں اور حامیوں پر بھی لعنت کو ضروری اور جائز سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ وحید الزماں خاں حیدر آبادی کی اس تحریر سے ظاہر ہے:۔

ہم تو یزید کو مع اس کے معاونین، جیسے کہ شمر لعین، ابن زیاد، عمر بن سعد، خولی اور سنان وغیرہ ہم کو ملعون و مردود اور اشقی الخلق جانتے ہیں۔ یزید کی حمایت تو کجا، اگر ہم اس کو پالیں تو اس کے گوشت و پوست کے ٹکڑے کر کے چیل کوؤں کو کھلا دیں، اس وقت ہمارے دل کو کچھ تشفی ہو گی اور ہمارا غیظ قلب کسی قدر کم ہو گا۔ الف الف لعنت یزید کے طرفداروں حامیوں اور تعریف کرنے والوں پر جو اس کو خلیفہ یا اولی الامر سمجھتے ہیں۔[1]

[1] انوار اللغۃ پارہ ۱۲ ص ۱۵۴۔

لکھنوی یزیدی فرقہ کی یزیدیت نے اس وقت اور بھی شدت اختیار کر لی جب ۲۷ر اپریل ۱۹۷۰ء کو ڈھائی بجے دن میں "حاکم شامی لعین است" پڑھتا ہوا مذکورہ ماتمی دستہ اپنے بیس ہزار کے مجمع کے ساتھ پاٹے نالے سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس پر کچھ ناصبیوں نے پتھراؤ اور حملہ کر کے قتل و غارت گری، لوٹ مار اور آتش زنی کا بازار گرم کر دیا۔

اس پتھراؤ اور حملہ کے جواب میں شیعوں کی طرف سے کوئی جارحانہ قدم نہیں اٹھایا گیا۔ اس کے باوجود یزیدیوں کے لیڈران خاموش نہیں بیٹھے بلکہ انھوں نے اس وقت کے ضلع مجسٹریٹ سے ساز باز کر کے ان کے ذریعہ چار آدمیوں، مجاہد ملت سیّد اشرف حسین ایڈوکیٹ، ڈاکٹر حضور نواب صاحب، جناب آکاش بھارتی اور جناب محمد حیدر کے خلاف دفعہ ۱۵۳، اے پی سی کے تحت ایک مقدمہ قائم کرایا، جس میں یہ کہا گیا کہ "حاکم شامی لعین است" کہنے سے سنیوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔

یہ مقدمہ مسلسل تین سال تک چلا اور اس میں ابتدائی عدالت سے جرمانہ کی سزاء کے بعد چاروں ملزمان جناب شیو نرائن صاحب ہرکولی ایڈیشنل سشن جج موہن لال گنج لکھنؤ کی عدالت سے ۱۹ر نومبر ۱۹۷۳ء کو باعزت بری کر دئے گئے۔ فاضل جج نے جو منصفانہ اور تاریخی ججمنٹ سُنایا وہ درج ذیل ہے۔"

ججمنٹ

شری اشرف حسین اور ان کے ساتھ تین دیگر ملزمان پر شری آر سی پانڈے مجسٹریٹ لکھنؤ نے دفعہ ۱۵۳، اے آئی پی سی میں سزا دیتے ہوئے پچاس پچاس روپیہ جرمانہ کیا تھا۔"

واقعہ یہ ہے کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لکھنؤ نے چاروں ملزمان کے خلاف

ایک مقدمہ دائر کیا تھا کہ ۲۷ر اپریل ۱۹۷۰ء قریب ۲½ بجے دن، پاٹا نالہ پر ۲۰ ہزار آدمیوں کا ایک جلوس نکلا جس میں ملزمان بھی شریک تھے اور وہ زور زور سے "حاکم شامی لعین است" پڑھ رہے تھے۔ اس سے سنی فرقہ کی دل آزاری ہوئی۔

"ثبوت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی الفاظ ملزمان کوئیلے سے لکھ بھی رہے تھے۔ ملزمان نے جرم سے انکار کیا، ثبوت کی طرف سے چھ گواہ گزرے لیکن صرف عبدالاول اور عبدالحمید کے فقرے کے اوپر گواہی تھی۔"

میں نے درخواست کو بغور پڑھا، اور میں سمجھتا ہوں کہ عبدالاول اور عبدالحمید کی گواہی اگر جرح کے ساتھ پڑھی جائے تو ملزمان کے اوپر کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا۔

عبدالاول نے کہا کہ حاکم شامی لعین است سے سنیوں کی دل آزاری ہوئی۔ معاملے کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ تھوڑی سی تاریخ پر روشنی ڈالی جائے۔

محمد صاحب کی بیٹی جناب فاطمہ تھیں، ان کی شادی علی سے ہوئی، حضرت حسین، حضرت حسن اور جناب زینب انھیں فاطمہ کی اولاد تھیں۔ محمد صاحب کے انتقال پر ابو بکر خلیفہ ہوئے، اس کے بعد عمر ہوئے، پھر عثمان چنے گئے۔ حضرت علی ان کے بعد خلیفہ ہوئے اور وہ قتل کر دئے گئے۔ معاویہ کی اولاد میں خلافت پر یزید خاجعہ ہوا۔ یزید نے حسین سے بیعت کے لئے کہا، حسین نے انکار کیا۔ یزید نے حسین اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرا دیا اور ان کی مستورات کو بے پردہ جن میں جناب زینبؑ بھی تھیں یزید کے دربار میں لے جایا گیا۔ وہاں سینکڑوں آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور محمد صاحب کی نواسی بے پردہ ان کے سامنے پیش کی گئیں۔

عبدالاول نے کہا کہ وہ حسینؑ کے قاتل کو بُرا آدمی سمجھتے ہیں۔ شمر جس نے

حسینؑ کو قتل کیا وہ صحابی نہ تھا، سنیوں کے جذبات تبھی مشتعل ہوں گے جب صحابہ اور ان سے بزرگ ہستیوں کو بُرا کہا جائے۔ سنی کبھی ناراض نہ ہوں گے اگر حسین کے قتل کرنے والے کو بُرا کہا جائے۔ گواہ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ نہیں جانتا کہ اس جملے سے کس کو گالی دی جاتی ہے۔ گواہ نے تسلیم کیا کہ اس آدمی کو بُرا کہا جائے جس کے سامنے جناب زینبؑ کو اس بے عزتی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

اس طریقہ سے حاکم شامی لعین است کا صاف مطلب یہ ہوا کہ یہ لعنت یزید پر ہے جس نے اتنے بڑے محمد صاحب کی نواسی کو ذلیل کرنے کے لئے اپنے سامنے پیش کرنے کا حکم دیا۔ اس پر لعنت جائز ہے۔ اگر ایسے آدمیوں پر لعنت کی جائے تو سنیوں کو تکلیف نہیں ہوتی۔

عبدالاول اور عبدالحمید کے بیانات میں کسی آدمی کا نام نہیں لیا گیا کہ کس کو گالی دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں کوئی سوال نہیں اٹھتا کہ سنیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے۔

"معلوم ہوتا ہے کہ مجسٹریٹ نے اس مفہوم کو نہیں سمجھا، اور ایسا لگتا ہے کہ مجسٹریٹ نے صرف ابتدائی بیان کو پڑھا ہے۔ جرح نہیں پڑھی۔ جرح پڑھنے کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ملزمان نے کوئی جرم نہیں کیا اور جو فرد جرم ملزمان کے خلاف تیار کی گئی ہے وہ کسی طرح بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اس لئے میں پوری مسل عدالت عالیہ کے پاس بھیج رہا ہوں اور سفارش کرتا ہوں کہ ملزمان کو بری کیا جائے اور مجسٹریٹ سے جواب طلب کرتا ہوں کہ دس دن کے اندر جواب میرے سامنے پیش کریں تاکہ میں اسے ہائی کورٹ بھیج سکوں۔"

دستخط:۔ (شیو نرائن ہرکولی)

ایڈیشنل سشن جج موہن لال گنج۔ لکھنؤ ۱۹ر نومبر ۱۹۷۳ء

نوٹ:۔ عدالت عالیہ نے جناب شیو نرائن ہرکولی کے اسی فیصلے کو بحال رکھا۔ ملزمان باعزت بری کر دئے گئے اور حاکم شامی لعین است کی صدائیں پھر فضاؤں میں پرواز کرنے لگیں۔

تبصرہ

تاریخ اور گواہوں کے بیانات کی روشنی میں فاضل جج جناب شیو نرائن ہرکولی کا یہ منصفانہ فیصلہ جہاں محمد صاحب کے نواسے حضرت امام حسینؑ کو قتل کرنے اور ان کی نواسی جناب زینبؑ کو ذلیل و رسوا کرنے کے الزام میں یزید کو مجرم گردانتے ہوئے اس پر لعنت کو قانونی طور پر جائز قرار دیتا ہے وہاں یزید کے باپ معاویہ ابن ابوسفیان کے لئے بھی لعنت کا قانونی اور آئینی جواز فراہم کرتا ہے۔ کیونکہ مورخین کے بیان کے مطابق:۔

(۱) معاویہ، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حقیقی داماد حضرت علیؑ اور بڑے نواسے حضرت امام حسنؑ کا قاتل ہے۔

(۲) معاویہ حضرت محمدؐ کی بیوی ام المومنین عائشہ کا قاتل ہے۔

(۳) معاویہ صحابی رسولؐ جناب عمار یاسرؓ، عمر بن حمق اور مالک اشتر وغیرہ کا قاتل ہے۔

(۴) معاویہ نے رسولؐ کے بزرگ ترین صحابی حجر ابن عدی کو ان کے بارہ ساتھیوں سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

(۵) معاویہ کے حکم سے ابن عباس کے دو کمسن اور معصوم بچے ماں کی گود میں ذبح کر دئے گئے۔

(۶) معاویہ نے سنت رسول اور سنت شیخین پر عمل نہیں کیا۔

(۷) معاویہ نے اسلام کے جمہوری نظام کا گلا گھونٹ کر قیصر و کسریٰ کے نظام جہانبانی کی بدعت قائم کی۔

(۸) معاویہ نے ام المومنین عائشہ کے بھائی محمد بن ابوبکر کو گدھے کی کھال میں سلواکر زندہ جلوا دیا۔

(۹) معاویہ اور اس کے ظالم و جابر گورنروں نے ایک طویل مدت تک مسجدوں اور منبروں سے شیعوں کے پیشوا اور امام حضرت علیؑ پر سبّ و شتم کو جاری رکھا اور ان کی اولادوں کے سامنے انھیں گالیاں دیتے رہے۔

(۱۰) معاویہ اور اس کے گورنروں نے غنڈہ گردی کا بازار گرم کرتے ہوئے بے شمار شیعوں کو تہ تیغ کیا، انھیں بر سر عام سولیاں دی گئیں، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور لوہے کی گرم سلاخوں کے ذریعہ انھیں آنکھوں سے محروم کر دیا، ہزاروں عورتوں کے سہاگ اجڑ گئے اور لاتعداد معصوم بچے یتیمی کی گود میں چلے گئے۔

(۱۱) معاویہ نے شہدائے احد کی قبروں کو مسمار کر کے ان کے اوپر سے نہر جاری کرائی اور ان کی لاشوں کو منتقل کیا چنانچہ صاحب تاریخ اعثم کوفی کا بیان ہے کہ حضرت حمزہ کی قبر جس وقت کھودی جا رہی تھی تو ایک بیلچہ ان کے پیر میں بھی لگا تھا جس سے خون تازہ جاری ہو گیا تھا۔

یہ تمام واقعات ایسے ہیں جو قانونی، آئینی، اصولی اور شرعی طور پر معاویہ کے لئے لعنت کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس جمہوری دور میں شیعہ حضرات معاویہ پر کھل کر لعنت کیوں نہیں کرتے تو اس کا جواب ... یہ دیں گے کہ شیعہ حضرات چونکہ "لاتفسدو فی الارض" کی تفسیر اور امام حسن علیہ السلام کی سیرت مقدسہ کو اپنی نظر میں رکھتے ہیں اس لئے

معاویہ کو قابل لعنت سمجھتے ہوئے بھی خاموشی کو بہتر سمجھتے ہیں تاکہ کسی فساد کا کوئی الزام ان کے سر نہ آسکے۔ ورنہ .....

یہ بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

---------- تمام شد ----------

احقر العباد
فروغ کاظمی
۲۸ اگست ۱۹۹۸ء

نگرانئ اِمام میں ہو گا یہ نیک کام
اچّھا ہے وقت خواب کی تعبیر کے لئے
محشر میں فاطمہؑ تجھے کر دیں گی سرخرو
اٹھ جنّت البقیع کی تعمیر کے لئے
آصف لکھنوی

Nigrani-e-Imam main hoga yeh nek kaam,
Achchha hai waqt khwab ki tabeer ke liye,
Mahshar main Fatema (s.a) tujhe kardengi surkhroo,
Uth Jannatul Baqi ki tameer ke liye.
Late: - Asif Lucknowi